مجموعہ ناولٹ

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

بشریٰ رحمٰن

ہِک رات دی بات وِسار گیئوں ؟
مِیکوں تیر برہوں دا مار گیئوں ؟
کیوں جیت کے بازی ہار گیئوں ؟
کیا دوش ہے باندی بردی دا ؟

"چاند سے نہ کھیلو"

جی بہت اُداس ہے۔
جی کا کیا ہے؟ یہ تو وہ ننھا بچہ ہے جو سدا کسی کھلونے کے لئے مچلتا ہی رہتا ہے۔
دل کے آس پاس درد بھی رہتا ہے۔
یہ درد تو چاند کا ہالہ ہے۔
ہالے کے بغیر تم نے کوئی چاند دیکھا ہے ——!
میرا دل بھی تو چاند ہے۔
ایک بار تم نے یہ چاند کھیلنے کو مانگا تھا۔
میں نے تو دے دیا تھا ——!!!

زہرا نے باہر نکل کے اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے میں چابی گھمائی تو اس نے دیکھا وہ نووارد بھی اپنے دروازے کو بند کر کے اس میں چابی گھما رہا تھا۔ زہرا نے روزانہ کی طرح ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر لفٹ کی طرف دوڑی۔ لفٹ ابھی ابھی آ کر رُکی تھی۔ بٹن نہیں دبانا پڑا۔ وہ دوڑ کر اندر گھسی۔ وہ بھی اس کے پیچھے گھس آیا ـــــ لفٹ نیچے کو رینگنے لگی۔ زہرا نے ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا لیا۔ اور بھرپور انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے زہرا اسے گرین وُڈ اپارٹمنٹس میں دیکھ رہی تھی۔ نووارد لگتا تھا مگر عجیب بات یہ کہ اپنا سا لگتا تھا۔ لفٹ رکنے سے پہلے بولی۔

"آپ نئے آئے ہیں؟"

"جی ـــــ" اس کی آواز میں جھجک تھی۔ جو نووارد دں کے لہجے میں ہوتی ہے۔ اور انداز میں حجاب تھا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"پاکستان سے ـــــ"

"پاکستان سے ـــــ" زہرا کی چیخ نکل گئی۔ تبھی یہ آدمی اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ اپنے ملک کے لوگوں میں عجیب سی کشش ہوتی ہے۔

"پاکستان کے کس شہر سے ـــــ؟"

"لاہور سے" .....

"کس سلسلے میں آئے ہیں؟"

"دو سال کی ٹریننگ کے لئے بھیجا گیا ہوں"

لفٹ رُک گئی وہ دونوں باہر آ گئے۔

"اچھا ـــــ مجھے یونیورسٹی کے لئے بس پکڑنا ہے" زہرا نے بالکل امریکی لڑکیوں کے انداز میں کہا۔

"بہت خوشی ہوئی ایک ہم وطن سے مل کے ..... اب تو آپ ہمارے ہمسائے بن گئے ہیں۔ اکثر ملاقات ہوتی رہے گی"

"جی ..... جی ..... جی" ..... اس نے اسی لجائے ہوئے انداز میں کہا جس میں احساس کمتری بھی تھا۔ اور اجنبیت کا احساس بھی ـــــ

"باتے ـــــ" وہ اپنی پونی ٹیل ہلاتی ہوئی۔ اس بس کی طرف دوڑی جو سڑک پر رک رہی تھی۔

کمال ہے۔ وہ سوچنے لگا۔

میں نے تو اس سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ سارے سوال دہی کر گئی ـــــ کون تھی۔ کہاں کی تھی ـــــ؟ ارے ـــــ تھی تو اپنے ملک کی، اس لئے تو کہہ رہی تھی کہ ہم وطن سے مل کر خوشی ہوئی۔ اردو بھی بول رہی تھی۔ لباس امریکن پہنا ہوا تھا۔ تو کیا ہوا ـــــ یہ تو جیسا دیس ویسا بھیس والی مجبوری ہے۔ مگر کیسی صحت مند اور چاق و چوبند لڑکی تھی۔ خیر ہے تو پڑوسن۔ پھر وہ پورا ایک ہفتہ نظر نہیں آئی۔

وہ خود بھی ہراساں رہتا تھا۔ نیا نیا آیا تھا۔ کچھ دن ایک سستے ہوٹل میں رہا تھا اور اب ایک بیڈ روم کا فلیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک بیڈ روم۔ ایک باتھ روم اور ایک ننھا سا کمرہ جو بیک وقت ڈرائنگ رُوم۔ ڈائننگ روم اور کچن بھی تھا۔ بجلی کے چولہے لگے ہوئے تھے۔ فرنیچر فلیٹ میں شامل تھا۔ سجا سجایا گھر تو مل گیا تھا۔ مگر اب اسے اس نے خود آباد کرنا تھا بھلا کوئی گھر بغیر عورت کے آباد ہوتا ہے ـــــ تبھی تو چھٹی کے روز وہ بیٹھا قیمہ پکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر روز برگر اور میکڈانلڈ کھا کھا کے جی اوب گیا تھا۔ آج ہاف کلو قیمہ لایا تھا۔ پیاز اور

لہسن بھی ـــــ مکھن بھی ـــــ اور جو کچھ سمجھ میں آیا تھا۔ لے آیا تھا ـــــ مگر یکایک بجلی کے چولہے سے دھائیاں اٹھنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا ـــــ چمڑا جل رہا ہے ـــــ گھبرا کر ڈھکن اٹھایا ـــــ جلتے قیمے پر پانی انڈیل دیا ـــــ ذرا سے کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ پھر اس کو نکالنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ باہر کا دروازہ کھول دے ـــــ دھواں شریف بچے کی مانند باہر نکل گیا۔ . . . مطلع صاف ہوا تو اس نے دیگچی میں جھانکا۔ . . . دیگچی میں کوئی حسرت نہ بچی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی وہ گھبرا کر دوڑا آیا۔

وہ لمبی میکسی پہنے، لمبے بال کھولے وہاں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"گڈ مارننگ"

"گڈ مارننگ ـــــ" وہ بھی بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

وہ زور سے ہنس پڑی۔

"جی فرمائیے!"

"میں اندر آجاؤں؟"

"آجائیے . . . ." اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔

وہ مٹکتی لچکتی اندر آگئی۔

کیسی بیباک ہوتی ہیں۔ یہ امریکہ میں پلنے والی لڑکیاں ـــــ

"ہاں تو کچھ پکایا جا رہا ہے۔"

"جی ہاں" وہ جلدی سے بولا۔

وہ چولہے کے قریب گئی۔ سب دیکھا۔ اور بولی۔

"یہ تو کچھ جلایا جا رہا ہے ـــــ"

"بس اپنا دل ہی جلا رہا ہوں . . . ."

"اچھا تو . . . ." وہ اپنی غلافی آنکھیں کھول کر بولی:

"اس دیگچی میں آپ کا دل پک رہا تھا۔ اوفوہ، پھر تو بیچارا جل گیا، سارے کا سارا ـــــ اب کیا کریں گے آپ؟"

اور قریب آگئی ـــــ اتنی کہ اس کی خوشبو اس کے نتھنوں کو چھونے لگی ـــــ "دل کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے آپ ـــــ کیسے، بتائیں نا؟"

اس نے اتنی زور سے پوچھا ـــــ کہ وہ ڈر کر دیوار کے ساتھ لگ گیا ـــــ مگر اس بے باک لڑکی کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں جانے کیا تھا ـــــ وہ پاگلوں کی طرح بس اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہاں جو بھی چھڑا آتا ہے۔ اس کا یہی حال ہوتا ہے۔"

پھر وہ پیچھے ہٹ گئی اور سارے کمرے میں گھوم پھر کر بولی۔

"کیا نام ہے آپ کا باتی دا وے ـــــ"

"جی . . . . زنیر احمد صدیقی"

"ہاں تو زنیر احمد صدیقی صاحب، نام آپ کا مشکل بھی ہے اور لمبا بھی ہے۔ امریکہ میں اتنے لمبے نام بلانے کا رواج نہیں ہے۔ آپ چونکہ نئے نئے آتے ہیں اس لئے اسکول کے بچوں کی طرح پورا نام بتاتے ہیں۔ کچھ دنوں تک آپ اپنے کمرے کے باہر کچھ اس قسم کی تختی لگا دیں گے۔ زیڈ۔ اے صدیقی ـــــ اور سب آپ کے واقف کار آپ کو مسٹر صدیقی کہیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جی ٹھیک ہے۔" وہ اتنی ہی سعادت مندی سے بولا۔

اس پر زہرا نے پھر بلند سا قہقہہ لگا۔ کیسا جاندار قہقہہ تھا۔ حوصلے کی فصیلیں توڑ رہا تھا۔

"بات یہ ہے کہ ـــــ میرا نام بھی زیڈ سے شروع ہوتا ہے۔ ارے آپ نے تو ابھی تک میرا نام ہی نہیں پوچھا۔"

"بس پوچھنے والا تھا۔"

"اوفوہ! آپ لوگ اتنے بزدل کیوں ہوتے ہیں۔ لڑکی دیکھ کر دبک جاتے ہیں۔ آخر پوچھیں نا! میرا نام ـــــ؟"

"جی آپ کا نام کیا ہے ـــــ؟" وہ ہونقوں کی طرح بولا۔

"یہ جی ـــــ کیا ہوتا ہے؟"

"جی . . . ." پھر وہ رک گیا۔ سر کھجایا۔ اور زور سے ہنس پڑا۔

"آپ بہت تیز ہیں۔ بیٹھئے ؟" کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی تو خود بھی بیٹھ گیا۔

"آپ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں ؟"

"پہلی بار امریکہ آیا ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔ مرد ہیں۔ ہوشیار بنیں۔"

"آپ کی صحبت میں رہوں گا تو ہوشیار ہو جاؤں گا۔"

"شاباش ! پہلی بار کام کی بات کی ہے آپ نے۔"

"ہاں تو ——— میں کہہ رہی تھی . . . . . جی آپ نے میرا نام پوچھا تھا۔ میرا نام زہرا ہے۔"

"بالکل پاکستانی نام ہے ———"

"تو کیا میرا نام پاکستانی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔"

"آپ امریکہ میں رہتی ہیں۔ تو میں نے جانا کوئی میری، جیکی یا جینی قسم کا نام ہو گا آپ کا۔"

"جی نہیں آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا پورا نام زہرا فاطمہ ہے۔ میں پاکستان میں پیدا ہوئی تھی۔ پھر میرے پاپا مستقل یہاں آ گئے۔ تو ہم سب کو آنا پڑا۔"

"آپ کے پاپا جی کیا کرتے ہیں ———؟"

"ساری باتیں آج نہیں بتاؤں گی۔"

"کب بتائیں گی ———؟"

"قسطوں میں ——— آج تو آپ کے کمرے سے نکلنے والی خوشبو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میں آپ کو بتانے آئی تھی کہ یہاں ارد گرد امریکی رہتے ہیں۔ وہ مصالحہ جلنے کی خوشبو میں پسند نہیں کرتے۔ احتجاج کر سکتے ہیں۔ ایسے تجربے دروازہ بند کر کے کیا کریں، بلکہ امورِ خانہ داری کو ہاتھ ہی نہ لگائیں۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے۔"

"تو کیا کروں ——— ؟ باہر کا کھانا کھا کر تھک گیا ہوں۔"

"آپ نے وہ "کن ٹکی چکن" ٹرائی کیا ہے ———؟"

"وہ بھی کتنے دن کھا سکتا ہوں ؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے ———" وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ "آپ کے لئے کچھ سوچنا پڑے گا۔"

پھر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"آپ کا نام بہت مشکل ہے ———"

"تو آپ اسے آسان کر دیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔"

"مجھے یہاں سب زارا کہتے ہیں۔ اس لئے میں آپ کو زیرو کہہ کر بلاؤں گی۔ پسند ہے۔"

"دل و جان سے" وہ ہنس کر بولا۔

"اچھا اب آپ دروازہ بند کر لیں۔"

وہ گھوم کر مڑی اور تین انگلیاں ہلا کر باتے باتے کیا اور باہر نکل گئی۔

آفت قسم کی شے تھی۔ زبیر احمد نے ایک لمبی سانس چھوڑی۔ مگر پیاری تھی۔ لڑکیاں امریکہ میں رہ کر بے باک ہو جاتی ہیں۔ یہ اسے آج ہی پتہ چلا تھا۔ ویسے تو اس کے دفتر میں کئی امریکی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ جن سے انگریزی میں بات کرتے ہوئے وہ جھینپتا تھا۔ زارا سے اپنی زبان میں بات کر کے مزہ ہی اور آتا تھا ——— زارا کا پورا خاندان امریکہ میں چلا آیا تھا۔

پندرہ سال پہلے اس کے والد آئے تھے۔ اس وقت وہ پاکستان میں چمڑے کی مصنوعات بناتے تھے۔ یہی مصنوعات لے کر وہ امریکہ کے مختلف شہروں میں جایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے قالینوں کی ایکسپورٹ بھی شروع کر دی۔ جب کام بہت زیادہ بڑھ گیا تو اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ ملا لیا ——— رفتہ رفتہ پورا خاندان امریکہ چلا آیا۔ یہاں واشنگٹن ڈی سی میں ان کا بہت خوبصورت گھر تھا۔ ایک بڑا شوروم تھا۔ ایک بھائی نے امریکی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اور دونوں ایک ریستوران چلاتے تھے۔ دوسرا بھائی پاکستانی لڑکی سے شادی کر کے آیا تھا۔ اور باپ کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ دو بڑی بہنیں بھی تھیں۔ مگر اب دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ان کی شادیاں بھی ایک مسئلہ بنی رہی تھیں ——— پاپا جی چاہتے تھے کہ انہیں پاکستان میں جا کر بیاہا جائے۔ اس کام کے لئے امی جان ہر سال پاکستان جاتی تھیں۔ تنگ آ کر عزیزوں میں ہی دو اچھے لڑکے مل گئے۔ اور ان کی شادیاں ہو گئیں۔ ایک پنڈی میں تھی

اور دوسری کراچی میں ـــــ پاپا جی تو سال میں دو چکر پاکستان کے لگاتے تھے مگر ممی جان ہمیشہ دو تین سال کے بعد جاتی تھیں۔ تب زارا بھی ان کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اب ممی کو زارا کے لئے ایک اچھے لڑکے کی تلاش تھی۔ اگر کبھی امریکہ میں کوئی پاکستانی لڑکا نظر آجاتا تو ممی جان ـــــ بڑی سُرعت سے اس کا آگا پیچھا معلوم کرنے پر لگ جاتی تھیں۔ زارا سب بچوں میں چھوٹی بھی تھی اور لاڈلی بھی تھی۔ اس کا تو بچپن بھی امریکہ میں گزرا تھا۔ اس لئے امریکی لڑکیوں کی طرح بے تکلف اور خوش مزاج تھی۔ آج کل اس نے میری لینڈ کی یونیورسٹی میں داخلہ لے رکھا تھا۔ یہ یونیورسٹی واشنگٹن شہر سے کافی دور تھی۔ اس لئے وہ یہاں ایک اپارٹمنٹ لے کر رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ایرانی لڑکی رہتی تھی۔ جو کسی دفتر میں ملازم تھی۔ ہفتہ اور اتوار کے روز زارا واشنگٹن ڈی۔سی اپنے والدین کے پاس چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھی ممی یا پاپا بھی اس کے پاس آجاتے تھے۔

اس روز زارا بہت دن کے بعد نظر آئی۔ تو زنیر نے اسے نیچے لابی میں ہی روک لیا اور بولا۔

"آپ نے کہا تھا۔ آپ میرے لئے کچھ سوچیں گی!"

"کیا ـــــ؟" زارا نے اپنی وحشی جیسی کشادہ آنکھیں کھول کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ہاتھ میں برگر پکڑا ہوا تھا ـــــ جسے بے تحاشا دانتوں سے کاٹ کے کھا رہی تھی۔

"اچھا تو آپ کا حافظہ بھی کمزور ہے" وہ اور شوخ ہوگیا۔ "اب تو آپ غالباً مجھے بھی بھول چکی ہوں گی۔ کون ہوں۔ اور نام کیا ہے ـــــ؟"

"زنیر احمد صدیقی عرف نیرو . . . . میں واقعی آپ کے بارے میں سوچنا بھول گئی تھی دراصل میرے سمیسٹر ہو رہے تھے۔ اور فیروزہ بیمار تھی۔ سارا گھر کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔"

"فیروزہ کون ہے ـــــ؟"

"ارے آپ کو معلوم نہیں فیروزہ میری ہاؤس میٹ ہے۔ ہم دونوں مل کر اس اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔"

"آپ نے اس روز تو مجھے بتایا نہیں تھا۔"

"اس روز کیا کیا بتاتی آپ کو ـــــ؟"

"اچھا تو اب بتا دیجئے ـــــ"

زارا نے پورا برگر ختم کر کے کاغذ کے نیپکن سے منہ اور ہاتھ صاف کئے اور پھر اس کاغذ کو دور پڑے ہوئے ڈرم میں پھینک دیا اور اپنی پونی ٹیل ہلاتی ہوئی آئی اور بولی۔

"فیروزہ ایک ایرانی لڑکی ہے۔ میری دوست ہے۔ میرے ساتھ رہتی ہے۔ مگر وہ جاب کرتی ہے۔ ایک ڈائمنڈ شاپ پر سیلز گرل ہے ـــــ بس ہمارے آنے جانے کے اوقات میں فرق ہے۔ اس لئے آپ نے اُسے میرے ساتھ نہیں دیکھا کسی روز ملاقات کرا دوں گی۔"

"جی میں ان سے مُلاقات کا اتنا شوقین نہیں ہوں۔"

"آپ کس بات کے شوقین ہیں؟"

"ابھی تک میرا مسئلہ حل نہیں ہوا ـــــ؟"

زارا نے ایک لمبی ہُوں کی۔ اور پھر راک اینڈ رول کی طرز پر گھوم گھوم کر سوچنے لگی۔ اور پھر بولی۔

"حل ہو سکتا ہے آپ کا مسئلہ ـــــ"

"وہ کیسے" وہ بیتابی سے بولا

"کھانا کھانا چھوڑ دیجئے . . . . ."

اس پر دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

"چھوڑ دوں ـــــ اور مر جاؤں"

"ارے اتنے کمزور ہیں آپ ـــــ"

"پہلے ہی دیکھئے میری صحت کتنی خراب ہو گئی ہے۔"

"مجھے تو کہیں سے بھی خراب نہیں لگتی" اس کو سر سے پیر تک دیکھ کر بولی ـــــ "بس ٹھیک ٹھاک ہیں آپ ـــــ ہاں وہ جو پاکستان سے آتے ہُوتے ذرا سی توند نکلی ہوئی تھی۔ وہ پگھل گئی ہے ـــــ اب تو آپ پہلے سے زیادہ اسمارٹ لگ رہے ہیں۔"

زنیر بلش کر گیا۔

حالانکہ وہ اس کے شعلہ صفت چہرے اور بیباک آنکھوں کی تعریف کرنا چاہتا تھا! لجھ

گیا۔ تو پھر جلدی سے بولا ——

"آپ کے سیمسٹر ختم ہو گئے؟"

"جی ہاں ——"

"اگلے سیمسٹر کب ہوں گے؟"

"کرسمس سے پہلے ——"

"پھر.... پھر آپ کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔"

"تعلیم تو کبھی ختم نہیں ہوتی مسٹر —— جتنا مرضی پڑھتے جاؤ۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔"

"اور آپ کیا پڑھیں گی؟"

"ایم۔ ایس تو ہو جائے گا اب —— مگر مزید نہیں پڑھوں گی جاب کروں گی۔"

"یہاں تو لوگ جاب کرنے کے بہت دلدادہ ہیں۔"

"تو کیا کریں ——؟ یہاں جاب کئے بغیر وقت نہیں گزرتا اخراجات بہت زیادہ ہیں اور ہر ذی روح اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتا ہے۔ اور خود مختارانہ زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی برسر روزگار بھی ہو ——"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔"

اب اور کیا بات کرے —— زنیر سر کھجانے لگا تو وہ جلدی سے او کے۔ باتے کہہ کر چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی۔

اگلے ویک اینڈ پر جب وہ اور فیروزہ بہت سے لفافے اٹھائے اپنے کمرے میں جا رہی تھیں۔ تو وہ کمرے کو تالا لگا کر باہر نکل رہا تھا۔

"ہیلو...." ان کو دیکھ کر مسکرایا۔

"السلام علیکم ——" زارا نے خوش دلی سے کہا۔ پھر سارے بوجھل لفافے اپنے کمرے کے مقفل دروازے کے ساتھ رکھ کر بولی۔

"یہ فیروزہ ہے —— میری دوست ——"

پھر فیروزہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"فیروزہ ان سے ملو۔ ہی از مائی فرینڈ نیرو۔ یہ ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔" زارا کے اس فقرے سے زنیر کا دل دھڑک اٹھا —— فیروزہ نے اپنا گورا گورا ہاتھ بڑھا دیا تو زنیر نے بھی گرمجوشی سے ہاتھ ملا ڈالا۔

دو تین رسمی فقروں کے بعد —— زارا جلدی جلدی دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

"آپ کہاں جا رہے تھے ——"

"باہر جا رہا تھا۔ کہیں سے کھانا کھانے ——"

"آج گھر میں نہیں پکایا ——"

اس پر زنیر بے تحاشا ہنسنے لگا۔

"سارے تجربے ناکام ہو گئے ہیں۔"

"کیوں فیروزہ ——" اس نے مڑ کر فیروزہ سے پوچھا۔

"آج نیرو کو اپنے گھر دعوت نہ کھلائیں؟"

"ضرور کھلاؤ ——" فیروزہ بنڈل اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔

"نہیں . . . . نہیں . . . . . اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔" زنیر نے واقعی تکلف محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی ہم کوئی خاص اہتمام نہیں کریں گے۔ آج ہم ہفتے بھر کا سودا خرید کر لاتے ہیں۔ فیروزہ کو فقط پکاتے گی اور میں مٹر کا پلاؤ۔"

"اصل میں ہم صرف ہفتہ اور اتوار کو اپنے اپنے ملک کا کھانا پکاتے ہیں۔ روز تو جو بھی مل جائے گزارا کر لیتے ہیں۔"

"آپ دونوں کا شکریہ بہت بہت ——" وہ انکساری سے بولا۔ "میں بالکل آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتا . . . . ."

"ایک تو آپ پاکستانی لوگ تکلف بہت کرتے ہیں۔" فیروزہ نے چڑ کر کہا۔ "یا پتہ نہیں HYPOCRACY کرتے ہیں۔"

"سن لیا آپ نے ——" زارا نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ "اتنی سی بات تھی کہ آپ جھٹ کہہ دیتے۔"

"شکریہ خواتین، میں ضرور آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ بلکہ آپ دو نوجوان حسین لڑکیوں کے ساتھ کھانا کھانے میں فخر محسوس کروں گا۔"

"جی ——" زنیر شرمندہ ہو گیا۔ . . . . "تو ایسا کہتے ہیں؟"

"اور کیسا کہتے ہیں۔ دل سے تو آپ چاہ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ گپ لگائیں اوپر سے تکلف فرما رہے ہیں۔"

"آپ نے کیسے جانا ——؟" زنیر نے بوکھلاتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ کیوں کہ یہ سچ تھا۔

HYPOCRACY

"بس میں اپنے ہم وطن لوگوں کو جانتی ہوں تھوڑی سی ——" کہے بغیر نہیں رہ سکتے تکلف کا اظہار رسماً کرتے ہیں۔ کہیں کوئی یہ نہ کہدے کہ دیکھو کتنے بھوکے ہیں۔ فٹ مان گئے۔"

"ہے نا ——؟"

زنیر اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔

"اسی لئے تو یہ امریکی لڑکے اچھے ہوتے ہیں۔ وقت ضائع نہیں کرتے۔ اپنے جذبات کا صاف اظہار کرتے ہیں۔" فیروزہ نے کہا۔

زارا نے زنیر کو چپ دیکھ کر ذرا لہجہ نرم بنایا اور بولی۔

"اب کیا سوچ رہے ہیں آپ ——؟"

"اصل میں آپ نے ٹھیک کہا۔ میں آپ کے ساتھ کھانا کھانا ایک اعزاز سمجھتا ہوں مگر ویسے ہی رسماً تکلف کر رہا تھا ——"

"اچھا تو پھر کیا طے ہوا ——" زارا بولی۔

"آجاؤں گا —— مگر کس وقت ——"

"ٹھیک سات بجے شام ——"

"شکریہ ——" زنیر نے جھک کر کہا۔ "ٹھیک سات بجے شام میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

ٹھیک سات بجے شام اپنی بند مٹھی کی پشت سے زنیر احمد نے دروازے کے باہر دستک دی تو ایپرن کھولتی ہوئی فیروزہ دروازے کی طرف دوڑی ——

"وہ آگیا تمہارا عاشق صادق ——" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"بکو نہیں فیروزہ ——" زارا نے بھی بین میں ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔ "اس کے سامنے ایسی بکواس نہ کرنا۔ یہ لوگ اور طرح کے ہوتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں منافق ہوتے ہیں۔"

"خبردار جو ہمارے وطن کے لوگوں کو منافق کہا۔ بیچارے سیدھے سادے، سادہ دل ہوتے ہیں۔ مکر و فریب نہیں جانتے۔"

"ہاں میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں ان کو ـــــ کبھی غور کیا، تمہاری طرف کیسے دیکھتا ہے ـــــ"

"اُوتکی دم دروازہ تو کھولو ـــــ"

زارا نے دانت پیس کر کہا۔

تو فیروزہ نے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ سجا کر دروازہ کھولا اور راستہ چھوڑ کر بولی۔

"ویلکم سر ـــــ خوش آمدید ـــــ"

جھجکتا ہوا زنیر اندر داخل ہوا۔ یہ اپارٹمنٹ بھی اسی کے اپارٹمنٹ کے مانند تھا۔ صرف کچن کا رُخ دوسری جانب تھا۔ میز پر برتن رکھے تھے اور مٹر پلاؤ کی بڑی اشتہا انگیز خوشبو نکل رہی تھی۔

"بیٹھئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

زارا نے اسے کرسی پر بٹھا دیا ـــــ اور پھر دوڑ دوڑ کر چٹنی اور اچار کی بوتلیں اس کے آگے رکھنے لگی۔ زنیر احمد کو دو مہینے ہو گئے تھے اپنے گھر سے نکلے ہوئے۔ آج اسے احساس ہوا کہ گھر کیا ہوتا ہے۔

"اور عورت کے ہونے میں کیا دلکشی ہے۔ عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ـــــ وہ ایک منظم گھر ہوتی ہے۔ اس کے پاس محبت اور شفقت کے علاوہ بھی دینے کو بہت کچھ ہوتا ہے۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا، ان کا گھر ـــــ اور ان کے گھر میں بیٹھ کر کھانا ـــــ ہم اپنے گھروں میں عورتوں کو کس قدر فضول اور غیر ضروری سی شئے تصور کرتے ہیں ـــــ"

زنیر احمد سوچنے لگا۔

اتنے میں وہ دونوں میز پر آ کر بیٹھ گئیں۔

زارا سوپ کے گرم گرم پیالے لائی ـــــ تو فیروزہ ایک دم شرارت سے چمک کر بولی۔

"مسٹر نیرو۔ آپ اور کچھ پئیں گے؟"

"کچھ اور کیا ـــــ؟" زنیر نے معصومیت سے منہ اٹھا کر پوچھا ـــــ پھر اس کی آنکھوں میں مچلتا سوال پڑھ کر خفت سے ہنس پڑا۔ اور بولا۔ ۔ ۔ "نہیں یہی سوپ چلے گا ـــــ"

"دیکھیں تکلف نہ کریں۔ یہ امریکہ ہے۔ یہاں سب چلتا ہے۔" مسکراتی ادا سے بولی۔

"آپ پاکستانی لوگ کبھی دل کی بات نہیں بتاتے۔ ہمیشہ پردہ ڈال کر بات کرتے ہیں۔ ہم بالکل بُرا نہیں مانیں گے۔ ہمارے ہاں تو امریکن اور یورپین مہمان بھی آتے ہیں۔ ہمارے ملے جُلے دوست ہیں۔ اس وقت گھر میں بیئر ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں پیش کر سکتی ہوں۔"

"نہیں ـــــ" زنیر ایک دم بولا ـــــ "نہیں ـــــ واللہ میں نہیں پیتا نہ عادت ڈالنا چاہتا ہوں۔ ورنہ آپ لوگوں سے کیسی شرم ـــــ؟"

اس پر زارا نے فخریہ انداز میں فیروزہ کی طرف دیکھا اور سوپ پینے لگی۔ زنیر نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور جی بھر کر کھانے کی تعریف کی۔ اور انہیں صاف صاف بتا دیا کہ دو مہینے بعد آج اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خوب گپ شپ ہوتی رہی۔ بعد میں فیروزہ اُٹھ کر ایرانی قہوہ بنا لائی۔ تھوڑی ہی دیر میں تینوں اتنے گھل مل گئے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زارا بولی ـــــ

"فیروزہ کیوں نہ مل کر نیرو کا مسئلہ حل کر دیں۔"

"کونسا مسئلہ ـــــ؟" فیروزہ نے پوچھا۔

"وہی کھانے کا مسئلہ۔"

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔" فیروزہ جماتی لے کر بولی۔ "ہے کوئی تجویز تمہارے ذہن میں ـــــ"

"ہاں میں نے سوچا ہے کہ ہفتہ اور اتوار کے روز ہم تینوں مل کر کھانا پکایا کریں گے۔ اور مل کر کھایا کریں گے ـــــ اس طرح ملاقات بھی ہوتی رہے گی، اور ان کا مسئلہ بھی حل ہو جائیگا۔"

"ٹھیک ہے زارا ـــــ کچھ تھوڑا سا کام یہ بھی سیکھ جائیں گے۔"

"کیوں مسٹر نیرو ۔ ۔ ۔" فیروزہ نے زنیر کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"جی ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ـــــ"

فیروزہ بیچ میں بولی "اب یہ پھر منافقت کریں گے اور پھر کچھ متکلف قسم کے فقرے کہنا

چاہیں گے۔"

زنیر شرمندہ ہوگیا۔

پیشتر اس کے کہ زارا بھی کچھ کہے۔

آہستہ سے بولا۔ "میری اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوسکتی ہے ——"۔۔۔۔اس پر دونوں لڑکیاں قہقہے لگا کر ہنسنے لگیں تھوڑی دیر تک ان کو دیکھنے کے بعد زنیر بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔

ویک اینڈ بہت دلچسپ گزرنے لگا۔ پہلے تو تینوں مل کر ہفتے کے روز سودا لینے جاتے پھر مینو بنایا جاتا۔ دونوں لڑکیاں کلنگ کرتیں اور زنیران کی مدد کیا کرتا، بلکہ وہ ساتھ ساتھ اسے کھانا پکانے کی تراکیب بھی سکھایا کرتیں اور زنیر سوچا کرتا —— جب سے وہ پیدا ہوا ہے۔ گھر میں ایک جیسے کی کھانے کھا رہا ہے۔ اس نے ایک بار بھی تو نہیں سوچا تھا کہ ایسے معمولی قسم کے کھانے پکانے میں عورتوں کو کتنا تردد کرنا پڑتا ہوگا۔ بار بار ایک کام کرنا پڑتا ہے پیاز ہی کو لے لیجیے —— دن میں جتنی مرتبہ کھانا پکائیں اتنی مرتبہ کاٹنا پڑتا ہے —— اگر مردوں کو گھر میں ایک کام بار بار کرنا پڑے تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اپنا بچہ کسے پیارا نہیں ہوتا۔ مگر بار بار بچے کو غسلخانے لے جانا پڑے یا اس کی نیکر بدلنی پڑے تو مرد کو کتنا غصہ آتا ہے اسے یہ سب کام گھٹیا لگتے ہیں۔ جنہیں صرف عورت کرسکتی ہے۔

واقعی اگر عورت نہ ہوتی تو یہ دُنیا کس طرح آباد ہوتی۔ مرد تو بس مسند نشین شہنشاہ بن کر بیٹھ جانا چاہتا ہے ——

اور بھی بہت سے پردے ہٹے تھے۔ زنیر احمد کی آنکھوں سے۔

ایک روز اچانک زارا کی ممی آگئیں۔ زارا نے بغیر کسی قسم کی جھجک کے زنیر احمد کو اپنی ممی سے ملوا دیا —— اب زارا کی ممی کی ایک مجبوری تھی۔ ہر آدمی کو یوں جانچا کرتیں۔ جیسے داماد ڈھونڈنے نکلی ہوں۔ خصوصاً اگر نووارد پاکستان کا ہوتا تو بالکل سی۔ آئی۔ ڈی کا محکمہ بن جاتیں۔

دو دن وہ زارا کے اپارٹمنٹ میں رہیں۔ دونوں دن شام کو زنیرا احمد کے اپارٹمنٹ میں چلی جاتیں اور کرید کرید کر سوالات کرتیں ——

"تمہارے والدین کہاں کے رہنے والے ہیں بیٹا؟"

"جی! وہ تو سرگودھا کے رہنے والے ہیں۔"

"اور دادا دادی ——!"

"جی مجھے کچھ اچھی طرح یاد نہیں۔ بس ہندوستان سے ہجرت کر کے سارا گھرانہ سرگودھا آ بسا تھا۔ غالباً وہاں لدھیانہ میں رہتے تھے۔"

"وہاں کچھ زمینیں وغیرہ بھی ہوں گی ——"

"مجھے کچھ معلوم نہیں جی ——"

"معلوم تو اس طرح ہوتا ہے بیٹا۔ اگر پاکستان آ کر تمہارے دادا دادی کو زرعی زمین یا کوئی جائیداد ملی ہو جو انہوں نے آگے اپنے بچوں میں تقسیم کی ہو تو صاف اندازہ ہو جاتا ہے۔"

"جی شکر گڑھ کی طرف ہماری تھوڑی سی زمین ہے۔ میرے دادا زمینداری کرتے تھے۔ مگر ابا جی تعلیم کے سلسلے میں لاہور آ گئے تھے۔ پھر وہ وہیں ٹک گئے۔ وہیں شادی کر لی۔ ہم سب لاہور میں پیدا ہوئے۔ اپنے آپ کو لاہور ہی کے شہری سمجھتے ہیں۔"

"کتنے بہن بھائی ہیں آپ لوگ ——؟"

"جی ہم سات بہنیں اور دو بھائی ہیں۔"

"ماشاء اللہ بہت بڑا کنبہ ہے ——"

"کتنے لوگ شادی شدہ ہیں؟"

"میری پانچ بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔"

"ماشاء اللہ —— بڑی ہوں گی تم سے؟"

"جی ہاں ....."

"باقی دو مجھ سے چھوٹی ہیں۔ مگر دونوں کے نکاح ہو چکے ہیں۔ اب میں جاؤں گا تو رخصتی ہو جائے گی۔"

"اور تمہارا دوسرا بھائی ——"

"جی وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ یعنی بارہ برس کا ہے۔"

"بارہ برس کا!" ممی حیران ہوئیں۔ پھر مسکرا کر بولیں۔ "اچھا..... اچھا تمہاری ممی چاہتی ہوں گی۔ تمہارا کوئی دوسرا بھائی ہو۔ اچھا..... اچھا....."

تھوڑی دیر الٹ پلٹ سے سوال کر کے پھر..... وہ زنیرا احمد کے رشتے داروں کی طرف آ جاتیں۔ کون کون کس کس عہدے پر ہے اور زنیرا احمد صاف صاف سب کچھ بتا دیتا۔ جو کچھ پوچھتی تھیں۔ وہ بتانا تو اس کا فرض تھا نا؟

دو دن زنیرا احمد کا ٹھونک بجا کے انٹرویو لینے کے بعد —— ممی چلی گئیں۔ مگر جاتے جاتے زارا سے کہہ گئیں۔ "اس بیچارے کا خیال رکھا کرو۔"

فیروزہ نے زارا کو آنکھ ماری۔

بعد میں بولی "لڑکا تمہاری ممی کو پسند آ گیا ہے۔ تمہاری ممی کو تو لڑکے پسند کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ جب تمہاری شادی ہو جائے گی۔ تو پھر ممی کیا کریں گی بیچاری —— ان کو ادارۂ خدمت خلق کھول لینا چاہیئے ——"

اس پر دونوں ہنسنے لگیں۔

نمی نے جا کر ڈیڈی سے بھی یہی کہا ہے۔

"اچھا لڑکا ہے۔ کھاتے پیتے لوگوں کا بیٹا ہے۔ دو سال کی ٹریننگ پر آیا ہے۔ وہ تو خیر کوئی مسئلہ نہیں —— شادی کے بعد لڑکی چاہے تو اس کی مہار موڑ کر اسے بھی ہمیشہ کے لئے امریکہ لے آئے۔"

"اب تم کیا چاہتی ہو ——؟"

ڈیڈی نے بیزاری سے کہا۔

"توبہ ہے۔ میں تو ایک بات کہہ رہی تھی آپ سے۔"

"ایسی کتنی باتیں تم مجھے پہلے بھی کہہ چکی ہو۔"

"ہاں تم باپ ہو نا؟ اس لئے تم ماں کی طرح نہیں سوچ سکتے۔"

"یہ زمانہ ماں باپ کے سوچنے کا نہیں"۔۔۔۔ ڈیڈی نے پائپ کا کش لے کر کہا۔ "بچے خود اپنے بارے میں بہتر سوچ لیتے ہیں۔ زہرا بچی نہیں۔۔۔۔ اس کو خود فیصلہ کرنے دو۔"

"ہونہہ۔۔۔۔ وہ تو ایم۔ ایس کے بعد نوکری کرنے کا سوچ رہی ہے۔"

"تو نوکری کر کے بھی شادی ہو سکتی ہے۔"

"تم تو بالکل امریکن ہو گئے ہو۔۔۔۔" ممی بُرا مان گئیں۔

"ڈارلنگ! تم اپنے ہی بارے میں سوچے جا رہی ہو۔ اس لڑکے کے بارے میں سوچو، آیا شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔۔۔۔ وہاں اس کی منگنی یا نکاح تو نہیں ہو چکا۔۔۔۔ ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کرے گا۔ زارا کو پسند کرتا ہے یا نہیں۔"

"بس۔۔۔ بس۔۔۔ ممی اُٹھ گئیں۔ تم مرد کی نگاہ کو کیا پہچان سکتے ہو۔ تم مرد تو اپنے آپ میں مگن رہتے ہو۔ مرد کی نگاہ صرف عورت پہچانتی ہے۔ خواہ کسی عمر کی عورت ہو۔"

"آپ ابھی تک بس میں آ جا رہے ہیں۔ ایک کار کیوں نہیں خرید لیتے۔۔۔۔؟" زارا نے سڑک پر زنیرا احمد کو اترتے دیکھ کر کہا۔

"کار کیسے خرید لوں۔۔۔؟"

"یہاں امریکہ میں کاریں بہت سستی ہیں۔ خصوصاً سیکنڈ ہینڈ کاریں تو ایک سو یا دو سو ڈالر میں بھی مل جاتی ہیں۔ خرید لیں۔ جاتے ہوتے بیچ جائیے گا۔"

"مگر مجھے تو یہاں کے ٹریفک کی ہی سمجھ نہیں آتی۔۔۔۔؟"

"سب آ جاتے گی۔"

"یہاں موٹر چلانا تو بہت مشکل لگتا ہے۔"

"جی نہیں۔۔۔۔ یہاں ٹریفک کا نظام اتنا منظم ہے کہ یہاں موٹر چلا کر مزہ آ جاتا ہے۔ میں تو بلکہ پاکستان میں موٹر نہیں چلا سکتی۔ واقعی ہاں۔۔۔۔ اس بدنظمی میں موٹر چلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کوئی کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ موٹر چلاتا جاتا ہے۔ چند بڑی سڑکوں کے۔۔۔۔ علاوہ جہاں ٹریفک کنٹرول سسٹم ہے۔ باقی ہر جگہ بڑی بدنظمی ہوتی ہے۔"

"مگر ہمیں تو اس نظم میں خوف آتا ہے۔ یہاں سڑکوں پر اتنے اشارے لکھے ہوتے ہیں۔ ذرا سی غلطی پر پکڑے جائیں گے، ایسا لگتا ہے۔ ٹریفک پر سپاہی نہیں فرشتے مقرر ہوں۔"

"یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔ یہاں آپ ذرا سی کوتاہی بھی نہیں کر سکتے۔ اگر بھول چوک ہو

جاتے گی، تو فوراً دھر لئے جائیں گے۔ اسی لئے تو یہاں لوگ ٹریفک کے قوانین کا بہت احترام کرتے ہیں۔"

"ہاں تو آپ مجھ اناڑی کو پھنسانا چاہتی ہیں۔"

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ زارا بھی ابھی یونیورسٹی سے آئی تھی اور سڑک پر کھڑی تھی۔ ذرا دوران کا اپارٹمنٹ تھا۔ دونوں کا رُخ اپارٹمنٹ کی طرف تھا۔ "نہیں میں آپ کو پھنسانا نہیں چاہتی۔ چاہتی ہوں امریکہ آتے ہیں۔ تو کچھ دن اچھے گزاریں۔ سیر سپاٹے کریں۔ کچھ سیکھیں بیشک دفتر بس میں ہی جائیں، مگر چھٹیاں تو اچھی گزریں ـــــ جب کہ آپ کو اچھا خاصا الاؤنس مل رہا ہے ـــــ"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں؟"

"تو صبح کا اخبار دیکھنا شروع کردیں نا؟"

"کون معاملہ طے کرے گا؟"

"فون کرکے دیکھیے ـــــ ڈیلر خود آپ سے ملنے آجائے گا۔"

"مگر میں تنہا ان سڑکوں پر پھنس جاؤں گا۔"

"دیکھیے ـــــ میں اور فیروزہ باری باری آپ کے ساتھ ڈرائیونگ پر جایا کریں گے۔ اور آپ کو سڑکوں کے نام ـــــ اور ٹریفک کے سارے اصول سمجھا دیں گے۔"

"ٹھیک ہے؟"

"بلکہ یہ تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ میں بہت ڈر رہا تھا۔"

"آخر آپ لوگ اتنے ڈرپوک کیوں ہوتے ہیں؟"

"ڈرپوک نہیں ہیں ہم ـــــ شاید ہمیں احساسِ کمتری ہے کہ ہم ایک غریب ملک کے رہنے والے ہیں۔"

"ہر قوم کے باشندے کے پاس عزتِ نفس ہونی چاہیئے۔ اور اسے یہ سوچ کر ملک سے باہر آنا چاہیئے کہ وہ اپنے ملک کا نمائندہ ہے اور بہتر کارکردگی اور دیانتداری سے اپنے ملک کا نام اونچا کرے گا۔ اس کے بعد تو احساسِ کمتری کا جواز نہیں ملتا۔ محنت کرنا، مشقت کرنا اور عزت کی

روٹی کھانا کوئی بُری بات نہیں۔ اب دیکھیں نا؟ امریکہ اور یورپ کتنے امیر ملک ہیں۔ ساری دنیا ان کے آگے ہاتھ پھیلا رکھا ہے۔ مگر انہیں ملکوں کے باشندے ہمارے جیسے غریب ملکوں میں کیا لینے جاتے ہیں۔ ان کو بھی روزگار وہاں لے جاتا ہے۔ ایک بات یاد رکھیں۔ نیرو صاحب! دیانت دار اور محنتی آدمی کبھی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ ہمارا ماضی شاندار رہا ہے۔ ہمیں شاندار کام کرنے چاہئیں۔ غریب ہونا معیوب نہیں ـــــ بددیانت ہونا معیوب ہے۔ آپ کو علم ہے ـــــ کہ ہمارے یہاں صلاحیتوں کی کمی نہیں ـــــ؟"

زینر نے حیرت سے پلٹ کر زارا کی طرف دیکھا اور مزید حیران ہوکر بولا۔

"کمال ہے آپ امریکہ میں رہتے ہوئے اپنے وطن سے محبت کرتی ہیں؟"

"بھئی وطن تو وطن ہوتا ہے۔" ـــــ وہ ہنس کر بولی۔ "ہم جس زمین پر بھی رہیں۔ ہمارے اندر وطن کی خوشبو رہے گی۔ بے ضمیر لوگ اپنے وطن کو بھول جاتے ہیں یا اس پر کیچڑ اچھالتے ہیں ـــــ"

"کاش آپ پاکستان میں ہوتیں؟"

"اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں جہاں بھی ہوں۔ میں پاکستانی ہی ہوں، بلکہ میرا اس جگہ پر رہنا زیادہ بہتر ہے۔"

"کیوں ـــــ؟"

"کیونکہ ان ملکوں میں بھی کچھ ضمیر فروش ہموطن آکر آباد ہوگئے ہیں۔ جو اپنی گھٹیا حرکتوں سے ہر جگہ پاکستان کو بدنام کرتے ہیں۔ ایسے میں ہم آگے ہوکر واضح کرتے ہیں کہ ہم ویسے نہیں، ایسے ہیں۔"

"آپ نے تو آج بالکل نئی باتیں بتائی ہیں؟"

"آپ نئے نئے آتے ہیں نا؟ کچھ نہیں جانتے۔ . . . میں آہستہ آہستہ آپ کو کچھ ہموطنوں سے ملاؤں گی ـــــ جن سے مل کر آپ کو واقعی افسوس ہوگا ـــــ کیونکہ وہ اپنا دین، ایمان سب ڈالر کو سمجھنے لگے ہیں اور ڈالر کی خاطر گھٹیا سے گھٹیا کام بھی کرسکتے ہیں۔"

"واقعی ـــــ؟"

"جی ہاں ـــــ اور مجھے وہ لوگ بہت بُرے لگتے ہیں. جو فیشن کے طور پر اپنے ملک یا اپنے ملک کی مصنوعات کو بُرا کہتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ اپنے ملک کا مقابلہ بڑے بڑے ملکوں سے کرنے لگ جاتے ہیں۔ مگر اپنے ملک کی ترقی میں ذرا بھی حصّہ نہیں لیتے ـــــ یہاں ہیں ایسے لوگ' جو دو چار سالوں بعد پاکستان جاتے ہیں تو واپس آکر سو سو باتیں بناتے ہیں۔ میں یہ سمجھتی ہوں جس نے اپنے وطن کو گالی دی۔ گویا اپنی ماں کو گالی دی۔"

"واہ ـــــ" زنیر احمد جھوم اٹھا۔

کیونکہ جب سے وہ امریکہ آیا تھا۔ وہ بھی ایک ایک بات سے متاثر ہو رہا تھا۔ اور اس کا موازنہ اپنے وطن کی ہر بات سے کرتا رہتا تھا۔

"آپ کی باتیں سُن کر تو ایک دم گھر یاد آگیا ـــــ؟"

"اچھا....." وہ ہنس پڑی۔

"گھر یاد آیا ہے ـــــ یا کوئی اور بھی ـــــ؟"

زارا نے یہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

زنیر احمد نے اس ادھورے فقرے کو بڑھ کر پکڑا نہیں۔ اسے کھلنے کے لئے فضا میں چھوڑ دیا اور اس بھری بھری خوب صورت لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ دُور سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی ڈوبتی شعاعوں کی سیدھ میں دونوں چلے آرہے تھے ـــــ یہ ڈوبتی ہوتی زرد، سنہری شعاعیں اس گندم کی طرح سنہری لڑکی پر پڑ رہی تھیں ـــــ آمنے سامنے سونا ٹکرا رہا تھا ـــــ سونے میں سے آگ نہیں ٹھنڈک نکلتی ہے ـــــ یہ ٹھنڈک زنیر احمد کے دل میں اتر گئی.... اس کا بے اختیار دل چاہا۔ آگے بڑھ کر اس کی پتلی کمر کے گرد بازو کی زنجیر بنالے۔ اور بالکل اس طرح چلنا شروع کردے، جس طرح نوجوان امریکن لڑکے اور لڑکیاں چلتے ہیں۔

"آپ کو معلوم ہے۔ اس ہفتے لونگ دیک اینڈ آرہا ہے ـــــ؟" زارا نے پوچھا۔

"ہاں ـــــ" زنیر بولا

"ہم نے پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا ہے، آپ چلیں گے؟"

"کون کون جا رہا ہے ـــــ؟"

"میں اور فیروزہ ـــــ اور آپ ـــــ اگر جانا چاہیں تو ـــــ"

"فیروزہ بھی جاتے گی ـــــ؟ تو پھر کیا خاک مزہ آئے گا۔" کہنے کو تو زنیر نے یہ کہہ دیا۔ مگر ایک دم شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

زارا معنی خیز انداز میں مسکراتی اور بولی۔ "فیروزہ کا بوائے فرینڈ عبدالکریم بھی ساتھ جا رہا ہے۔"

"ہیں ـــــ اس کا فرینڈ ہے؟"

"جی ہاں ـــــ وہ ایک انڈونیشین مسلمان ہے۔ یہاں رہتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں بھی چلوں گا ـــــ!"

زارا واپس آئی۔ تو اس کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا ـــــ چار مہینوں سے زنیر سے تفصیلی ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔ کچن میں ہڑبونگ مچتی ـــــ لفٹ میں تنہا اوپر نیچے آتے بازار ایک ساتھ جاتے ـــــ زارا ہی نے زیادہ تر اسے یہاں کے ٹریفک کے اصُول سمجھاتے تھے۔ روز ہی اس کے ساتھ کسی نئی جگہ پر جاتی تھی۔ مگر حیران بھی ہوتی تھی زنیر عام آدمیوں سے کتنا مختلف تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اسے بالکل اناڑی دکھائی دیتا۔ ایسے آدمی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے نا؟

جس پکنک اسپاٹ پر زارا اور فیروزہ اسے لے گئی تھیں۔ وہ ایک جھیل کے کنارے تھا اور جھیل میں مختلف پرندوں کی شکلوں کے شکارے بھی چل رہے تھے۔ فیروزہ اور عبدالکریم ہاتھوں میں ہاتھ دے کر یوں ایک طرف نکل گئے۔ جیسے کوئی اور ان کے ساتھ تھا ہی نہیں...

زارا اور زنیر بھی گھوم پھر کر واپس آگئے۔ وہاں اور بھی بے شمار لوگ تھے مگر ہر ایک دوجے میں مست تھا۔ کسی کو کسی دوسرے کو دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ زارا ایک ناول لے آئی تھی۔ اس کا خیال تھا۔ جب بور ہونے لگیں گے۔ تو وہ ناول پڑھنا شروع کردے گی۔

وہ ایک بانہہ پہ سارے جسم کا زور ڈالے۔ دوسرے ہاتھ سے ناول پکڑے پڑھ رہی تھی کہ ایک دم زنیر اردگرد کا جائزہ لے کر واپس آگیا۔ اور بولا۔

"آپ یہاں بھی کتاب لے آئیں ـــــ؟"

زارا نے اپنی وحشی آنکھیں اُٹھا کر زنیر کو دیکھا اور بڑی آہستگی سے بولی۔

"آپ مجھے، آپ کیوں کہتے ہیں۔ کیا میں آپ سے بڑی لگتی ہوں"

"نہیں تو ——"

"پھر ——"

"آپ بھی تو آپ ہی کہتی ہیں"

"چلو آج کے بعد میں تمہیں تم کہہ دیا کروں گی۔ مجھے تو آپ کہنا ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ یہاں امریکہ میں تو والدین کو بھی آپ کہنے کا رواج نہیں ہے"

"بس عادت سی پڑ جاتی ہے"، زنیر بولا۔

"نہیں ہمارے ہاں تکلفات کا بہت رواج ہے اور ایک دم بے تکلف ہونے کو پسند نہیں کیا جاتا ——؟"

"حالانکہ تم مجھ سے ایک دم بے تکلف ہو گئی تھیں۔ اور میں نے اسے پسند کیا تھا"

"اچھا ...."، زارا مسکراتی۔ "تم نے اس پسندیدگی کا ذکر پہلے تو کبھی نہیں کیا؟" زنیر نے نظریں جھکا لیں ....

زارا اسے دیکھتی رہی۔ پھر کتاب پڑھنے لگی۔ زنیر نے نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔

"تم نے فیروزہ اور کریم کو دیکھا ہے —— ذرا دیکھو کس طرح بیٹھے ہیں؟"

میں تو انہیں روز ہی دیکھا کرتی ہوں۔ زارا نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

"کیا محبت ایسا ہی جذبہ ہے کہ آدمی اپنے ارد گرد سے بے نیاز ہو جاتا ہے"

"پتہ نہیں ——"، زارا نے ایک دم کتاب سے نظریں ہٹا کر کہا۔

"مجھے تو کوئی تجربہ نہیں نیرو"، زارا آہستہ سے بولی۔ "تم بتاؤ —— تم نے کبھی محبت کی ہے"

زارا کی آواز میں جانے کیا تھا۔ زنیر سر سے پیر تک لرز گیا۔ اس کی نظر زارا کے اس ہاتھ پر چلی گئی جو گھاس پر پڑا ہوا تھا —— گورا گلابی ہاتھ —— جیسے کہ گلاب کا پورا کھلا ہوا پھول رکھا ہو ——

وہ غور سے اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگا اور زارا اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ کافی لمحے یونہی بیت گئے ——

گھاس پر پڑا گلاب انگارہ بن گیا تو بے اختیار زنیر نے اپنا گرم گرم ہاتھ زارا کے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا —— بلکہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں چھپا لیا۔ ڈھک لیا —— پھر اس نرم و گداز ہاتھ کو تھام کر اس زور سے دبایا کہ زارا کو اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔

کس قدر خوب صورت انداز تھا۔ اظہارِ محبت کا —— زارا نے اپنا ہاتھ چھڑایا نہیں۔ جانے کب تک وہ ہاتھ زنیر کے ہاتھ میں رہا —— پھر وہ ہاتھ اس کی آنکھوں تک گیا۔ اس کے ہونٹوں تک گیا —— اور ہاتھ اس کے دل تک پہنچ گیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں کی ہنسی نکل گئی۔ زنیر کی آنکھیں چل رہی تھیں۔ سوال کر رہی تھیں —— سُلگ رہی تھیں۔ زارا کی آنکھیں شرما رہی تھیں —— دونوں جذبات کے پُل صراط پر پہنچ گئے تھے۔ زارا جانتی تھی۔ محبت میں ایک کمزور لمحہ ضرور آتا ہے —— جو سب سے زیادہ مضبوط بن جاتا ہے۔

محبت تو اوہی نغمہ ہے۔

آفاقی زبان ہے ——

اس کے معانی تو آسمانوں پر لکھے نظر آتے ہیں۔ چاند ستارے، بادل ہوائیں، سب محبت ہی کے مظہر ہیں۔

محبت تو جنت کا میوہ ہے۔

اسے چکھنے کے بعد تن من کی ساری بھوک مٹ جاتی ہے۔

محبت تو انکساری کا آبشار ہے۔

ایک بار اس کے رم جھم پانی سے غسل کر لیں تو تن میں انا کے سارے کیڑے مر جاتے ہیں۔

محبت تو ایک آسمانی آگ ہے۔

ایک خالی اسے زمین پر لے آیا تھا۔ تب سے بے رحم دھرتی سُلگ رہی ہے۔

زارا کے چہرے پر وہ سارے رنگ نکھر آئے۔ جو محبت کے جھروکوں سے جھانکا کرتے ہیں۔

.... یہ سارے رنگ جوانی کے ہمجولی ہیں ... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ دنیا کے میلے میں

کوئی ایسی شبیہہ نظر آجاتی ہے جس کو دیکھ کر تلاش کا چلتا پانی رک جاتا ہے ـــــ جہاں پانی رکتا ہے۔ وہیں ایک گہری جھیل بن جاتی ہے ـــــ ورنہ تو تلاش ناکامی کی صورت میں متعفن ہو جاتی ہے۔

"ہاں تو ہو گئی بات ـــــ"

فیروزہ نے رات کو سونے سے پہلے زارا کو چھیڑا۔

زارا صرف مسکرادی۔

"اچھا یہ تو بتا مجھے ـــــ کہ اس کو دن نے بات کیسے شروع کی؟"

"اسے کو دن کہہ رہی ہے؟"

"اور کیا کہوں ـــــ تیرے سامنے تو اس کے منہ سے بات ہی نہیں نکلتی۔ پھر اس نے محبت کا اظہار کس زبان میں کیا؟"

"خاموشی کی زبان میں ـــــ"

"ہیں ـــــ؟ خاموشی کی زبان کیا ہوتی ہے؟ اور اس میں اظہار محبت کیسا ہوتا ہے؟"

"بس ہو گیا ـــــ؟" زارا نے نرم تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

فیروزہ نے آگے بڑھ کر وہ تکیہ اس کے منہ سے ہٹا دیا اور بولی

"آج پوچھے بغیر سونے نہیں دوں گی؟"

"جب کوئی بات نہیں ہوئی تو کیا بتاؤں ـــــ؟"

زارا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"قسم سے ـــــ میں نہیں مانتی۔"

"نہ مان ـــــ"

"اور تجھے تسلی کیسے ہو گئی۔ جبکہ محبوب کے ایک بار اظہارِ محبت سے بالکل تسلی نہیں ہوتی۔ دل چاہتا ہے۔ وہ جب تک بیٹھا رہے۔ بار بار اظہارِ محبت کرتا رہے۔ ہر روز ملے ـــــ تو ہر روز نئے طریقے سے اپنی محبت کا یقین دلائے۔ بھلا عورت کو کبھی ایکبار اظہارِ محبت سے تسلی ہوئی ہے؟"

"میں نہیں جانتی ـــــ" زارا بچڑ گئی۔

"مگر میں تو پوچھ کر رہوں گی۔"

"پھر جا اسی سے پوچھ لو۔"

"سچ سچ اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ پھر بھی تم نے سب سمجھ لیا ـــــ؟"

زارا ہنسنے لگی۔

"واقعی تم لوگ پاگل ہوتے ہو۔ عجیب۔ کس قدر عجیب ـــــ مرد محبت کئے جاتے ہیں اور اظہار نہیں کرتے۔ اور لڑکیاں ذرا سے اشارے کنائے کو محبت کی انتہا سمجھ لیتی ہیں۔"

زارا پھر ہنسنے لگی۔

"کیا بکواس ہے۔ یا تم لوگ منافق ہو۔ یا پھر بڑے گہرے ہو۔"

"ہم لوگ گہرے ہیں ـــــ؟"

"تو اس گھنے آدمی کے ساتھ کیونکر گزارا ہو گا ـــــ؟"

"ہو جائے گا ـــــ!"

"اچھا تو معاملہ اس قدر آگے بڑھ چکا ہے۔"

"تمہارا وہ ولیسی بیر کی آنکھوں والا کریم جب تمہارے پاس ہوتا تو پھر تمہیں دنیا میں کسی اور کا ہوش نہیں ہوتا۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہوتا رہا اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہ چلا . . . ."

"اچھا صبح ہو لینے دو اس گھنے حضرت سے دو دو ہاتھ کروں گی اور پوچھوں گی بھئی چار مہینے کے طویل انتظار کے بعد ـــــ اس قدر بودے طریقے سے اظہار محبت کر گئے ہو۔ کہ نہ بھونچال آیا ـــــ نہ طوفان ـــــ اور اس کو دیکھو کیسے تن من ہارے بے سدھ لیٹی ہے۔ اس نے تکیہ اٹھا کر زور سے زارا کے منہ پر دے مارا۔

پاپا جی یہ کہتے تھے کہ ایک بار پاکستان چل کر اس لڑکے کے والدین سے ملا جائے۔
مگر ممی جان کہتی تھیں۔ سب ٹھیک ہے۔ میں نے ہر طرح سے تسلی کر لی ہے۔ اتنا شرمیلا شریف النفس اور منکسر المزاج لڑکا اور کہاں ملے گا۔ اس میں آج کل کے لڑکوں والی فرفر فاں ہی نہیں ہے۔ اتنے دن ہو گئے امریکہ آتے۔ سگریٹ اور شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یہ امریکی لڑکیاں تو اجنبیوں کے گلے پڑتی ہیں۔ اس کو کسی لڑکی کے ساتھ نہیں دیکھا دفتر سے آکر اپنے اپارٹمنٹ میں پڑ رہتا ہے ——

"جب بھی بلاؤ جی۔ جی کرتا ہوا آجاتا ہے ——"

پاپا جی کہتے تھے۔ یہ کوئی مرد کی کوالیفیکیشن نہیں ہوتی —— جی . . . جی کرنا تو مرد کی مجبوری ہوتی ہے۔ ویسے بھی کیا ہرج ہے اگر اگلے سال تک اس بات کو روکے رکھیں ان کا ارادہ ۱۹۸۰ء کے آخر میں پاکستان جانے کا تھا —— وہاں جا کر وہ باقاعدہ اس کے والدین سے بات کرنا چاہتے تھے۔

مگر ممی جی، لڑکے پر بُری طرح ریجھ گئی تھیں۔ ممی جی اگلے سال حج پر جانا چاہتی تھیں اس لئے اس فرض کو جلدی نبھانا چاہتی تھیں —— اور زارا کے دِل میں بھی ایک چراغ جل اٹھا تھا ——

اس نے تو اس اجنبی سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا —— اس نے ذرا سی دستک دی اس

نے پٹ سے دِل کا دروازہ کھول دیا۔ اندر چاندنی جیسا دودھیا کورا کاغذ بچھا تھا۔ جھٹ ستاروں سے اس نے اس کورے کاغذ پر اجنبی کا نام لکھ دیا —— نام چاند بن کر دل کے صحرا میں اتر گیا —— صحرا کی گود میں چاند کا جوبن نکھر آتا ہے۔

"زارا" زنیر نے دھیرے سے اس کی کمر کو چھوا تو وہ پرے ہٹ گئی۔

"کیا بات ہے؟"

اس نے مڑ کر دیکھا تو زنیر کا چہرہ تپ رہا تھا۔ یہ تپش اس کو اچھی لگتی تھی اس میں طلب تھی والہانہ پن تھا ایک سوز تھا۔ جب وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا تو اس کا چہرہ گرم توا بن جاتا تھا

"آؤ میرے کمرے میں کچھ دیر باتیں کریں"

"کمرے میں نہیں آؤں گی"

"کیوں ——؟"

"کمرے میں آنے سے مجھے ڈر لگتا ہے"

"مگر اس سے پہلے تم بیسیوں مرتبہ آئی ہو۔ بلکہ میرا کمرہ صاف کیا ہے تم نے ——"

"تب کی اور بات ہے"

"اب کیا ہو گیا ہے ——؟"

"تم نہیں جانتے کیا ہوا ہے ——؟"

اس نے اس طرح اپنی وحشی آنکھوں کی سلاخیں۔ زنیر کی آنکھوں میں گاڑیں کہ زنیر چکرا گیا۔ پھر وہ دوڑ کر اپنے اپارٹمنٹ میں چلی گئی۔ فیروزہ سو چکی تھی اور اس کے اپنے بستر پر نوجوانی کے تر و تازہ ارمان بکھرے پڑے تھے ——

دُوسری رات ـــــ پھر زنیر بالکنی میں آ کھڑا ہوا اور بولا

"رات بھر مجھے نیند نہیں آئی ـــــ"

"کیوں ـــــ؟" وہ انجان بن کر بولی۔ حالانکہ کر وٹیں وہ بھی بدلتی رہی تھی۔

"تم جانتی ہو۔۔۔۔۔ اپنا کمرہ مجھے اس سے پہلے اتنا سرد اور اتنا تنہا کبھی نہ لگا تھا۔ زارا تم آخر میرے کمرے میں کیوں نہیں آتی ہو؟"

زارا جانتی تھی۔ اب وہ اپنی بے چینی کے سوا نیزے پر پہنچ چکا ہے۔ یہ چپ چاپ عاشق، اندر سے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ جذباتی اور جنگلی'

بولی۔"اس بار ممی آرہی ہیں۔ پاپا بھی ساتھ ہوں گے۔ بات کرو نا ـــــ"

"ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا تو اب تمہیں ڈر لگتا ہے۔ ڈرنے والوں کو محبت نہیں کرنی چاہیئے۔"

"جب جب تمہارے جیسی پاگل کر دینے والی لڑکیاں سامنے آتی رہیں گی ـــــ مرد راستہ بھولتے رہیں گے۔"

"اچھا ـــــ اتنے بزدل بن کر نہ دکھاؤ۔ جتنے تم ہو نہیں۔۔۔۔"

زنیر ہنسنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے مجھے زبردستی کرنا بھی آتا ہے۔"

"مگر تم جانتے ہو نا؟ میں پاکستانی لڑکی ہوں۔ میرے اندر سے میرا کلچر، رسم و رواج

اور پرانی روایات نہیں نکلیں، لیکن ـــــ میں امریکہ میں رہتی ہوں تو کیا ہوا ـــــ؟ تم مجھے چاہتے ہو تو کیا بڑی بات ہے ـــــ تم مجھے چھو نہیں سکتے ـــــ ہم نے ابھی تک وہی اسٹینڈرڈ مقرر کر رکھے ہیں۔ کہ حد بندی لائن کو شوہر ہی توڑتے ہیں ـــــ میں بڑی بے تکلف اور صاف گو لڑکی ہوں ـــــ مگر ـــــ نیرو ـــــ شادی کے معاملے میں ـــــ ویسے ہی ہوں، جیسی لڑکیاں تمہارے ملک میں ہوتی ہیں۔"

"تو پھر میں اور کتنا صبر کروں۔"

"کرسمس سے پہلے میرا آخری سمیسٹر ہوگا ـــــ اس سے پہلے تو میں شادی بھی نہ ہونے دوں گی۔ ویسے تم ممی سے بات کر لینا۔"

"اُف میرے خدایا۔ یعنی دو مہینے اور صبر کرنا ہوگا۔"

"جی ہاں۔۔۔۔"

یہ کہہ کر زارا اپنے اپارٹمنٹ میں چلی گئی۔

نئے سال کی برف کپاس کے پھولوں کی طرح فضا میں دھیرے دھیرے گر رہی تھی۔ باہر فضا خواب آلود ہو رہی تھی۔ اور اندر زارا کی سہیلیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ زارا چاہتی تھی کہ اس کی شادی بالکل پاکستانی طریقے سے ہو۔ مہندی کی رسم کی جائے۔ ساری رات ڈھولک بجائی جائے۔ اور لوک ناچ کئے جائیں۔ شادی کے لئے اس نے سرخ غرارہ سوٹ پاکستان سے منگوایا تھا جبکہ زنیر ان باتوں کے حق میں نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا۔ کمال ہے آپ لوگ امریکہ میں رہ کے اتنے قدامت پسند ہیں۔ اب تو پاکستان میں لڑکیاں سرخ کپڑے پہننا پسند نہیں کرتیں۔

"جی نہیں ——" زارا کی ضد تھی۔ کہ صدیوں سے ہمارے ہاں دلہن کا تصور سرخ کپڑوں سے وابستہ ہے۔ گلاب کا پھول لگتی ہے۔ دلہن اور سرخ رنگ کیسا سہاگن سا رنگ ہے۔

"دیکھو نا یورپ اور امریکہ میں دلہنیں سفید لباس پہنتی ہیں۔ مگر کیوں؟ اس کی ایک نفسیاتی وجہ ہے۔ زارا کہتی۔

"تم بھی سفید لباس پہنو۔" زنیر کہتا۔ "تم ایک روایت شکن لڑکی ہو۔ نئی راہ متعین کرو۔"

"کمال ہے۔" زارا کہتی۔ "زنیر تم ویسے کتنے لئے دیتے رہتے ہو۔ تمہارے اپنے کلچر کی چھاپ تم پر گہری ہے۔ مگر اندر سے کتنے باغی ہو۔ فیروزہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے کہ تم "گھنے آدمی" ہو۔"

اس پر زنیر بے اختیار ہنس دیتا۔

اس کو بس شادی کی جلدی تھی۔ وہ رسموں اور رواجوں میں الجھ کر معاملہ التوا میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی بیتابی زارا کو بہت پسند تھی۔ وہ سوچتی محبت کے بارے میں زنیر نے ابھی

ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ جانے کیسے کیسے تیر اپنے ترکش میں سنبھال کے رکھے ہوں گے —— بند جھرنے کا منہ کھول دو تو پانی کیسی وارفتگی اور جنونی کیفیت میں جھر جھر نکلنے لگتا ہے۔ اسے ایسا جنون پسند تھا۔

وہ شادی سے پہلے کے جمع خرچ کی قائل نہ تھی۔ خاوند نے بھی تو اظہار نہ کیا تھا دونوں طرف گھٹائیں بھری کھڑی تھیں۔ انہیں بس ہوا کا اشارہ ملنے کی دیر تھی۔

دھواں دھار اور چھاجوں مینہ برسنے کی امید تھی۔

زارا نے اپنی ضد منائی، سرخ کپڑے پہنے بلکہ اس کے ساتھ ہی فیروزہ نے بھی سرخ پاکستانی غرارہ پہنا۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ سارے پاکستانی جو آس پاس رہتے تھے شریک ہوئے۔ بارات واشنگٹن ڈی سی میں گئی تھی۔ ممی اور پاپا کے گھر —— اور وہاں سے رخصت ہو کر سب میری لینڈ زنیر کے اپارٹمنٹ میں آ گئے تھے۔

دوسری صبح .... جب زارا صبح صبح اپنی چوڑیاں اور انگوٹھیاں پہن رہی تھی تو آئینے کے آگے کھڑے ہو کر سوچ رہی تھی۔

نیرو کیسا خوب صورت آدمی ہے۔ کتنا مکمل —— اور تجربہ کار —— یہ تو ذرا بھی اناڑی نہیں لگتا۔ شکل سے جتنا معصوم اور بدھو نظر آتا ہے۔ حقیقت میں بالکل ویسا نہیں ہے....

اور دوسرے آئینے کے آگے شیو کرتا ہوا زنیر سوچ رہا تھا۔

کتنی پیاری ہے یہ لڑکی۔

کہنے کو امریکہ میں رہتی ہے —— مگر کتنی پاکباز اور شرمیلی —— اَن چھوئی۔ کچی کلی ادھوری مگر معطر معطر —— بالکل ہماری روایتی لڑکیوں کی طرح ——

یوں لگتا ہے۔ نئی تہذیب کا گرم جھونکا تو اسے چھو کر بھی نہیں گیا۔

کوری صراحی کی مانند ——

جس میں پہلے پہل پانی ڈالیں تو مدھر آوازوں کے ساتھ سمٹتی جاتی ہے۔

بظاہر کتنی تیز اور طرار ہے۔

یہ لڑکیاں بھی ہاتھی کے دانت ہوتی ہیں۔

کبھی کچھ ـــــ کبھی کچھ ـــــ

اپنے آپ کو ہر ماحول اور ہر جگہ میں غلافوں میں لپیٹ کر رکھتی ہیں۔ کیسی سندرسی ہے یہ ـــــ کہ اس کا نشہ اترتا ہی نہیں۔

دوسرے دن زنیر نے ہوٹل میں دعوتِ ولیمہ دے رکھی تھی۔ وہیں پہ زارا نے زنیر کے بہت سے دوستوں سے ملاقات بھی کی۔ اور تیسرے دن وہ کینیڈا کے لئے روانہ ہو گئے۔

انہوں نے سُن رکھا تھا کہ اکثر نو بیاہتا جوڑے اپنی شبِ عروسی منانے کے لئے سیدھے نیاگرہ فال چلے جاتے ہیں۔

کیوں ؟

وہاں پہنچکر نیاگرہ فال کے تیز و تند دھاروں کی بوچھاڑ میں کھڑے ہو کر زارا ـــــ کو آپ ہی آپ پتہ چل گیا۔

شاید اس لئے کہ شادی کی پہلی رات۔ دونوں طرف یہی تندی اور تیزی ہوتی ہے۔

بعض اوقات جذبات کا ٹکراؤ کائنات کا ٹکراؤ بن جاتا ہے۔

ٹھک ٹھک .... دروازے پر دستک ہوئی تو زارا اپنے بستر میں کسمسائی۔

زنیر بولا "مجھے تمہاری یہ سہیلی زہر لگتی ہے ..... وقت بے وقت آجاتی ہے۔ تنگ کرنے"

"ہائے بیچاری صُبح ہی صُبح ہمیں بیڈ ٹی دینے آئی ہے"

"یہ وقت ہے جگانے کا"

"دیکھو تو دن کے نو بج رہے ہیں"

"جو بھی ہو .... اسے منع کر دو۔ یہ ہمارے کمرے میں نہ آیا کرے"

"شادی سے پہلے تمہیں بہت اچھی لگتی تھی۔ ہمیں تنہائی میں بیٹھنے کے مواقع جو دیا کرتی تھی"

"تب کی اور بات تھی۔ اس وقت وہ ہماری مجبوری تھی"

"اور اب ہم اپنے آپ میں مست ہو کر اسے بھول جائیں"

"ویسے بھی ـــــ جب بھی اس کو دیکھو ـــــ اعصاب پر سوار نظر آتی ہے۔ مجھے اچھی نہیں لگتی"

ٹھک ٹھک .... دوبارہ دستک ہوئی تو زارا بستر سے نکل آئی۔ اُس نے اپنا ڈریسنگ گاؤن پہنا اور دروازہ کھول دیا۔

"گڈ مارننگ"

"گڈ مارننگ ـــــ" فیروزہ نے بھی خوشدلی سے کہا اور چائے کا ٹرے اسے تھما دیا۔

"شکریہ بہت بہت روزی" ــــ زارا نے پیار سے کہا: "تم بڑی پیاری ہو۔"

فیروزہ بھاگ گئی ــــــ

"ٹھہرو روزی بات تو سنو ــــ"

"نہیں" اس نے مڑ کر کہا۔ "میں صرف چائے دینے آئی تھی۔ آپ لوگوں کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی۔ پھر میں نیچے جاؤں گی۔ کپڑے دھونے کا ڈرجنٹ ختم ہو چکا ہے۔ آج مجھے لانڈری کرنا ہے۔ تم جب تیار ہو جاؤ تو اپنے اور زنیر کے کپڑے یہاں دروازے کے باہر رکھ جانا۔ میں دھو دوں گی۔"

"تھینک یو روزی ڈارلنگ ــــ"

زارا نے اندر جا کر دروازہ بولٹ کر دیا۔

"ہیرا ہے ہیرا میری سہیلی ــــ" زارا نے ٹرے میز پر رکھ دیا اور ایک پیالی زنیر کی طرف بڑھائی۔

"پتہ ہے وہ کیا کہہ رہی تھی۔"

"شکر ہے اللہ کار کی نہیں ــــ" زنیر نے چائے کا گھونٹ بھر کے کہا۔ "ورنہ آج تو میں اس سے اُلجھ پڑتا۔" زارا کرسی پر بیٹھ کر چائے سپ کرنے لگی۔ پھر خالی پیالی باورچی خانے میں رکھ کر اس کے پاس آ گئی۔ بستر پر بیٹھ کر کہا ــــ

"نیرو! تم بڑے حاسد ہو۔ یہ تو مجھے شادی کے بعد اندازہ ہوا۔"

"ہاں میں حاسد ہوں، ہوا بھی تم سے چھو کر گزر جائے تو میں تم سے حسد کرنے لگتا ہوں۔"

"تمہارا کیا بنے گا ــــ؟"

"کیوں ــــ؟"

"تم تو اپنے بچوں سے بھی حسد کرو گے۔"

"اسی لئے تو میں بچہ پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"مگر مجھے تو بچے بہت پسند ہیں۔" زارا نے ڈوب کر کہا۔

"ہاں اچھے ہوتے ہیں بچے ــــ مگر ابھی نہیں۔"

"ابھی کیوں نہیں ــــ؟"

"ابھی تو میں نے ــــ جی بھر کے تمہیں ــــ"... پھر وہ رُک گیا۔

"خود غرض نہ ہو نیرو۔ تم مجھے کوئی جاب بھی نہیں کرنے دیتے ــــ آگے پڑھنے بھی نہیں دیتے اور بچہ پیدا کرنے کے حق میں بھی نہیں ہو۔ پھر میں کیا کروں گی۔ دیکھو تو تین مہینے میں ہی میرے اوپر چربی چڑھ گئی ہے۔ مجھے گھر بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔"

"میں نے صرف محبت کرنے کے لئے تم سے شادی کی ہے ــــ" اور بس۔

"تم صبح کو دفتر چلے جاتے ہو ــــ تھوڑا سا کام کر کے میں اداس رہتی ہوں۔"

"بس میرا انتظار کیا کرو۔"

"نیرو ــــ" زارا نے مچل کر کہا۔ "یہ تو بہت زیادتی ہے۔"

"بس میں زندگی بھر ایسی ہی زیادتیاں کرتا رہوں گا۔"

"جب ہم پاکستان چلے جائیں گے نا ــــ تو پھر جتنی مرضی زیادتی کر لینا۔ یہاں مجھے کام کرنے کی اجازت دو۔"

"بس یہاں تو ایک ہی اجازت مل سکتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر ــــ زارا ہنسی تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"زارا ـــــ خدا کی قسم مجھے اب تم پر رشک آنے لگا ہے ـــــ" فیروزہ نے واقعی رشک میں ڈوب کر کہا۔

"کیوں ـــــ؟"

"تمہارے ملک میں شوہر اس طرح محبت کرتے ہیں؟"

زارا ہنسنے لگی۔

"بالکل کہانیوں والی محبت لگتی ہے۔ دیکھو نا۔ زنیر کی نگاہ تمہارے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں۔ ہر وقت تمہیں ساتھ لئے پھرتا ہے۔ ایک منٹ کے لئے کہیں نہیں جانے دیتا۔ تنہا نہیں چھوڑتا۔ اور کہنے کو تمہاری شادی کو چھ ماہ ہو گئے ہیں۔"

"ارے چھ ماہ ہی تو گزرے ہیں۔ صدیاں تو نہیں گزر گئیں۔" زارا بولی۔

"چھ ماہ بھی بہت زیادہ عرصہ ہے زارا۔ اکتانے والے تو ایک ماہ میں ہی اوب جاتے ہیں تم مرد کی فطرت کو نہیں جانتیں۔"

زارا نے اپنا اپارٹمنٹ چھوڑا نہیں تھا۔ ویسے وہ دن رات زنیر کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ مگر اس کے پرانے کپڑے اور پہلی چیزیں ابھی تک اپنے پرانے اپارٹمنٹ میں پڑی تھیں۔ ویسے بھی وہ اس سال کا کرایہ ایڈوانس دے چکی تھی۔ پھر اسے یہ بھی خیال آتا تھا اگر اس نے یکدم اپارٹمنٹ سے اپنے آپ کو بیدخل کر دیا تو سارا بوجھ بے چاری فیروزہ پر آ رہے گا۔ وہ چاہتی

تھی پاکستان جانے تک وہ فیروزہ ہی کی پارٹنر رہے۔ پھر فیروزہ ان کی خدمت بھی کرتی تھی۔ چائے بنا دیتی تھی۔ کپڑے دھو دیتی تھی ـــــ اگر وہ گھومنے گھامنے چل دیتے ـــــ تو ان کا کمرہ بھی صاف کر دیتی تھی۔

زارا کو تو صرف صبح کے وقت ہی فرصت ہوتی تھی جب زنیر دفتر جاتا تھا۔ پھر وہ آتے ہی اسے کہیں جانے نہیں دیتا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا روزی ـــــ کہ ہمارے ملک کے آدمی بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ شرمیلے نظر آتے ہیں۔ مگر ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔"

"ہاں اب میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ ہر عورت چاہتی ہے۔ اس سے ٹوٹ کر محبت کی جائے کاش! میں نے بھی کوئی پاکستانی لڑکا پسند کیا ہوتا!"

"اب بھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" زارا نے شرارت سے کہا۔

"کمینی ـــــ" فیروزہ دھاڑی ـــــ "تجھے معلوم ہے نا! میں عنقریب عبدالکریم سے شادی کر کے اس کے ملک جا رہی ہوں۔"

"یہ تو میں پچھلے دو سالوں سے سن رہی ہوں۔"

"تو دو سال اور بھی یہی کہتی رہوں گی۔" یہ کہہ کر فیروزہ ہنسنے لگی۔

"اچھا اگر تیرا ارادہ بدل جائے نا! یا اس عناب کی آنکھوں والے سے دل بھر جائے نا! تو مجھے پاکستان میں خط لکھ دینا۔ وہاں تیرا بندوبست کر دوں گی۔"

"اچھا یہ تو بتا ـــــ تو پاکستان کب جا رہی ہے۔؟"

"بس چھ مہینے رہ گئے ہیں۔ نیرو کی ٹریننگ پوری ہو جائے گی اور میں چلی جاؤں گی۔"

"تیرا امریکہ چھوڑنے کو کیسے جی چاہے گا؟"

"بھئی میں تو پاکستان میں رہنے کو مری جا رہی ہوں۔ یہ مشقت بھری زندگی مجھے پسند نہیں۔"

"مگر وہاں جا کر تو کیا کرے گی ـــــ؟"

"عیش کروں گی۔ بچے پیدا کروں گی ـــــ! کھا کھا کے موٹی ہو جاؤں گی۔"

"ہائے یہ آئیڈیالسٹک لڑکیاں ـــــ بالآخر موٹی موٹی بھری بھری عورتوں میں ڈھل جاتی

ہیں قیمتی کپڑے پہن کر مسکراتی ہیں اور ہیرے کی انگوٹھیاں انگلیوں میں پہن پہن کر دکھاتی ہیں۔

"یہ بھی زندگی کا ایک چلن ہے روزا ـــــ اور مجھے بے حد پسند ہے۔ وہاں ہمارے ملک میں گپ شپ لگانے کو وقت ہوتا ہے۔ کسی کے دُکھ سکھ سننے کا وقت ہوتا ہے۔ وہاں لوگ زندگی بڑے نیچرل انداز میں گزارتے ہیں۔"

زنیر نے زارا کو بتایا تھا کہ وہ لوگ اپریل کے آخر میں پاکستان جائیں گے۔ تب سے زارا تھوڑی تھوڑی کر کے کئی چیزیں اکٹھی کر رہی تھی اپنے سسرالی رشتہ داروں کے لئے۔ گو زنیر نے اسے تحائف خریدنے سے منع کر دیا تھا۔ مگر وہ تو رشتوں کی نزاکت کو سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی۔ جب کوئی امریکہ یا یورپ سے جاتا ہے تو سب عزیز و اقارب خواہ مخواہ کسی تحفے کی آس رکھتے ہیں۔ نہ لے جاؤ تو سو سو باتیں بناتے ہیں۔ ممی جی اور پاپا جی نے اسے ایک چیک دے دیا تھا تاکہ وہ پاکستان جاتے ہی اپنے لئے وہ تمام ضروری لوازمات خرید لے۔ جو شادی شدہ زندگی کا خاصا ہوتے ہیں۔ مگر وہ انہی میں سے پیسے نکال نکال کر تحفے جمع کر رہی تھی۔ اور زنیر سے چھپا کر اپنے اپارٹمنٹ میں رکھ لیا کرتی تھی۔

وہ بڑے شاندار طریقے پر پاکستان جانا چاہتی تھی۔ اپنے سسرال والوں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ کسی بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ کسی گرے پڑے خاندان کی نہیں ـــــ جو فاقے کرتا امریکہ پہنچ جاتا ہے ـــــ اور پھر کچھ بن جاتا ہے ـــــ

کبھی کبھی وہ زنیر سے پوچھتی ـــــ

"نیرو تم نے میرے بارے میں اپنی ممی کو تفصیل سے لکھ دیا ہے نا؟"

وہ کہتا "ہاں ہاں لکھ دیا ہے ـــــ"

"کیا کہتی ہیں وہ ـــــ"

وہ کہتی ہیں "جیسی تمہاری مرضی۔"

"وہ مجھ سے مل کر خوش ہوں گی۔"

"ضرور ہوں گی ـــــ ہاں ایک بات میں نے نہیں لکھی۔"

"کیا ـــــ؟" زارا کا دل دھڑک اٹھتا۔

"میں نے صرف یہ لکھا ہے کہ میں نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ یہ نہیں لکھا کہ وہ لڑکی مسلمان ہے اور پاکستانی ہے۔"

"اس میں کیا مصلحت تھی ـــــ؟"

"بھئی جب وہ تمہیں ملیں گی نا؟ تو جو رنجش ان کے دل میں ہوگی۔ وہ بھی یہ جان کر ایک دم دور ہو جائے گی کہ تم ہم مذہب اور ہم وطن ہو۔"

"واہ ـــــ تم تو بڑے چالاک ہو۔ یہ گر کہاں سے آئے تمہیں ـــــ"

"گر تو مجھے بہت سے آتے ہیں۔ اور مسلسل تم پر آزما رہا ہوں۔ اب تمہیں پتہ نہ چلے تو میں کیا کروں ـــــ؟"

"نیرو ـــــ مگر یہ بھی تو سوچو ـــــ اگر وہ لوگ کسی گوری چٹی میم کے منتظر ہوئے تو ـــــ؟"

"تو کیا تم کسی گوری چٹی میم سے کم ہو۔ ذرا اپنی رنگت دیکھو ـــــ ہاں اگر بالوں کو سنہری کر دا لو تو ـــــ ویسے نہ کراؤ تو اچھا ہے۔ اتنے گورے رنگ پر سیاہ کالی آنکھیں۔ اور رات کی طرح گھنگھور بال ـــــ اچھے خاصے آدمی کا ایمان متزلزل کر دیتے ہیں۔"

"تم اچھے خاصے آدمی ہو۔"

"جی ہاں ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا اپنی زندگی کے ساتھ کوئی خواہش نہ تھی مگر ـــــ" پھر وہ چُپ ہو گیا۔

"کیوں کوئی خواہش نہ تھی۔ یہ جوان آدمی کا دل خواہشوں کا میدانِ حشر ہوتا ہے۔ اور ہر دم وہاں قیامت آتی رہتی ہے۔"

"نہیں وہاں قیامت تمہاری صورت میں آتی ہے۔"

زارا ہنسنے لگی۔

"خدا کی قسم شادی سے پہلے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ تم ایسی لچھے دار باتیں بھی کر سکتے ہو۔"

"شادی سے پہلے میں نے تمہیں کسی بات کا پتہ چلنے نہیں دیا۔ ورنہ تم کہاں پھنستیں میرے جال میں۔"

"اچھا تو جال بچھایا تھا تم نے ـــــ"

"بھئی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر جال بچھانے کو دل کرتا ہی ہے نا؟"

"ٹھہرو شکاری کے بچے میں تمہیں مزہ چکھاتی ہوں۔"

اُس نے تکیے اُٹھا اُٹھا کر زنیر پر پھینکنے شروع کر دیے۔ مگر زنیر نے دوسرے تکیے پر ہی اس کو دبوچ لیا۔

جن دنوں زارا چپکے چپکے پاکستان جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

انہی دنوں اچانک ممی کو ایک درد اٹھا اور ہسپتال جانا پڑا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا اپنڈیکس ہے۔ اور فوراً اپریشن ہوگا۔

اس وقت زارا کے سوا کوئی نہ تھا جو دن کے وقت ممی کے ساتھ ہسپتال میں رہتا اور ممی کی خبر گیری کرتا۔ پاپا بھی ان دنوں لاس اینجلس کاروبار کے سلسلے میں گئے ہوتے تھے۔

جب زارا دونوں ہاتھ پھیلاتے ممی کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی تو زنیر منہ لٹکائے ہسپتال جا پہنچا۔

"کیا بات ہے نیرو ——؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ بتاؤ بھی پلیز ——"

"تم پہلے ہی پریشان ہو۔"

"تو کیا ہے —— مجھ سے تمہیں پریشان نہیں دیکھا جاتا۔"

"ابھی ..... ابھی پاکستان سے کال آئی ہے ——"

"کیا ——؟"

"میرے ڈیڈی ——"

"اوہ کیا ہوا تمہارے ڈیڈی کو ——"

"میرے ڈیڈی کو —— زنیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے —— ڈیڈی کو ایک دن میں دو ہارٹ اٹیک ہوتے ہیں۔ ہسپتال میں ان کی حالت نازک ہے۔ ممی نے فوراً بلایا ہے۔"

"تو جاؤ ..... چلے جاؤ نا؟"

"تمہارے بنا کیسے جاؤں؟"

"دیکھو زنیر میں کیسے جا سکتی ہوں۔ اس وقت ممی کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔"

"اور میں تمہارے بغیر کیسے جا سکتا ہوں۔ میں تو تنہا جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"نیرو ..... نیرو ..... ذرا وقت کی نزاکت کا خیال کرو۔ ہم دونوں تو خوشی خوشی پاکستان جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کسے معلوم تھا۔ ممی کا آپریشن راہ میں آپڑے گا۔ یا تمہارے ڈیڈی کو اٹیک ہو جائے گا۔ غیب کی باتوں کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ مگر اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں ..... "

زنیر نے اداس ہو کر گردن جھکا لی۔ تو زارا بولی۔

"نیرو۔ تمہیں میری قسم اس طرح منہ نہ لٹکاؤ ..... دیکھو جلدی فیصلہ کرو۔ ورنہ تمہاری ممی کہیں گی۔ میں اتنی بیدرد تھی کہ میں نے آنے نہ دیا تھا۔"

"جاؤ جا کر اپنی بکنگ کراؤ ——"

"مگر ہماری بکنگ تو اگلے مہینے کے لئے ہو چکی ہے۔"

"ان سے کہو ایمرجنسی ہے۔ وہ تمہاری تاریخ فوراً بدل دیں گے۔ میں بعد میں اسی تاریخ پر آجاؤں گی۔"

"مگر میرا دل نہیں مانتا۔"

"نیرو پلیز جاؤ نا! جلدی جاؤ۔ فون کر کے اپنی سیٹ لو۔ اور کل ہی روانہ ہو جاؤ۔ جو سامان لے جا سکتے ہو لے جاؤ۔ باقی میں لے آؤں گی، فکر نہ کرو۔"

"مگر ممی کیا کہیں گی —— ؟ میں ان سے ملے بغیر چلا گیا۔"

"بھئی ممی کو میں سنبھال لوں گی۔ ساری سچوایشن بتا دوں گی۔"

"اچھا زارا —— ایک وعدہ کرو کہ جونہی ممی ٹھیک ہوں گی۔ تم فوراً چلی آؤ گی۔"

"بھئی وعدہ کرتی ہوں۔ اسی تاریخ پر آنے کی کوشش کروں گی۔ جو تم نے میرے ٹکٹ پر درج کرائی ہے ..... "

"اچھا ..... "

"ہاں ہاں۔۔۔ جاؤ اور مجھے فون پر اپنا پروگرام بتا دینا۔"

زنیر اسے فون پر صرف اتنا بتا سکا کہ اسے کل شام کی سیٹ مل گئی ہے اور وہ ابھی ائرامریکہ سے نیویارک جا رہا ہے۔ اتنا کم وقت ہے کہ ملنے کے لئے نہیں آسکتا۔

زارا نے اسے بڑی خوش دلی سے خدا حافظ کہا ـــــ بہت سی دعائیں اس کے ڈیڈی کے لئے بھیجیں ـــــ اور دھڑکتے ہوئے اداس دل کے ساتھ فون بند کر دیا۔

پندرہ دن کے بعد جب زارا اپنے اپارٹمنٹ میں آئی تو اس کا دل بے حد بوجھل تھا۔ دروازہ کھولا تو اداسیوں کے ناگ پھن اٹھائے ڈسنے کو بڑھے ـــــ اسی کمرے میں سہاگ کی شوخ و چنچل بے شمار راتیں بسر ہوئی تھیں۔ اور یہیں اس نے محبت کے سارے مرحلے طے کئے تھے۔ اسے زنیر کا والہانہ پن بے اختیار یاد آنے لگا۔۔۔ اس کی باتیں ـــــ اس کی چاہت ـــــ کتنی دیر تو وہ ساکت کھڑی رہی ـــــ پھر آگے بڑھ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئی ـــــ بیٹھے بیٹھے کافی دیر گزر گئی تو اٹھ کر کمرہ صاف کرنا شروع کیا۔ بہرحال کچھ وقت تو یہاں گزارنا ہی تھا۔ اور ایسے میں فیروزہ بھی پاس پڑوس میں نہیں تھی۔ آجکل عبدالکریم کے ساتھ سوئٹزرلینڈ چھٹیاں گزارنے گئی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

زارا نے الماری کھولی تو دنگ رہ گئی۔ وہاں زنیر کا کوئی کپڑا نہیں لٹک رہا تھا۔ یا الماری زنیر کے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی اور جلدی میں ان سب کو لے جانا خاصا مشکل تھا۔ پھر اس نے ادھر اُدھر دیکھا ـــــ تو اُسے پتہ چلا ـــــ زنیر تقریباً اپنا سب سامان لے گیا تھا۔ بس دو چار میلے کپڑے اور جوتے رہ گئے تھے۔ حتیٰ کہ جو تحائف گاہے بہ گاہے زارا خرید کر اس سوٹ کیس میں چھپاتی رہی تھی وہ سوٹ کیس سمیت لے گیا تھا" ـــــ اچھا ـــــ" زارا نے سوچا ـــــ ممکن ہے۔ اس نے سوچا ہو کہ میں اکیلی اتنا لمبا سفر کروں گی۔ اس لئے وہ سب سامان پہلے لے گیا۔ اسے معلوم تو ہے کہ جاتے وقت مجھے اور بھی شاپنگ کرنا تھی۔ بیچارا میری تنہائی کے خیال سے زیادہ سے زیادہ سامان لے گیا ہوگا ـــــ مگر ـــــ یہ سارا سامان

ایک دن میں تو پیک ہو نہیں سکتا۔ جاتے ہوئے زارا نے زنیر سے کہا تھا۔

"جان! جاتے ہی مجھے فون ضرور کرنا۔ اور ڈیڈی کے بارے میں سب بتلانا" اور اُس نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔

مگر فون ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے۔ اس کے ڈیڈی فوت ہو گئے ہوں اور غریب کو فرصت نہ ملی ہو۔ لیکن اگر وہ خط لکھتا تو پندرہ دنوں میں ضرور مل سکتا تھا۔

ممکن ہے آج کل میں اس کا فون آئے تو وہ ساری باتیں تفصیل کے ساتھ اس کو بتا دے گی۔ اسے کیا معلوم کو نسا تحفہ کس کو دینا ہے؟ اگر سنبھال کر رکھے تو زیادہ اچھا ہے۔

زارا کے سر میں درد ہونے لگا۔ تو اس نے اُٹھ کر چولہا جلایا اور ایک پیالی کافی کی بنائی۔ . . . . ساتھ میں دو تین بسکٹ پکڑے ـــــ اور آخر بستر میں بیٹھ گئی۔ کمبل ٹانگوں پر ڈال کر پچھلی باتیں یاد کرنے لگی ـــــ زنیر کا آنا ـــــ اس کے ساتھ یادگار صحبتیں ـــــ اور پھر شادی کے مناظر ـــــ ایک سال میں کتنی تبدیلیاں آ گئی تھیں زندگی میں ـــــ اس کا دِل ڈوبنے سا لگا ـــــ کافی پی کر اس نے پیالی تپائی پر رکھ دی ـــــ اور تکیہ سر کا کر سونے لگی۔ اس کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی۔ جب اس کا دل اداس ہوتا تو وہ سو جایا کرتی تھی۔

جونہی اس نے تکیہ اٹھا کر اسے دوبارہ رکھنا چاہا۔ اس کے نیچے ایک بڑا لفافہ نظر آیا۔ بیتابی سے اٹھا کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا۔

"زارا"

اوہ ـــــ زارا نے وہ لفافہ سینے سے لگا لیا۔ شاید جاتے جاتے زنیر ایک محبت بھرا خط لکھ کر اس کے تکیے کے نیچے رکھ گیا تھا۔ تاکہ وہ اداسیوں کے ٹھنڈے اندھیروں میں اترنے سے بچ جاتے ـــــ

لفافہ کافی وزنی تھا۔

وہ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ذرا خط پڑھ کر مزہ لینا چاہتی تھی۔ لفافہ چاک کیا تو ایک چھوٹا پرزہ پہلے باہر آ گیا ـــــ

"زارا ـــــ"

"لفظ معافی بہت چھوٹا اور لایعنی سا ہے' اس لئے میں تم سے معافی مانگتے ہوئے شرما رہا ہوں۔ مگر بالآخر اسی لفظ معافی کا ہی مجھے سہارا لینا پڑے گا۔ شروع سے بتاتا ہوں جب میں امریکہ آ رہا تھا تو دوستوں نے مجھے غلط قسم کی ہدایات دی تھیں۔ میں بھی یہی سمجھنے لگ گیا کہ امریکہ میں لوگ صرف عیاشی کرنے کے لئے جاتے ہیں۔

سوئے اتفاق مجھے تم مل گئیں۔ خدا کی قسم تمہیں پھنسانے کا میرا پہلے پہل ارادہ نہ تھا مگر جب تم اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ میرے قریب آتی چلی گئیں۔ تو مجھے اس کھیل میں مزہ آنے لگا۔ میں شاید یہ کھیل رچا کر چھوڑ دیتا۔ مگر تم تو بالکل مشرقی لڑکی ثابت ہوئیں۔ شادی کے بغیر تم نے میرے قریب آنے سے انکار کر دیا۔ تم مرد کی فطرت کو نہیں جانتی ہو۔ اپنے نفس کے آگے وہ کسی کی زندگی کی پرواہ نہیں کرتا۔ امریکہ میں تمہارے جیسی لڑکی کا مل جانا۔ ایک اتنا خوبصورت حادثہ تھا کہ میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس لئے شادی پر آمادہ ہو گیا۔ مگر میں نے دانستہ تمہیں بچے کے جھنجھٹ میں نہیں ڈالا۔ تم میرا یہ احسان مانو گی۔ جتنا اچھا اور خوبصورت وقت میں نے تمہارے ساتھ گزارا ہے۔ شاید کسی امریکی لڑکی کے ساتھ نہ گزار سکتا۔ مگر افسوس تم نے مجھ پر بے اندازہ بھروسہ کر کے ٹھوکر کھائی۔ میں تمہیں نہ بتا سکا کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ میرے چار بچے ہیں۔ تین لڑکیاں ہیں اور ایک لڑکا جو میرے جانے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ میرے والدین نے جاتے وقت مجھ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ اگر میں نے وہاں شادی کر لی تو وہ مجھے عاق کر دیں گے۔

میں نے یہاں پر اپنی شادی کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی اور خوش قسمتی سے یہ خبر یہاں پہنچی بھی نہیں۔ میں کئی دنوں سے تم سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا۔ تمہاری ممی نے بیمار ہو کر یہ موقع فراہم کر دیا۔

میرے ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک بالکل نہیں ہوا۔ میں موقع سے فائدہ اٹھا کر جا رہا ہوں اور دیکھو میری اس کمینگی کو معاف کر دینا۔ میں اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میری تین لڑکیاں ہیں اور ان کی زندگی برباد ہو جائے گی۔

تم امریکہ میں رہتی ہو۔ ان ملکوں میں طلاق کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تو لڑکیاں تفریحاً یا

مزید تجربوں کی خاطر شوہر بدل لیتی ہیں۔ تم بھی اس شادی کو ایک حسین تجربہ سمجھ کے بھول جانا۔
اس لفافہ میں طلاق نامہ بھی بند ہے۔ اور مہر کے نام پر ایک چیک بھی۔ اور ہاں آئندہ کسی پردیسی پر اتنی جلدی اعتماد نہ کرنا۔

گنہ گار

زنیرا احمد صدیقی

زارا نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اور قطار اندر قطار نیرا اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ تو میرے — ہموطن۔ میرے ہم مذہب زنیرا احمد صدیقی تو نے مجھے عرش سے فرش پر پھینکا۔
مجھے داغ تنہا دیا — میری کوری زندگی پر سیاہی پھینکی۔
آرزوؤں کے لق و دق میدان میں آبلہ پا چھوڑ دیا۔
اس لئے کہ تمہاری تین بیٹیاں ہیں۔ اور تمہیں ان کے مستقبل کی فکر ہے۔ اس لئے تم نے کسی کی بیٹی کی زندگی برباد کر دی —
اس لئے کہ پھولوں بھری ایک روش پر — تمہیں چند قدم کا ساتھ چاہیئے تھا۔
تو زنیرا احمد صدیقی!
اس امریکہ میں ایسی لڑکیاں مل جاتی ہیں۔ جو ایک رات، ایک ہفتہ، ایک مہینہ یا ایک سال کا سودا کر لیتی ہیں۔
یہاں اب شادی کے بغیر رہنا ایک فیشن بن گیا ہے —
یہاں آدم و حوا کے کسی بھی روپ کو کوئی نہیں پہچانتا۔
مَیں تو مانگ میں — سہاگ کی افشاں — جنم سے مرن تک سجانا چاہتی تھی۔
صدیوں کی پاگل ہوں مَیں — قرنوں تک دیوانی رہوں گی!
ساری تاریخ، میری دیوانگیوں سے بھری ہوتی ہے۔ کب سے منتظر تھی — راہ دیکھ رہی تھی — دل میرا کوہِ نور ہیرا تھا — تالوں میں چھپا کے رکھا تھا — زنجیروں کے اندر —
قیمتی چیزیں چوری کیوں ہو جاتی ہیں — گزرے دنوں کی تھکن جاتی کیوں نہیں — غم ناپسندیدہ مہمان بنکر دل میں کیوں ٹھہر جاتا ہے؟ پہلی بھول پھانس کیوں بن جاتی ہے۔ ساری دنیا مجھے

سمجھاتی ہے — میں اپنی بیوقوفیوں پر کافی رو چکی ہوں۔ میری پرورش امریکہ میں ہوتی ہے —
مجھے ہر غم بیچ دینا چاہیئے تھا۔
مگر.... مگر.... یہ میری مٹی.... میری خاک بھی میرے اندر سے نکلے نا!۔
جی بہت اداس ہے۔
جی کا کیا ہے یہ تو وہ ننھا بچہ ہے۔ جو کھلونا توڑ کر مچلتا ہی رہتا ہے۔ دل کے آس پاس درد بھی رہتا ہے — یہ درد تو چاند کا ہالہ ہے — ہالے کے بغیر تم نے کوئی چاند دیکھا ہے!۔
ایک بار تم نے یہ چاند کھیلنے کو مانگا تھا —
میں نے تو دے دیا تھا —!

آخری بار،
میرے یار ——
سر جھکا کر تیرے قدموں پہ میں اک پیار کروں،
اشک چھالا تیرے ہونٹوں پہ رکھوں ——
یہ چمن سانسوں کا تجھ پر واروں ——
آنکھ میں رکھ کے تجھے،
آنکھ کو بند کروں،
الوداع کہہ کے .....
تجھے .... تجھ سے جدا، لے جاؤں ؟

"قفل"

باسمہ آج پھر اسے نظر آگئی تھی۔ یوں موٹر چلاتی ہوئی سڑک کے سینے کو روندتی ہی تھی جیسے کوئی بطخ پانی کے سینے پہ رواں ہو۔ امان جب کبھی اسے موٹر میں جاتا ہوا دیکھ لیتا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے باسمہ سر پہ تاجِ شاہانہ سجائے ـــــ اسی وقار اور خود اعتمادی سے چلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ جو اس کی فطرت کا خاصہ تھا۔

امان اس وقت ایک جنرل سٹور کے باہر اپنے ایک دوست سے گپ لگا رہا تھا۔ باسمہ خوب بنی ٹھنی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی تو اس کے دل میں سرخ سرخ آندھیاں سی اٹھنے لگیں۔

دنیا اتنی بڑی جگہ نہیں ہے۔ اس نے سوچا ـــــ مگر جب آدمی ایک شہر میں رہتا ہو اور جُدا ہوتے زیادہ سال بھی نہ گزرے ہوں تو ایک دوسرے کا سامنا ہو جانا کچھ ایسی تعجب انگیز بات بھی نہیں ہے۔

پہلے بھی کئی بار بازار میں آتے جاتے ہوئے اس نے باسمہ کو یونہی تیز تیز انداز میں موٹر چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور ہر بار ـــــ ایک دل جلا دینے والی گالی، زیرِ لب فضا میں پھینکی تھی ـــــ حرافہ ـــــ کمینی ـــــ بے حیا! اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے غصّے پہ قابو پا کے سوچتا ـــــ اس نے باسمہ کو گالی کیوں دی تھی ـــــ؟

جب کوئی مرد کسی عورت کو طلاق دے دیتا ہے، تو اتنی مکروہ گالی اس کی پیشانی پر لکھ دیتا ہے جسے کوئی مقدس پانی بھی نہیں دھو سکتا۔

اب مزید گالیوں کی گنجائش کہاں تھی؟

اس نے ہلچل کرتے جذبات کو قابو میں لانے کے لئے سگریٹ سُلگا لیا۔ وہی سگریٹ جس کا کوٹہ باسمہ نے مقرر کر رکھا تھا ـــــ ایک دن میں صرف تین ـــــ اور اب دن میں تیس چالیس سگریٹ پی کر دل کو چین نہیں آتا تھا ـــــ اور اسے دیکھو، شوکیس کی گڑیا بنی پھرتی ہے۔ ہاں نئی نئی شادی جو رچائی ہے۔ خوش ہے۔ مسرور ہے ـــــ اور مجھے کہتی تھی "جس دن تمہارے علاوہ مجھے کسی اور مرد نے ..... چھو لیا تو میری موت واقع ہو جائے گی"۔

"حرامزادی۔ بکتی تھی"۔ اس نے پھر اپنی سانس کی پھنکار کے ساتھ فضا میں زہریلے میزائل کی مانند ایک گالی چھوڑی، جیسے وہ سیدھی باسمہ کے کلیجے میں جا کے اُترے گی۔ اب وہ سب کچھ اپنے نئے شوہر سے کہتی ہوگی ـــــ اب اپنی ادائیں اس پر نثار کرتی ہوگی ـــــ سب بکواس کرتی ہیں یہ عورتیں۔

"یار! تم نے بھی تو وہ سب اپنی نئی بیوی سے کہا ہے ـــــ ذرا اپنا دل بھی تو ٹٹولو ـــــ کیا محبت کا کھیل تم نے دوبارہ نہیں رچایا ـــــ اور اسکی سیج تلے چاپا۔ ہرجائی تم ہو کہ باسمہ ہے ـــــ؟"

ہاں اس نے دھیرے سے کش چھوڑا ـــــ باسمہ تو ایسی عورت ہے کہ اس سے کوئی بھی مرد بے اختیار پیار کر سکتا ہے۔ اس کو اللہ تعالےٰ نے جانے کیسی سٹی سے گوندھا ہے کہ وہ ہمیشہ مہک دیتی رہے گی ..... ذرا دیکھو نا یوں جا رہی تھی جیسے صدیوں اس پر نثار ہوتے ہوئے گزر رہے ہوں .....

خوب بن ٹھن کر رہنے لگی ہے۔ بال بھی کٹوا لئے ہیں ـــــ کتنی مسرور نظر آ رہی تھی ـــــ شاید اس کا نیا شوہر ہر وقت اسے میک اَپ میں دیکھنا پسند کرتا ہوگا۔

امان کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اور باسمہ کو چھونے کے تصوّر سے ہی اس

کے تن بدن میں ہزارہا قمقمے جل اُٹھے۔ باسمہ جادو کی ایسی پٹاری تھی۔ جس کے کھلتے ہی ہوش اڑ جاتے ہیں۔ جانے ہوش اڑانے کی ادا قدرت نے اُسے بخشی تھی۔ یا اس نے زمانے سے سیکھی تھی۔ مگر وہ عقل و خرد کے سارے ٹھکانے پھونک کر اس کے آنگن میں آتی تھی۔ بی اماں کو تو وہ بالکل پسند نہیں آتی تھی۔ اور کوئی عیب نہیں تھا اس میں۔ بی اماں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی اپنی بھانجی رشیدہ سے کرنا چاہتی تھی۔ اکلوتا بیٹا جسے وہ امان اللہ کہتی تھیں اور اُسے اللہ کی امان میں دے رکھا تھا۔

اس پر یکایک باسمہ نے اپنی مسکراہٹوں کا طلسم چھڑک دیا تو بی اماں کو باسمہ ڈائن کی مانند نظر آنے لگی... جو ہنستے بستے گھروں پر امربیل بن کر چمٹ جاتی ہے.....

یوں وہ بہو بن کر آئی تو انہوں نے گردن ڈال دی۔ بیٹا اکلوتا ہو ـــــ ماں کی آنکھ کا تارا ہو ـــــ تو اسے من مانی اور خودسری کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ گھر کا اُوپر والا حصّہ بی اماں نے بہو اور بیٹے کو دے دیا تھا۔ ادھر دو کمرے، ایک غسل خانہ، ایک باورچی خانہ اور ایک دالان تھا۔ دو تین سال بی اماں بہو کے ہاتھ کا پکا کھاتی رہیں۔ پھر یکایک انہیں بہو کے ہاتھ میں کیڑے نظر آنے لگے۔ کیوں نظر نہ آتے ـــــ تین سال ہو گئے تھے اور بہو کی کوکھ بنجر تھی۔

"یہ عشق کی ماری لڑکیاں، پتہ نہیں کیا کیا کرتی ہیں کمبختیں کہ ان کی گود ہری نہیں ہوتی۔ ایسی صورت کو چاٹا کرے کوئی عورت کا حسن تو بچے سے ہے۔ جس عورت کی گود میں بچہ نہیں اس سے بدصورت کون عورت ہوگی ـــــ؟"

"اے یہ من مانیاں کر کے بزرگوں کا دل تو پہلے ہی توڑ دیتی ہیں، انہیں دعا کون دے؟"

یہ تو باسمہ بھی سوچا کرتی تھی کہ دُعا لینے کس کے پاس جاتے ـــــ؟ اے کاش دُعائیں بازاروں میں بکتی ہوتیں تو وہ سارے زیور بیچ کر انہیں خرید لاتی .....

ویسے تو ہر جتن کیا تھا اُس نے ـــــ محبت کی شادی میں ایک دھڑکا ہمیشہ جی کو لگا رہتا ہے۔ ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ اس نے لیڈی ڈاکٹروں کے ہاں چکر

لگانے شروع کر دیتے۔ دوائیاں، انجکشن، چھوٹی موٹی صفائیاں۔۔۔۔ سب کچھ ساس سے بالا بالا کروا لیا ـــــ اور تو اور ـــــ کئی رازدار سہیلیوں کی معرفت تعویذ بھی منگوائے تھے۔۔۔۔ مگر دعا کا مقفل دروازہ کھلتا ہی نہ تھا۔ یوں بھی اس کے سر پہ ماں نہ تھی۔ ایک باپ تھا، وہ بھی سدا کا اپاہج، برسوں سے چارپائی پہ پڑا تھا۔ امان گو گھر میں لاڈلا تھا۔ مگر پانچ سال مسلسل اس نے باسمہ کے سڑکوں پر یوں ناز اٹھائے تھے کہ وہ بیمار باپ کو چھوڑ کر اس کے گھر آ گئی تھی۔

آپا جی سے کئی بار اشاروں کنایوں میں دُعا کرنے کے لئے اس نے کہا ـــــ مگر پتہ نہیں، باپ سے کیوں اس طرح بات نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ماں سے ہو سکتی ہے۔

پانچ سال ایک بنجر ڈگر پہ ہانپتے کانپتے ـــــ بالآخر اس نے صبر کرنے کی ٹھان لی۔۔۔۔ کیونکہ اس دنیا میں زندہ رہنے کی دو ہی اصول ہیں۔۔۔۔ صبر یا جبر۔۔۔۔

پر اب تو بی اماں بھی واشگاف الفاظ میں اسے کوسنے دیا کرتیں اور ہر آتے گئے کے آگے اپنے اکلوتے بیٹے کی نسل بندی کا ماتم کیا کرتیں۔

ان روز روز کی لڑائیوں میں ساس بہو کا کھانا الگ ہو گیا۔

باسمہ اس میں بھی خوش تھی۔

وہ ادھر یوں پڑی رہتی جیسے کسی اچھوت کو رکھا جاتا ہے۔ روٹی پانی الگ ـــــ برتن الگ۔

ویسے بھی اسے سہیلیاں بنانے اور گھومنے پھرنے کا زیادہ شوق نہیں تھا بس شام کو امان کے ساتھ ہی کہیں چلی جاتی۔ ورنہ گھر میں پڑی رہتی۔

اس طرح ساس بہو کا زیادہ آمنا سامنا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی اگر کسی عزیز کے آ جانے پر وہ نیچے جاتی یا بی اماں گھڑی بھر کو اُوپر آ جاتیں تو وہ اپنا روائتی ادب و احترام برقرار رکھتی ـــــ جی۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ کرتی رہتی۔۔۔۔۔

اور ان کی کڑوی کسیلی ہنس ہنس کے پیتی رہتی۔

دل میں بھی غصہ نہیں کرتی تھی۔

جو بات قدرت کے اختیار میں ہو اس پر ناحق جان جلانا ـــــ حماقت ہے ایک دن اگر انسان یہ سوچ لے کہ وہ تو محض بساط کا مہرہ ہے ـــــ چلانے والا کوئی اور ہے ـــــ تو شہ اور مات کے چکر سے ہی نکل جاتا ہے۔ ہاں اس کی زندگی تب عذاب بنتی جب اسے امان سے کوئی شکوہ ہوتا۔ اس گھر میں آتے ہی اس نے سب سے پہلے امان کو پہچانا تھا۔

ماں کا ایک ہی بیٹا ہو۔ اور نازوں سے پلا ہو ـــــ تو وہ زندگی بھر بگڑا ہی رہتا ہے۔۔۔۔ بگڑے ہوئے بچے کو سدا ماں کی آغوش ہی اچھی لگتی ہے ـــــ اگر ماں کی گود سے نکلتے ہی اسے صحیح عورت نہ ملے ـــــ تو پھر وہ طوائف کی گود میں پناہ لیتا ہے ـــــ کہ طوائف ایک کھلی دکان ہے ـــــ وہاں کچھ نہیں ہوتا۔

ایک پہچان ہوتی ہے ـــــ گاہک کی پہچان ـــــ مرد کی پہچان ـــــ روٹھے ہوئے بگڑے ہوئے بچے کی پہچان ـــــ اپنے گاہک کو طلب گار بنانے کے لئے وہ گھڑی گھڑی روپ بدلتی ہے اور اسے لبھاتی ہے۔۔۔۔ یوں اس سے سارے رشتے ناطے چھڑا دیتی ہے۔

جانے باسمہ کو یہ سب کس نے بتایا تھا۔۔۔۔ پر یہ سب اس کے لاشعور میں تھا۔ اور اسے امان کو لبھانے کے سارے گُر آ گئے تھے ـــــ اس لئے اس نے ساری دُنیا سے منہ موڑ کر صرف امان سے لَو لگا لی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اپاہج باپ کو بھی بھُول گئی تھی ـــــ وہ ایک نامکمل عورت تھی ـــــ بچے کی طرف سے جو کمی تھی وہ اپنی سعادت مندی، انکساری اور خدمت گزاری سے پوری کرنا تھی۔ جس عورت کی گود خالی ہو وہ تو اپنے مرد سے اونچی آواز میں بول بھی نہیں سکتی ـــــ باسمہ جھکتے جھکتے امان کے تلوؤں تک پہنچ گئی تھی۔ مگر خوب صورتی کی ادا کو اس نے برقرار رکھا تھا۔ یوں مسلسل اس کے نخرے اٹھائے جا رہی تھی۔ جیسے وہ اس

کا اکلوتا بچہ ہو۔ بیوی کی گود میں جب ماں کی شفقت بھی سما جاتی ہے تو عورت پورے کا پورا مرد جیت لیتی ہے۔ یوں امان کو اپنی ہتھیلی کا چھالا بنا کر اس نے ایک ماں سے اس کا بیٹا کلیتہً چھین لیا تھا۔ اس لئے بی اماں کی جلی کٹی کا بُرا نہیں مانتی تھی۔ آخر اماں اس کو نہ کوستیں تو کس کو کوستیں ـــــ ؟

اور اماں بی تو اُدھار رکھنے کی قائل نہ تھیں۔ جونہی امان گھر میں داخل ہوتا۔ ذرا سی دیر اماں بی کے پاس رک کر ان کا حال دریافت کرتا۔ اور پھر سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھاتا۔ اماں بی اپنی محرومیوں کی مالا پرونے لگتیں ـــــ ان کی زبان کی نوک دار سوئی کبھی تو امان کے احساسات کو زخمی کرتی اور کبھی باسمہ کے کلیجہ کے آر پار ہو جاتی۔ اُدھر جھروکے میں کھڑی باسمہ ـــــ کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ مگر پھر وہ مصلحت کے بُرش سے اپنی پیشانی کی ساری شکنیں صاف کر لیتی ـــــ اُسے ہر حال میں امان کا سواگت پھولوں اور کلیوں کی صورت میں کرنا ہوتا۔ اسے معلوم تھا وہ جس قدر اپنی محبت کا کنواں گہرا کرتی جائے گی ـــــ اتنا ہی امان اس کے اندر اترتا چلا جائے گا۔ محبتوں کو نت نئی ادا عطا کرنے سے ـــــ عشق مضبوط ہوتا ہے۔

شوہر کو عاشق بنانا ہو تو بوٹی بوٹی اس کے قدموں تلے بچھا دیتے ہیں۔

اور اس کی باہنوں میں پہنچ کر امان سوچا کرتا . . . .

پتہ نہیں باسمہ کیا ہے ـــــ ؟ کس مٹی سے بنی ہے ؟

کئی بار اس نے باسمہ کو الفاظ میں مجسم کرنا چاہا . . . . مگر اس کے پیکر کے سامنے الفاظ کے پیرہن اتر گئے . . . . وہ پہلے دن کی طرح آج بھی شاداب تھی بھرپور تھی۔ مسرور تھی۔ کھلی پڑتی تھی ـــــ مگر مرجھائی نہ تھی ـــــ مرجھائی ہوئی عورت سے مرد نفرت کرتا ہے ـــــ مرد کو گلاب کی طرح تر و تازہ عورت بھاتی ہے ـــــ ٹوٹی ہوئی، مسلی ہوئی . . . شاخ سے گری ہوئی . . . بیمار بیمار عورت مرد کو اچھی نہیں لگتی۔

پتہ نہیں باسمہ کون سا آب حیات پیتی تھی۔ ابھی تک ویسی ہی تھی۔

اسے نہ تو زندگی سے گلہ تھا نہ زندگی کی محرومیوں سے۔ اس کی آنکھوں میں امان ہی امان تھا۔ اور جیسے اسے امان کا نشہ دو آتشہ کئے دے رہا تھا۔

اس روز جمعرات تھی۔ اور امان کو دفتر میں دیر ہو گئی تھی وہ باہر نکلا تو سڑک پر اندھیرا اور موٹروں کی بتیاں ایک ساتھ اتر آئی تھیں۔ وہ باسمہ کے بارے میں سوچنے لگا جمعرات کی شام باسمہ اس کا عجیب انداز میں سواگت کرتی تھی۔ باسمہ کا یہ انداز امان کو بڑا اچھا لگتا تھا۔ اور اس انداز پر وہ ساری رات فدا ہونے کو تیار تھا۔

اور پھر اگلے دن جمعہ ہوتا۔ وہ دیر سے اٹھتے ـــــ سارا دن اور سارے لمحے اپنے ہوتے . . . .

وہ بستر پر پڑا پڑا حکم چلایا کرتا اور باسمہ زر خرید لونڈی بنی اُدھر ادھر بھاگ کر اس کا حکم بجا لاتی۔ اگر اس روز اس کا کوئی قریبی دوست آ جاتا تو وہ اسے بھی وہیں اپنے بیڈ روم میں بلا لیتا۔ پورا جمعہ اس طرح گزرتا کہ وہ اگلے سارے ہفتے کے لئے تازہ دم ہو جاتا ـــــ اور یہی چھٹی کا مقصد بھی ہوتا ہے۔

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اسے جمعرات کو ہی دفتر میں دیر ہو جاتی تھی۔ شاید وہ سارا ہفتہ سُستی کر کے اپنا کام ادھورا چھوڑ جاتا تھا۔ جسے جمعرات کو ہر صورت میں مکمل کر کے جانا ضروری ہوتا تھا۔ آج بھی وہ کام ختم کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔ موٹر میں بیٹھتے ہی اس نے سگریٹ سلگایا ـــــ ایک کش لگا کے دھواں چھوڑا ـــــ دھواں اس کے چہرے کے آگے پھیل گیا اور یک بیک اسے باسمہ کی خوشبو آنے لگی۔ تھکاوٹ میں اسے باسمہ کی اشد ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس کی انگلیوں کے پوروں میں شاید طلسماتی عناصر لگے ہوئے تھے کہ دھیرے دھیرے مدہوش کر دیتی تھی۔

رات ـــــ کلیاں ـــــ اور چاندنی۔

بس یہی باسمہ کی تعریف تھی مختصر مختصر۔

وہ زیرِ لب مسکرایا۔

باسمہ رات تھی۔

پُر اسرار رات . . . . پُر فریب نشہ آور . . . . اور مستی سے بھری ہوئی۔

آدمی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے رات کے جادو سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

بالآخر اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

کلیاں . . . . .

کلیاں منہ بند ہوں تو بھی خوبصورت لگتی ہیں۔ کھلتی ہیں تو اور دلکش ہوتی جاتی ہیں۔ ان کلیوں کے کیا کہنے ہیں جو ایک درمیانی اسٹیج پر آ کر رُک جاتی ہیں۔ تھوڑا سا کھل کر یوں ساکت ہو جاتی ہیں۔ جیسے کسی حسینہ نے ہنستے ہی دوپٹے کا آنچل دانتوں میں دبا لیا ہو۔ باسمہ اسی درمیانی اسٹیج پر آ کر رُک گئی تھی۔

نہ جانے امان کو ہمیشہ یوں کیوں لگتا تھا کہ باسمہ پوری طرح کھلی نہیں ہے۔ نہ وہ کلی ہے ـــــ نہ پھول ہے۔ درمیان میں کھڑی کھڑی آفت بن گئی ہے۔ اور اس پر سے سات آٹھ سال گزر گئے تھے . . . . کلیوں کی طرح دھیرے دھیرے مہکتی رہتی ـــــ پھولوں کی طرح خوش رنگ نظر آتی رہتی ـــــ حالانکہ اب تک اسے پتی پتی ہو کر بکھر جانا تھا۔ بلکہ ان پتیوں کو بھی ـــــ پلنگ کی پائنتی تلے پامال شدہ راکھ میں مِل جانا چاہیئے تھا ـــــ آخر عورت کو خاک ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

چاندنی ـــــ !

ایک کشادہ مسکراہٹ امان کے لبوں پر پھیل گئی۔

باسمہ کو دیکھ کر بے اختیار چاندنی کا خیال آتا تھا۔ جہاں باسمہ ہوتی وہاں چاند ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا . . . . جانے اس کے اِرد گرد اتنا اُجالا کیوں ہوتا ـــــ؟ اس کی ذات کا اُجالا تھا ـــــ یا اُس کی محبت کی روشنی۔ امان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس مثال کو کس طرح واضح کرے؟ اور کیوں وہ باسمہ کو چاندنی سے

ہم آہنگ کر رہا ہے ـــــ

مگر وہ جانتا تھا ـــــ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے۔ اندھیرے اُجالے میں جو عورت ایک جیسی محسوس ہو، اسے چاندنی تو کہا جا سکتا ہے نا؟ فرق صرف یہ ہے کہ آپ چاندنی کو چھو کر نہیں دیکھ سکتے مگر اس عورت کو رگِ جاں کے قریب محسوس کر سکتے ہیں۔

جو بھی ہے۔

امان نے سگریٹ کا آخری ٹکڑا شیشہ کھول کر پھینکا اور سوچا۔

زہر ہے ـــــ الکوحل ہے ـــــ چرس ہے ـــــ

نشے کی طرح لگ گئی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کوئی شوہر اپنی بیوی کے بارے میں ایسا سوچے۔ اور وہ بھی شادی کے آٹھ سال بعد ـــــ

جبکہ اس نے بچّے کی صورت تک نہیں دیکھی۔

موٹر گھر کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ اس نے اسے گیراج میں بند کیا۔ وہ جانتا تھا۔ باسمہ نے اس کے اُوپر آنے کا حساب رکھا ہوتا ہے۔ پچھلے موڑ سے جب وہ ہارن دینے لگتا ہے تو وہ اندازوں سے کھیلنے لگتی ہے۔

اب وہاں ہوں گے ـــــ اب یہاں ہوں گے ـــــ اب گیٹ کے اندر آئے ہوں گے ـــــ اب موٹر گیراج میں بند کر کے اُوپر آ رہے ہوں گے۔

اور اسی حساب سے وہ ہمیشہ پہلی سیڑھی پر مِل جایا کرتی۔ اماں بی کو چاند چکور کا یہ مِلاپ پسند نہیں تھا، اس لئے وہ کئی بار حائل ہو جاتیں اور جتنی دیر بھی ممکن ہو سکتا۔ امان کو اوپر جانے سے روکے رکھتیں۔ وہ اگر اُٹھ کر چل دیتا ـــــ تو اماں بی پیچھے پیچھے لپکتی جاتیں . . . . پھر وہ پہلی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ کے خود ہی رُک جاتا۔ مبادا اماں بی اُوپر تک چلی آئیں اور ان ریشمی بانہوں کے حلقے کا ہار بننے سے پہلے محل کے اندر چلی آئیں۔

"آج تو بڑی دیر لگا دی بیٹا؟"

اماں بی ہر روز ذرا سی سوال سے ابتدا کرتی تھیں۔ یہی سوال اگر اس کی بیوی پوچھتی تو وہ اسے پھاڑ کھاتا۔

مگر اماں بی کو ہر روز بڑے سکون سے ایک ہی جیسا جواب مل جاتا۔

"بس اماں بی، آج دفتر میں کام کچھ زیادہ تھا۔"

حالانکہ جب دیر نہیں ہوتی تھی، تب بھی اماں بی یہی سوال کرتیں ـــــ چند لایعنی سوالوں کے جواب دے کر وہ اُوپر کو بھاگتا ـــــ بے تابی اس کے ہر قدم سے ظاہر ہوتی۔

باسمہ جانتی تھی جب ماں بیوی بن کر ناموزوں سوالات کر رہی ہو تو اس وقت بیوی کو سرتاپا ماں بن جانا چاہیئے ـــــ یوں آغوش وا کرنی چاہیئے، جیسے کہہ رہی ہو۔

"تم آ گئے ہو۔ تو قرار آ گیا ہے ـــــ بہار آ گئی ہے۔"

بس اس کے سواگت کی ہر ادا میں یہی فقرہ رچا ہوتا ـــــ اسی لئے تو وہ اُوپر جانے کے لئے بے قرار نظر آتا۔ اور بی اماں اس کے اس انداز پر دلفگار رہتیں ـــــ ان کا خیال تھا بہو نے ان کے لعل پر ٹونے ٹوٹکے پھونک دیئے ہیں۔

آج بھی جب وہ جلدی جلدی سیڑھیوں کا صحرا پار کر کے اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ اماں بی درمیان میں آ گئیں ـــــ بے موقع ہی بولیں۔

"کیسا اُداس اُداس اور دُکھی لگ رہا ہے ـــــ تیری اُجاڑ زندگی نے مجھے ردگی بنا دیا ہے۔"

"کیوں اماں بی ـــــ خدانخواستہ میری زندگی کو کیا ہوا ہے ـــــ؟"

امان نے ہنس کر کہا۔ "میں تو بہت مطمئن اور خوش و خرم رہتا ہوں۔"

"خاک ـــــ ذرا اپنا چہرہ دیکھو ـــــ محرومیاں، بن بھروکوں کے چھانک رہی ہیں۔"

"ہائے بچے کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔ نو سال میں تو ایک مُرجھایا ہوا درخت

بن گیا ہے۔ بچوں سے زندگی میں ہر روز بہار آتی ہے۔"

"اماں بی ـــــ" امان زور سے ہنسنے لگا۔ جیسے ماں کا مذاق اُڑا رہا ہو۔

"دُنیا میں ہزاروں لوگ ہیں۔ جن کے بچے نہیں ہیں۔ تو کیا وہ زندہ نہیں ہیں۔؟"

"مگر بیٹا، تجھ میں اور ان میں بہت فرق ہے ـــــ تو نے تو اپنے آپ کو خود زندہ درگور کر لیا ہے۔"

"کیوں اماں بی ـــــ کیسے بھلا؟"

"ایک بانجھ عورت کے ساتھ نباہ کرنا، زندہ درگور ہونا ہے ـــــ اے لاش کے پاس کتنے ہی تر و تازہ پھول رکھ دو۔ مُرجھا جاتے ہیں۔ مرجاتے ہیں۔"

"اماں!..... اماں بی...." امان کے لہجے میں تناؤ تھا۔ "یہ سب اللہ کے فیصلے ہیں۔ اس کے کاموں میں دخل اندازی اسے پسند نہیں..... اور مجھے تو ذرا بھی ملال نہیں۔"

"اے ملال کیوں نہیں ـــــ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔"

امان چپ کر کے اوپر چڑھنے لگا۔ اب کچھ کہنا فضول تھا۔ وہ خوشی کا مزید اظہار کر کے ایک اور مصیبت مول نہیں لینا چاہتا تھا ـــــ غنیمت کہ اس کی ماں اسے دکھی سمجھ رہی تھی۔

"تو اک ذرا ـــــ اشارہ تو کر۔" وہ سیڑھیاں چڑھتے امان کو دیکھ کر بولیں۔ "اچھی سے اچھی دُلہن لے آؤں۔ دنیا میں کیا لڑکیوں کا کال پڑا ہے۔ جس پر ہاتھ رکھ دو وہی لے آؤں ـــــ اس گھر میں، میں بچوں کی آوازوں کو ترس گئی ہوں ـــــ یہ گھر نہیں مرگھٹ لگتا ہے۔"

"تو پھر اللہ سے دعا کریں اماں بی ـــــ"

امان نے تلخی سے کہا۔

"دُعا کر کر کے تو زبان گھس گئی ہے۔"

"اماں بی، دعاؤں سے زبان گھستی نہیں، مقدس اور پُرتاثیر ہوتی ہے۔ صرف

کوسنوں سے زبان گھستی ہے۔"

"ہائے مرجاؤں میں ـــــ بی اماں نے سینے پر دوہتڑ مارا ـــــ اس ڈائن نے میرا لال بدل کر رکھ دیا ہے۔ ماں سے کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے ـــــ؟"

امان پھر خجالت سے ہنسنے لگا۔

"اماں بی۔ اب آپ ان فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہ کیا کریں۔ زیادہ وقت اللہ اللہ کرنے میں گزارا کریں۔ دنیا داری اور اس کے بکھیڑوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔"

"سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتا کہ اب مجھے مرجانا چاہیئے۔ ایک کونے میں بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ میں اب جی کیوں رہی ہوں۔۔۔"

اماں بی نے روایتی انداز میں رونا شروع کر دیا۔

اس ڈرامے کا یہی کلائمکس ہونا تھا ـــــ سیڑھی کے قریب سایہ بن کے کھڑی باسمہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ اب روئے سخن اس کی طرف آنے کو تھا ـــــ جب کوسنوں کا مینہ برستا تھا تو زیادہ تر بوچھاڑ باسمہ کی سمت ہی آتی تھی۔

"اماں بی ـــــ" امان پھر رک گیا۔ نیچے اتر گیا۔ ماں کو چپ کرایا۔ پلنگ پر بٹھایا۔ اور بولا۔

"معاف کر دیں، اگر منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہو تو۔ آپ بھی تو دفتر سے آتے ہی پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ کبھی تو کوئی اور بات بھی کر لیا کریں۔"

ماں کو چپ دیکھ کر وہ پھر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ وہ روتے روتے جیسے غش کی حالت میں بولیں۔

"نہیدہ اب بھی تیرے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اگر ذرا سی ہاں کہہ دے تو۔۔۔"

"اماں بی: آپ کب سمجھیں گی کہ باسمہ کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں اس بے آسرا کو کیوں چھوڑ دوں۔ کیا خبر میری قسمت میں بچے ہی نہ ہوں۔"

"کیسی فالِ بد منہ سے نکالتا ہے ـــــ بدقسمت تو میں ہوں۔ جوانی میں بیوگی دیکھی۔۔۔ اور بڑھاپے میں اپنے بچے کی نامرادی دیکھ رہی ہوں۔"

"اچھا میں چلتا ہوں۔" بالآخر امان نے کہا۔

اماں بی اَن سنی کرتے ہوئے بولیں۔

"مجھے ڈاکٹر نے سب بتا دیا ہے ـــــ باسمہ کی گود کبھی ہری نہیں ہو سکتی۔ یہ تو پیدائشی بیراگن ہے۔۔۔ میرے بیٹے کو کھا گئی ڈائن۔"

امان تیز تیز اوپر چڑھنے لگا ـــــ اماں بی کی آواز اتنی ہی تیزی سے اس کا پیچھا کرنے لگی۔

"میں نے عصمت کو لکھ دیا ہے کہ نہیدہ کو چند دنوں کے لئے ہمارے ہاں بھیج دے۔ ہاں۔۔۔"

رات کو جب سونے کا وقت آیا۔ تو باسمہ نے اپنی معطر انگلیاں اس کے بالوں میں چلاتے ہوئے کہا۔

"تو فہمیدہ بیگم آرہی ہے اس گھر میں ——؟"

"تم اماں کی باتوں کا بُرا نہ مانا کرو۔"

"میں نو سال سے سن رہی ہوں یہ باتیں۔ کیوں بُرا مانوں گی؟ میں تو یہ کہہ رہی تھی آخر اماں کوئی نہ کوئی محاذ کھول کر ہی دم لیں گی۔

"پتہ نہیں عورتیں اتنی بدگمان کیوں ہوتی ہیں؟"

"مرد جو بے ایمان ہوتے ہیں۔"

"تُو الو کی پٹھی ہے —— تو مجھے اچھی طرح جانتی ہے!"

"جانتی ہوں ——" باسمہ ہنسنے لگی۔ اماں کے پیار کا یہی انداز تھا۔ وہ ہمیشہ اظہار محبت گالی گلوچ اور تشدد سے کیا کرتا تھا۔

"مگر اس کو نہیں جانتی جو آرہی ہے۔"

"دیکھو باسمہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ مجھے تیرے ساتھ رہتے ہوئے کبھی احساس محرومی نہیں ہوا —— بچہ دینا تو خیر خدا کے اختیار میں ہے۔ مگر، جو کچھ کوئی عورت کسی مرد کو دے سکتی ہے وہ تو مجھے دے رہی ہے اور تیرے سوا کوئی عورت بھی خوش نہیں رکھ سکتی۔"

"خیر اتنی بڑی بات نہ کہو۔۔۔ ہاں مجھے اگر کسی روز اپنی کسی بات سے یہ کہہ دو

گے کہ میں تم سے اکتا گیا ہوں، چلی جاؤ —— تو میں چلی جاؤں گی۔"

"سچ مچ —— کھاؤ میرے سر کی قسم" امان نے شرارت سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"لو اپنے سر کی قسم کھاتی ہوں۔" باسمہ نے اس کے بالوں میں سے ہاتھ نکال کر اپنے سر پر رکھا۔

"یار تو بڑی پیاری چیز ہے۔" امان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔

"اگر دنیا میں ہر شخص کو ایسی بیوی مل جاتے تو کیا ہو؟"

"یہ دنیا مردوں کی جنت بن جاتے۔"

اس پر امان بے تحاشا ہنسنے لگا۔۔۔ پھر اس کی سمت کروٹ بدل کر بولا۔

"مجھے معلوم ہے تیری جنت میری بانہوں میں ہے۔"

"اور میں جانتی ہوں میری بانہیں بڑی کمزور ہیں۔"

"اری تو کیا جانے تیری بانہیں کیسی ہیں؟ —— بتا دوں تو بانس پر چڑھ جاتے گی۔ وہ بانہیں کبھی کمزور نہیں ہوتیں جن کے حلقے میں ایک اچھا خاصا مرد بچہ بن جاتا ہے اور سارا تحفظ اسے انہی بانہوں کے آس پاس ملتا ہے۔"

"امان!" باسمہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "محبت کرنے والی عورت تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس کو کوئی دوسرا چھونے والا کبھی پیدا بھی ہو سکتا ہے۔ پھر مرد کس طرح بار بار محبت کر لیتا ہے؟"

"بے وقوف، مرد بھی بار بار محبت نہیں کر سکتا۔ صرف اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔"

"مگر دیکھو نا۔ مرد کتنی آسانی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچ لیتا ہے۔"

"کیا عورت نہیں سوچتی؟"

"نہیں —— کم از کم میرے جیسی عورت تو خیال بھی نہیں کر سکتی کہ وہ اپنا آپ کسی دوسرے مرد کے حوالے کر دیگی۔ مجھے یوں لگتا ہے۔ اگر تمہارے علاوہ کبھی کسی نے مجھے چھو لیا تو میں مر جاؤں گی۔"

"واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے تمہاری موت کس طرح واقع ہو سکتی ہے ـــــ جب کبھی مارنا مقصود ہوگا ـــــ ...."

وہ شرارت سے کہہ گیا۔

"ہاں صرف بے وفائی کرنا، کج ادائی کرنا۔ میں مر جاؤں گی۔"

"بکواس نہ کر ـــــ سستے ناول پڑھ کے فلمی ڈائیلاگ بول رہی ہے .... یہ کیا مرنا مرانا لگا رکھا ہے۔ نو سال ہو گئے۔ میرے ساتھ رہتے ہوئے اور ابھی تجھے میرا پتہ ہی نہیں چلا ـــــ؟"

پتہ نہیں ان نو سالوں نے مجھے وہ تحفظ کیوں نہ دیا ـــــ وہ دل میں سوچنے لگی، جس سے میرے دل کی فصیل مضبوط ہو جاتی ..... دل تو ایک ایسا دیا ہے۔ جو سدا تیز و تند آندھیوں کے دھانوں پر پڑا پھڑپھڑاتا رہتا ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" امان نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"کہہ دوں ـــــ؟"

"پہلے یوں کرو۔ ایک پیالی گرما گرم کافی بنا کر لاؤ۔ پھر ساری رات باتیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ کے بھاگی۔

امان کی عادت تھی، وہ آدھی رات کو اسے ضرور جگاتا تھا۔ پانی بھی پینا ہو تو کہنیاں مار مار کر اسے جگاتا، حالانکہ بستر کے پاس پانی کا فلاسک پڑا ہوتا۔ بتی بجھانی ہو ـــــ کوئی کتاب ڈھونڈنا ہو ـــــ اور تو اور ـــــ آدھی رات کو وہ عجیب و غریب فرمائشیں کرنے لگتا۔

"اس وقت میرا جی پراٹھا اور اچار کھانے کو چاہتا ہے۔"

"خیر تو ہے۔" باسمہ مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھتی۔

تمہاری طبیعت کے رنگ تو حاملہ عورتوں جیسے ہوتے جا رہے ہیں۔

"دیکھو بحث نہ کرو ـــــ ورنہ چلا چلا کر بی اماں کو اٹھا دوں گا۔"

"نہ .... نہ ...." اماں بی کے اٹھنے سے باسمہ بہت ڈرتی تھی! اماں بی

تک آواز پہنچانا ایسے تھا جیسے جنات کی پوری فوج کو اٹھا دیا ہو ....

رات بھر وہ اُسے ستاتا ـــــ رات بھر فرمائشیں کرتا ـــــ رات بھر وہ ایک ٹانگ پہ کودا کرتی ـــــ لاڈلے بچے کی طرح وہ انمول انوکھی فرمائشیں کرتا رہتا ـــــ اور ماں کی ماری ماں کی طرح .... وہ ہنس ہنس کر ہر فرمائش پوری کرتی رہتی ـــــ صبح اسے دفتر بھیج کر وہ جی بھر کے سوتی .... دس گیارہ بجے اٹھ کر وہ ہانڈی روٹی کا فکر کرتی ـــــ تبھی تو اماں بی ہر آئے گئے سے بلند آواز میں کہتی رہتیں۔

"نحوست کی ماری ہے میری بہو۔ دن چڑھے تک سوتی ہے۔ کبھی اللہ رسولؐ کا نام تو لیا نہیں ـــــ ایسوں کو تو اللہ نامراد ہی رکھتا ہے۔"

باسمہ یہ سب سُن کر دل پر جبر کر لیتی۔ اللہ نے اس کو نامراد ہی پیدا کیا تھا۔ ہر ڈاکٹر نے مختلف انداز میں اسے یہی کہا تھا۔

"دیکھو بی بی۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ وہ قدرت والا معجزے تک دکھا دیتا ہے۔ مگر آپ .... آپ ...."

اور ایک ہی بات کو بار بار سننے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے اب دوا دارو سے بے نیاز ہو کر وہ معجزے کی منتظر رہتی تھی۔

اسی ایک کمزور سی امید پر وہ زندگی کی جوت جگائے بیٹھی تھی .... پتہ نہیں وہ ان دونوں میں سے کس پر زیادہ بھروسہ کرتی تھی ـــــ؟ امید موہوم تھی۔ اور شوہر مرد تھا ـــــ دونوں اعتبار کے قابل نہیں تھے۔ اسے اکثر یوں محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک کاغذ کی کشتی ہے ـــــ جو تیز و تند دھارے کے دہانے پر رکھ دی گئی ہے اس کو بس ایک ہی راستہ نجات کا نظر آتا تھا کہ وہ امان کو فقیر کر لے، اسیر کر لے ـــــ!

اسی جتن میں وہ بوند بوند لہو جمع کر کے محبت کا چراغ جلائے بیٹھی تھی۔

اس روز وہ بہت عرصے بعد آپا کی خبر لینے گئی تھی اور ان کی دگرگوں حالت کو دیکھ کر رات کو وہیں رک گئی تھی۔ ورنہ امان تو کبھی رات کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چاہے رات کے بارہ بجے لے کر آئے ـــــ ساتھ ہی لے آتا تھا ـــــ وہ کہتا تھا اپنے بیڈ روم میں وہ باسمہ کے بغیر ایک رات بھی نہیں رہ سکتا ـــــ

آج تو وہ خود بھی نہ رہنا چاہتی تھی کیونکہ پچھلے ایک ہفتے سے گھر میں فہمیدہ آئی ہوئی تھی ـــــ اور اماں بی تسبیح ہاتھ میں لئے اپنا پرانا منتر پھونکنے کے منصوبے باندھا کرتی تھیں۔ لیکن آج ہی آپا جی پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا تھا۔ اُن کا دم آنکھوں میں آکر اٹک گیا تھا اور گھر میں نوکر کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس لئے امان خود ہی اسے چھوڑ کر آگیا تھا۔ واپس آیا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ باسمہ نے بہت سمجھا کے بھیجا تھا کہ فرج میں کھانا رکھا ہے۔ اور روٹیاں پکا کے اس نے اُوون میں رکھ دی تھیں۔ ضرور کھا لینا ـــــ لیکن اس کا کھانے کو دل نہیں چاہا۔ کبھی یہ کام اپنے ہاتھ سے کیا جو نہیں تھا۔ یونہی لیٹ کر ورق گردانی کرنے لگا۔ ساتھ والے تکیئے پر ہاتھ رکھا تو باسمہ کے بالوں کی مہک اُڑی۔ تب اسے اُس کے گالوں کی تپش یاد آگئی اس نے چونک کر دیکھا تو تکیئے پر باسمہ کا ایک بال بھی چمٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنی انگلیوں میں بال کو اٹھا کر دیکھا۔ کیا ایک بال کے سہارے رات گزر سکتی ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے میں آہٹ ہوئی نظر اُٹھا کر دیکھا تو فہمیدہ کھانے کا ٹرے اٹھائے چلی آرہی تھی۔

"اماں بی جان لگائے بیٹھی رہتی ہیں۔" اس نے دل میں سوچا ـــــ "انہیں شیر کے شکار کا شوق ہے شاید۔۔۔۔؟"

"کیا بات ہے فہمیدہ؟" وہ خوف کے مارے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ خالہ بی نے آپ کے لئے کھانا بھیجا ہے۔"

"مگر میں تو کھانا کھا کے آیا ہوں۔" امان نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

"اچھا ـــــ" وہ زرد ہوگئی۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" امان نرمی سے بولا۔ "ویسے تم یہ ٹرے اندر باورچی خانے میں رکھ دو۔ صبح اُٹھ کر کھالوں گا۔ اور بی اماں سے کہہ دینا وہ میری فکر بالکل نہ کریں۔ اوپر کچھ بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صبح چائے پینے کے لئے خود نیچے آجاؤں گا۔"

وہ ٹرے اٹھائے باورچی خانے میں آگئی۔ اندر ٹرے رکھ دیا اور پھر انگلی پر دوپٹہ لپیٹتے ہوئے واپس آگئی۔۔۔۔ باہر جاتے جاتے ایک دم پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہو!"

"میں آپ کے پاؤں دبا دوں ـــــ؟"

"میں کوئی کھیتی باڑی کر کے آیا ہوں ـــــ موٹر میں ہی تو بیٹھ کر آیا ہوں۔"

"موٹر چلانے سے بھی ایک پیر تو دُکھنے لگتا ہے۔"

(سب بی اماں کی ہدایات پر عمل ہو رہا ہے)

اس نے بڑے غور سے فہمیدہ کی جانب دیکھا۔ وہ بڑے سبھاؤ سے بستر کی پائنتی پر بیٹھی تھی۔ اس کی عمر کوئی بائیس تیئیس برس کی ہوگی۔ یہ اماں بی کی دوسری لاڈلی بھانجی تھی۔ پہلی بھانجی رشیدہ تھی جس کو انہوں نے بچپن میں مانگ لیا تھا۔ مگر باسمہ نے امان کو اسیر کر کے یہ مانگ توڑ دی تھی۔ پھر اس کی شادی ہوگئی۔ اب اماں بی نے اپنی ساری امیدیں فہمیدہ پر مرکوز کر دی تھیں۔ ان کے لئے بارہ تیرہ برس کا فرق کوئی فرق نہ تھا۔

امان جب اسے غور سے دیکھ رہا تھا تو اُس کی پھیلی پھیلی ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر رہی تھیں۔ اس وقت امان کو احساس ہوا کہ جوان لڑکی کو غور سے دیکھنا اچھا

لگتا ہے۔ فہمیدہ بوٹے سے قد کی لڑکی تھی ـــــ جسے بہت چھوٹا قد کہتے ہیں۔ قد کی مناسبت سے اس کا جسم فربہ تھا۔ گداز اور بھرا بھرا ـــــ رنگ سانولا تھا ـــــ آنکھیں موٹی اور پھیلی پھیلی تھیں۔ جن میں اس نے بھر بھر سلائیاں سرمے کی ڈال رکھی تھیں سُرمہ تھا کہ چھلک رہا تھا اور رنگ تھا کہ دمک رہا تھا۔

اس کے چہرے پر اس وقت وہ ملاحت تھی جو جوانی کا خاصہ ہوتی ہے۔ اور نقش و نگار سے ماورا ہوتی ہے وہ اس کا باسمہ سے مقابلہ کرنے لگا۔ باسمہ اب بھی اس کے مقابلے میں بے انتہا حسین تھی۔ اس کے باوجود امان نے فہمیدہ کو وہاں سے اٹھنے کے لئے نہ کہا۔

یکایک فہمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر امان کے پاؤں کو چھو لیا۔

(یہ ہدایت نمبر ۲ تھی شاید)

امان کو ایسے لگا جیسے بجلی نے چھو لیا ہو۔ اس کے گرم گرم گیلے ہاتھ ـــــ بچوں کے ہاتھوں کی طرح عجیب لگے تھے۔ اچھے بھی اور گدگدی کرنے والے بھی ـــــ

امان نے جھٹ اپنا پاؤں اٹھا لیا اور بولا۔

"کیا کرتی ہو؟"

"اللہ آپ ہمیں دبا تے دیں نا۔"

نئی نئی طوائف زادی کی طرح فہمیدہ نے اٹھلا کر کہا۔

"دیکھو تم اس وقت اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔" امان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

اس نے اپنی کاجل بھری نظریں اٹھا کر امان کی آنکھوں میں جھانکا ـــــ

"کہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں ـــــ میں جب سے آئی ہوں۔ میری طرف دیکھتے بھی نہیں ـــــ کیا میں اتنی بُری ہوں؟"

(یہ ہدایت نمبر ۳ تھی شاید)

امان احساس کا جنگلہ پھلانگ کر نکل جانا چاہتا تھا مگر فارد اتاروں میں الجھ گیا۔

کم بخت کی آنکھیں کتنی کالی تھیں۔ اماوس کی رات کی طرح ـــــ کالی کالی ....

اور ہُو حق بولتی ـــــ رات کے پچھلے پہر آنکھوں کا کاجل رات کے اندھیرے سے جا ملتا ہے ـــــ .... امان نے اپنے دل میں ایک لہر سی محسوس کی ... کسی نوجوان لڑکی سے شادی کے نو سال بعد یوں مُلاقات کرنا عجیب لذت دیتا ہے۔ جس طرح ہر روز سگریٹ پینے والا آدمی ایک روز ولایتی سگار کا کش لے لے۔ کڑوا، سخت مگر پُر لطف۔

ایک دو کش لے لینے سے سگار کی عادت نہیں پڑتی۔ پھر بھی وہ اچھے شوہروں کی طرح ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔

"آؤ میں تمہیں نیچے چھوڑ آؤں۔ اچھی بچیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں۔"

(ہوں تو اچھی بچیاں رات کی چپ ندی میں کنکر پھینک کر ہلچل مچا سکتی ہیں۔)

جانے اُس نے "اچھی بچی" والی اصطلاح کس خوف سے استعمال کی تھی۔ مگر اس "اچھی بچی" کا ہاتھ چھُڑتے ہوئے ڈر رہا تھا ـــــ معلوم تھا ہتھیلی میں گرم عورت ہو گی۔

اچھی بچی تو کب کی رخصت ہو چکی ـــــ!

گیا تو نیچے چھوڑنے تھا اس کو ـــــ مگر اپنی نیّت نیچے چھوڑ آیا۔ واپس آیا تو باسمہ کی طلب کچھ اور بھی بڑھ چکی تھی۔ جلدی سے دروازہ بند کر کے اس نے کنڈی لگا لی ـــــ گویا ہُوا چغل خور ہے۔ اور در بہ در جا کے اس کی نیّت کا ڈھنڈورا پیٹتی پھرے گی۔

کمال ہے ـــــ اس نے اپنے دل میں پہلی مرتبہ ایک مبہم سا خطرہ محسوس کیا۔ انسان کا نفس بڑا کمزور کیڑا ہے۔ دنیا میں کوئی شے اتنی کمزور اور بے اعتبار نہیں جتنا یہ کم بخت نفس ہوتا ہے ـــــ!

صبح تیار ہو کے نیچے گیا تو فہمیدہ ناشتہ بنا کے میز کے پاس کھڑی تھی۔ جانے اتنی صبح وہ کیسے تیار ہو گئی تھی۔ وہی دھلا دھلا سا صبیح چہرہ اور کاجل کے حصاروں میں پھیلی کالی کالی آنکھیں ـــــ چھوٹے سے سراپا پہ چپکا ہوا پھُول دار سوٹ ـــــ امان

آکر بیٹھا تو اس طرح ناشتہ کرانے لگی جیسے جنم جنم سے اسے جانتی ہو۔ اونہہ.....
تو یہ بھی اماں بی کی کارستانی ہے۔

ناشتہ کرتے کرتے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اپنے دونوں سانولے سلونے ہاتھ گود میں رکھے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ امان کی نظر اس کے ہاتھوں پر اٹک گئی ــــ کوئی خاص بات نہیں تھی ان ہاتھوں میں۔ انگلیاں بھدی اور پوریں موٹی تھیں ــــ بیڑھے میڑھے ناخنوں پر گہری عنابی نیل پالش لگی تھی۔ مگر وہ ہاتھ انگاروں کی مانند دہک رہے تھے۔

امان کا دل چاہا چھو کر دیکھے۔

اس نے گھبرا کر نظریں فہمیدہ کے چہرے پر ڈالیں۔ قریب بیٹھنے سے شاید اس کی گول مول ناک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ سرمئی گردن کے تلے جہاں دوپٹہ ابھاروں کو ڈھانپے ہوئے ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ دل کے اندر ایک حشر سا بپا تھا۔ جانے وہ حشر امان کیوں محسوس کر بیٹھا ــــ؟

امان کھڑا ہو گیا۔ منہ پونچھا۔

وہ خدا حافظ کہنے باہر تک آئی۔

لو میاں ــــ آج تم ایک معمولی سی لڑکی سے خوف کھا بیٹھے ہو ــــ ڈر رہے ہو ــــ؟

ڈر کس بات کا ہے؟

امان نے جھک کر میز کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہر انسان اپنی بربادی کا خود ذمہ وار ہوتا ہے۔

اتنی سی بات یاد رکھنا۔

دفتر سے سیدھا باسمہ کو لینے چلا گیا۔ مگر وہ تو آپا جی کو لے کر ہسپتال چلی گئی تھی ان کی زبان بند ہو گئی تھی۔ جسم کا ایک حصہ ناکارہ ہو گیا تھا۔ حالت سنور نے کی بجائے بگڑ رہی تھی۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر انہیں ہسپتال لے جانا پڑا۔

ہسپتال میں کوئی کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو۔ زیادہ دیر نہیں بیٹھا جا سکتا وہاں سے اُٹھ کر وہ دوستوں کے ساتھ آوارگی کرتا رہا ــــ کھونٹے سے بندھے بندھے نو سال ہو گئے تھے۔ اس لئے آوارگی بھی کچھ مزہ نہیں دے رہی تھی ــــ نو سال بعد، بازاروں، ریستورانوں اور سینماؤں کی طرف آیا ــــ تو یوں لگا ــــ زمانہ بدل گیا ہے ــــ خوش فکروں کی کمی نہیں ــــ زمانہ کتنا تیز رفتار ہے۔ رُک جانے والوں کا انتظار نہیں کرتا ــــ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ زمانے سے پیچھے رہ گیا ہے۔ گھر جانا چاہتا تھا، مگر گھر جانے کے خیال سے ہی ڈر لگ رہا تھا.....

پھر بھی جب رات کے بارہ بجے وہ ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوا تو ــــ وہ کالی کالی آنکھیں بلی کی سی تیزی لئے اس کی طرف بڑھیں۔

جانے وہ کیوں جانتی تھی کہ آج بھی امان اکیلا آئے گا۔

"آج بھی آپ کھانا کھا آئے ہیں یا کھائیں گے؟"

"کھاؤں گا"

بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"آجائیے پھر ــــ" وہ جادو کے زور سے اس کے پیچھے باورچی خانے کی

طرف کھنچتا چلا گیا۔

بی اماں نے اپنے کمرے سے نکل کر اس طرح جھانکا جیسے حملہ کرنے سے پہلے دانا جرنیل محاذ کا جائزہ لیتا ہے اور پھر تسلی کر کے اندر چلی گئیں۔

"میاں اندھے ہو کے نہ چلو۔ یہ تمہاری ڈگر نہیں ہے۔"

"خالہ بی نے بتایا تھا، آپ گوشت میں بڑیاں بہت پسند کرتے ہیں۔ آج میں نے اپنے ہاتھوں سے پکائی ہیں۔"

بے اختیار اس نے فہمیدہ کے ہاتھوں کی طرف دیکھا گہرے سانولے ہاتھ۔ گہری نیل پالش ـــــ کوئی دلکشی نہ تھی ان ہاتھوں میں ـــــ مگر انکار کیوں لگ رہے تھے۔

اماں بی کی ساری ہدایات سامنے آ رہی تھیں۔ اور بھرے بھرے ہاتھوں سے پوری کی پوری عورت جھانک رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

ہر عورت ایک نیا جزیرہ ہوتی ہے جسے "دریافت" کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ دریافت کے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ عورتیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں ـــــ مگر دریافت کرنے کا عمل کس قدر خوبصورت ہے۔ ہر نوجوان لڑکی، گمنام جزیرے کی طرح، خوابناک، اچھوتی، پُراسرار اور انجانی بن کر آتی ہے ـــــ اور چاہتی ہے، مرد اپنی دیوانگی کا کولمبس بن جائے۔

اور دیوانہ وار اُسے کھوجے ـــــ تلاش کرے ـــــ فطرت کے پردے اٹھاتے ـــــ

لباس کی طرح عورت کے سب رنگ نرالے ہوتے ہیں۔ . . . اور جانے یہ لڑکیاں اَن دیکھے جزیرے بن کر مردوں کے اردگرد کیوں منڈلاتی ہیں؟

ذرا سی دیر کو باسمہ سائے میں چلی گئی ـــــ بیوی خواہ کتنی بھی حسین کیوں نہ ہو جب سائے میں چلی جاتی ہے تو اس کو گرہن لگ جاتا ہے۔

ذرا سی آنکھ مچولی کھیلنے کو کس مرد کا دل نہیں للچاتا۔؟

اگر عزرائیل کسی جوان عورت کے روپ میں آتا تو مرد نزع کے وقت بھی آنکھ مچولی کھیلنے سے باز نہ آتا۔

فہمیدہ تو ایک جوان لڑکی تھی۔ آتے جاتے کبھی آنچل لہرا جاتی ـــــ کبھی کندھا چھو لیتی۔ کبھی کوئی چیز پکڑاتے ہوئے انگارہ سی انگلیاں چبھو دیتی۔

ہدایات ساری اماں بی کی تھیں۔ ورنہ کوئی لڑکی بیوں شادی شدہ مرد کے لئے اتنی بے باکی سے جال نہیں بچھاتی۔

باسمہ جب گھر آئی تو تقدیر کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ اسے ہسپتال میں پندرہ دن رہنا پڑ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنے شوہر سے پندرہ دن کے لئے جدا ہوئی تھی . . . اسی لئے تو، انگلی پکڑ کر چلنے والا اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ سیانے ٹھیک کہتے ہیں۔ کبھی کبھی شوہر کو مکمل آزادی دے کر کھلا چھوڑ دینا چاہیئے ـــــ کھلے جانور کو اسیر کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے ـــــ جن کے گلے میں ہمہ وقت ایک رسی ہو وہ جانور بہت جلد اسیر کر لیئے جاتے ہیں۔

ادھر ابا جی کا دم آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اب نکلا کہ تب نکلا۔ شاید ان کا دم نکل جانے سے اتنا دکھ نہ ہوتا ـــــ جتنا اپنے بھرم کے نکل جانے کا ہوا تھا۔

پندرہ دن؛ ان پندرہ دنوں میں پندرہ مختلف راستے سانپوں کی صورت میں ادھر ادھر سے نکل آئے تھے ـــــ اور وہ کھڑی تلاش کر رہی تھی کہ اس کا اپنا راستہ کون سا تھا۔

اماں بی نے ایک دن تاک کر چاند ماری کی اور نشانہ ٹھیک دائرے کے اندر چلا گیا۔

ہنستی مسکراتی فہمیدہ اٹھ کر چلی گئی تو اپنے لہجے میں شیرینی سمو کر، ذرا قریب آ کے سرگوشی کے انداز میں بولیں۔

"میرے بچے، آج کل تیرے چہرے پر میں ایک خوب صورت سی شگفتگی دیکھ رہی ہوں۔ بانجھ عورت کے ساتھ رہ رہ کر مرا بیٹا مرجھا گیا تھا۔" زندگی میں پہلی بار ارمان کو

بانجھ کا لفظ باسمہ کے ساتھ لگانا بُرا نہیں لگا، ورنہ تو وہ اس لفظ سے سیخ پا ہو جایا کرتا تھا۔

"سچ ہے دنیا میں سب سے بڑی خوشی اولاد کی خوشی ہے۔ مجھے امید ہے اللہ میرے بیٹے کو بہت سے بچے دے گا اور یہ گھر بچوں سے بھرا نظر آئے گا۔"

اس بار امان چپ رہا تو بولتی گئیں۔

"ابھی تو تو خیر سے جوان ہے۔ اور لڑکی بھی گھر ہی میں ہے ـــــ کتنی سلیقہ شعار، حلیم اور منکسر المزاج لڑکی ہے۔ دن رات تیری خدمت کرے گی۔ جہاں تو پاؤں رکھ دے وہاں اپنا سر رکھتی ہے۔ بھلا اس زمانے میں کوئی ایسی لڑکی ہے۔ جو سوتن والے گھر میں جانا چاہتی ہے ـــــ ؟"

امان نے اس بات پر حیران ہو کر اماں بی کو دیکھا۔

"ہاں یہ بات تو بس ہماری فہمیدہ میں ہے ـــــ باسمہ کے ساتھ مِل جُل کر رہنے پر تیار ہو گئی ہے۔ . . . . اور میں کون سا کہہ رہی ہوں کہ تو باسمہ کو طلاق دے دے ـــــ اس کو بے آسرا کر کے مجھے کتنا ثواب ملے گا ـــــ نہ نہ ـــــ اس بیچاری کا اس میں کیا قصور ـــــ ؟ تو اس کو بھی اپنے ساتھ رکھ ـــــ اسی گھر میں ـــــ تم اور باسمہ پہلے کی طرح اوپر والے حصے میں رہنا ـــــ فہمیدہ میرے ساتھ رہے گی ـــــ ایک دو بچے ہو جائیں تو ہم ماں بیٹی مطمئن ہو جائیں گے۔ تم ہماری خبر لو نہ لو ـــــ ہمیں پرواہ نہ ہو گی ـــــ ہاں ـــــ میں تم دونوں کو جُدا کرنے کا گناہ کیوں کروں۔ مجھے تو صرف تمہاری اولاد سے غرض ہے ـــــ اور فہمیدہ بہت بڑی قربانی دینے کو تیار ہو گئی ہے ـــــ ذرا سوچ کے بتاؤ آج کل کی لڑکیوں میں اتنی محبت ہے ـــــ ؟ گھر کی لڑکی ہے۔ اس لئے تم اس کی قدر نہیں کر رہے ہے۔

"اماں بی نے تو یہ مسئلہ خود ہی حل کر دیا ہے" ـــــ امان نے دل میں سوچا۔ بڑا اچھا بندوبست ہے۔ ذرا سا "دریافت" کا چکر بھی پورا ہو جائے گا۔ اور باسمہ کا بھی ساتھ رہے گا۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

امان چپ رہا تو ـــــ اماں بی سمجھ گئیں کہ لوہا گرم ہے ـــــ جدھر جا ہوں گی موڑ لوں گی ـــــ اٹھ کر اپنی صندوقچی نکال لائیں۔ اور اپنی ایک پرانی، سنبھال کر رکھی ہوئی انگوٹھی نکال کے فہمیدہ کو پہنا دی ـــــ اسی رات باسمہ گھر آ گئی۔

فہمیدہ کی پُراسرار مسکراہٹ اور سیدھے ہاتھ کی دوسری انگلی میں چمکتی ہوئی پُرانے طرز کی انگوٹھی اسرار کے سب پردے اٹھانے لگی۔

بہت ذہین تھی۔ نو سال سے زندگی کے نشیب و فراز دیکھ رہی تھی۔ لاشعوری طور پر ہمیشہ ایک خطرہ محسوس کیا کرتی تھی ـــــ خطرے کی موجودگی سونگھ چکی تھی۔

رات جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو کمرے کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں فہمیدہ کمرہ سنوارتی رہی ہے۔ یہ بات تعجب کی نہیں تھی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ امان نے یہ ساری تبدیلی پسند کر لی تھی۔ ہر شے اپنی جگہ سے ہلا دی تھی۔ حتیٰ کہ بستر کے تکیے بھی اپنی جگہ پر نہیں تھے۔

باسمہ نے سر اٹھا کر امان کی طرف دیکھا ـــــ آیا اس کا دل اپنی جگہ پر ہے یا نہیں

امان رُک رُک کر بولا ـــــ "دیکھو نا ؟ باسمہ۔ نو سال سے میں مسلسل اماں بی کو ٹال رہا ہوں۔ آخر تو مجھے ان کی خواہش کا احترام کرنا چاہیئے۔ یہ بھی تو میرے فرائض میں سے ہے۔ اولاد کی ضرورت کسے نہیں ہوتی ـــــ ؟ تم جانتی ہو میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے بیچوں بیچ اگر کوئی حل نکل آئے تو تمہیں بھی اسے قبول کر لینا چاہیئے۔"

باسمہ چُپ ہو گئی۔

آئی تو تھی پھر سے سہاگ رات منانے، بہت دنوں کی جدائی نے اسے تڑپایا تھا مگر اب جذبات کے برانگیختہ تو سے پر امان کی کج ادائی نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈال دیئے تھے۔ سینے پر ہاتھ رکھا تو چپ کی سِل کلیجے میں اتر گئی۔

باسمہ، باسمہ ـــــ

اماں نے دو تین مرتبہ پکارا . . . پھر اٹھ کر اس کے چہرے پر جھک گیا۔

"خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھو باسمہ ـــــ میں تمہیں ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے ساتھ آج بھی محبت کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ بچہ . . . . بچہ . . . . یہ ایک خلش کہیں خلیج نہ بن جائے"

"بچہ خلیج نہیں بنے گا اماں اللہ خان!"

"مگر یہی بچہ ہمارے درمیان خلیج بنے گا"

"کتنا ستم ہے کہ جب میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں تم کہہ رہے ہو میں تمہیں غلط نہ سمجھوں۔ اوہ ـــــ اسی موڑ پر تو مرد بے نقاب ہوتا ہے"

"میں نے تو تمہیں اماں بی کی خواہش بتائی ہے۔ میں تمہاری اجازت کے بغیر شادی نہیں کروں گا۔ ہرگز نہیں . . . یونہی تمہارے قدموں میں رہوں گا"

"جب کسی مرد کے دل میں دوسری شادی کا خیال آجاتا ہے ـــــ وہ اسی لمحے شادی کا مرتکب ہو جاتا ہے . . . خیانت ہو چکی ـــــ عملی کارروائی تو بالکل زمانہ سازی ہوتی ہے۔ میرے محبوب دل بدلتے ہیں تو لہجے بھی بدل جاتے ہیں . . . اور وہ . . . . جو تم میرے نصیب کی راتیں چرا چرا کر اس پر نثار کرو گے ـــــ! اور وہ جو مجھ پر چلائے ہوئے تیر اس پر آزماؤ گے ـــــ اور وہ جو مجھ پر برتے ہوئے فقرے اس کی جھولی میں ڈالو گے . . . . اور وہ جو ہر رات ایک اسٹیج پر دو ڈرامے کرو گے ـــــ کیا اس سے تمہارا دل مطمئن ہو گا؟

اور وہ جو ذرہ ذرہ کر کے تمہیں مجھ سے چرا لے گی۔

اور میں اپنے ذبح ہونے کا نظارہ ہر رات کس طرح دیکھا کروں گی ـــــ دیکھو تو مرد کی محبت کی انتہا ـــــ عورت کے گلے پر چھری پھیر کر اس کی رضا مانگتا ہے۔ اس کا مزار بناتا ہے۔ پھر اس پر جشن چراغاں کرتا ہے . . . . .

اس کی روح کھینچ لیتا ہے ـــــ اور چاہتا ہے وہ مسکراتی رہے ـــــ اور ظلم کو احسان کی چادر میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے۔

کاش کبھی کوئی عورت کسی مرد کو اتنی بڑی تکلیف دے سکے ـــــ . . .

اور صاف کہہ دے کہ میں تم سے سدا محبت کرتی رہوں گی ـــــ مجھے دوسرے مرد کی بیوی بننے کی اجازت دے دو ـــــ تقسیم ہونے سے کیا الفت مٹ جائیگی۔؟"

باسمہ کو مات مل چکی تھی ـــــ

آگے چلنے کو اس کے پاس کوئی مہرہ نہ تھا . . . .

وہ برف کے تودے کی طرح پڑی رہی . . . نو سال کا ہر ہر لمحہ اس پر اذیت بن کر اترتا رہا ـــــ اسے یوں محسوس ہوا جیسے گزشتہ نو سال کا ہر پل ڈیپ فریز میں رکھا رکھا ٹھٹھر گیا ہے۔ اسی طرح اسی عالم میں منجمد ہوا پڑا ہے۔

جب چلانے کا کوئی جواز نہ ہو مگر آدمی بے اختیار چیخنا چلانا چاہے ـــــ اس وقت منہ پر کیسے ہاتھ رکھا جائے ـــــ؟

اس نے اپنی سن ہوتی ہوئی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسایا اور اٹھ کر ان ہاروں کی کلیاں مسلنے لگی۔ جو وہ آتے ہوئے بازار سے خرید لائی تھی۔ اس نے ملن کی رات کا ایک انداز بنا رکھا تھا ـــــ رات جب بھی اماں اپنے بیڈ روم میں داخل ہوتا ـــــ اسے یوں احساس ہوتا جیسے آج ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔ پھر کھٹ کو نئے انداز سے سنوار کر پتی پتی سے سجانا اس کی پرانی ادا تھی ـــــ آج بھی وہ ڈھیر سارے گجرے کلیاں اور پھول لے کر آئی تھی۔ بہت دیر بعد ملن رت آرہی تھی۔ . . . .

پر یہ بیچ میں سرخ دھاری کیسے آگئی ـــــ؟

اسی وقت بی اماں نے اچانک اماں کو پکار کر بلا لیا اور وہ نیچے اتر گیا تو باسمہ کو سوچنے کا موقع مل گیا۔

اس نے اپنی ساری ہمت اور ذہانت مجتمع کی اور اپنے آپ سے بہت سے سوالات کئے۔

ہر بار اس کے دل نے یہی جواب دیا ـــــ سب کچھ اپنے ہاتھ سے کر دے۔ آج یہ شادی رکوا لے گی، کل کیا کرے گی؟ جو گھٹا امنڈ گھمنڈ کے چھائی ہے ـــــ کسی نہ کسی رت

میں چھاجوں برسے گی ـــ کیا بی آماں باز آجائیں گی ـــ یا اماں کے دل کی گرہ کھل جائے گی ـــ مرد لڑکھڑایا ہے تو گرے گا ضرور ـــ بی اماں محتاط شکاری تھیں ـــ فہمیدہ کو اس کے سرہانے لا بٹھایا تھا۔ . . . سرہانے کی طرف آگ ہو تو سینک پہلے چہرے کو پہنچتا ہے ـــ اور وہ ہاتھوں میں پھول لئے اس آگ کو بجھانے کا تہیہ کئے کھڑی تھی پھول آگ کو بجھاتے نہیں ـــ ہاں انہیں اس آگ کو معطر کر دینا چاہیئے۔

لیکن کیا تقسیم شدہ مرد مخلص رہ سکتا ہے؛

اور کیا کوئی مرد دونوں بیویوں کا حق برابر ادا کر سکا ہے۔ آج تک سنا تو نہیں؟ دیکھ بھی لیں گے۔

اماں نے اوپر بھیجنے سے پہلے اماں کو اچھی طرح پڑھایا تھا۔ اور جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا تو کہیں سے فہمیدہ نے نکل کر ہاتھ ماتھے پر لیجا کر سلام بھی کر دیا تھا۔ اس ہاتھ میں منگنی کی انگوٹھی جھلمل کر رہی تھی اور وہ ہاتھ اماں کو ایک انگارہ سا لگا تھا۔ اس یاد دہانی پر اماں لرز سا گیا۔ . . . دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے لگا۔ ایک عورت کنارے کے اس پار کھڑی تھی۔ اس کا سراپا ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر اشارے سے اُسے بُلا رہی تھی مرد کو اشارہ ہی تو تباہ کر دیتا ہے۔

ایک مبہم سے اشارے پہ وہ اپنی زندگی کا دھارا ہی بدل دیتا ہے ـــ دوسری عورت اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اس کا دل گرما رہی تھی۔ مزاج داں تھی ـــ محبوب تھی۔ چراغ کی طرح اسے ہتھیلیوں پر اٹھائے چلی آرہی تھی۔ مگر ـــ

مرد کو پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت کبھی نظر نہیں آتی، اس لئے وہ ہمیشہ سامنے دیکھتا ہے قریب نہیں دیکھ سکتا۔

ذہن اس کا کمرے میں بھٹک رہا تھا۔ دل وہاں ایک مبہم سے اشارے میں اٹک گیا تھا

ایک رات زندگی کی اَن گنت راتوں میں سے نکال کر، باسمہ نے اپنے نصیب کی چادر پر سجا لی۔ اس ایک رات کو وہ محبت کے زور پر جیت لینا چاہتی تھی۔ بھلا مرد کا ایمان بدلتے کون سی دیر لگتی ہے۔ باسمہ نے اپنا شب خوابی کا بہترین لباس پہنا ـــ بالوں میں موتیا کی سفید کلیاں گوندھیں اور گلاب کی پتیوں سے تکیوں پہ اماں، اماں لکھ دیا ـــ یوں وہ اکثر کیا کرتی تھی۔ اماں جب کمرے میں آتا تو سفید بستر پہ گلاب کی پتیوں سے جا بجا اس کا نام لکھا ہوتا۔ اور اسے پاگل کر دینے کو یہی کافی ہوتا ـــ آج تو جنوں سامانی کے لئے اس نے سارے محاذ کھول دیئے تھے۔ سارے کمرے میں سہاگ رات انتخاب کرا کر آتی تھی، باسمہ دھیمے دھیمے سُروں میں گنگنا رہی تھی۔

آج ہے پیار کا فیصلہ او صنم . . . . .

اماں کمرے میں آیا تو مبہوت ہو گیا ـــ

باسمہ تھی یا قیامت ـــ شعلہ بداماں سی۔ ویسی ہی پُراسرار۔ کلیوں میں گوندھی چاندنی کی طرح۔

"باسو! مجھے بچا لو"

اُس نے باسمہ کے بازوؤں میں چھپتے ہوئے کہا۔

یہی کچھ باسمہ سُننا چاہتی تھی . . . اپنی دعاؤں کا اثر دیکھنا چاہتی تھی۔

"باس ـــ باس ـــ" وہ اسے چلّا چلّا کر پکارنے لگا ـــ یونہی باسمہ اسے بے خود کیا کرتی تھی اور جانتی تھی ـــ جب شہزادہ جال میں پھنسے تو پھر کون سا منتر پھونکنا چاہیئے۔ پر آج نہ جانے کیا ہوا۔ ہونٹوں سے نغمے پھوٹنے کے بجائے آنکھوں سے جھرنے پھوٹ پڑے۔

باسمہ نے پہلے تو اس کے چہرے کو آنسوؤں سے غسل دیا اور پھر محبت کی انتہا کر دی ـــ یہی ایک رات تو مانگی تھی اس نے امان سے ـــ

جب امان بے اختیار کہہ اٹھا۔

"بدنصیب ہے باسمہ وہ مرد جو تمہیں بھول جائے۔"

"امان ـــ"

"باسمہ! تم میری جنت ہو۔ اور جنت کوئی منتشر نہیں کرنا چاہتا۔"

"امان، اگر اس جنت میں بچے نہ ہوں تب ـــ؟"

"لعنت بھیجو بچوں پر ـــ مجھے تمہارے علاوہ کچھ نہیں چاہیئے باسمہ!"

"امان! تم اماں سے بھی وعدہ کر چکے ہو۔"

"وعدہ توڑا بھی تو جا سکتا ہے نا؟"

"ہاں مگر یہ زہر کا پیالہ بن جائے گا۔"

"مگر میں کیا کروں؟ کیا کروں باسمہ؟" اس نے باسمہ کے لمبے بالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کھینچا۔ "میں اپنے آپ کو کیسے تقسیم کروں؟

"ہاں۔ یہ سوچنے کی بات ہے امان ـــ منقسم مرد کسی عورت کی امانت نہیں ہوتا بعض اوقات مرد کو تقسیم کیا جائے تو مر جاتا ہے ـــ کیا تم میرے بغیر جی سکو گے امان ـــ؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" امان نے نشے میں لدی لدی آواز میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم میرے بغیر جی نہیں سکتے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" امان نے اس کے بالوں میں منہ چھپا لیا ـــ "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے۔"

صبح ہو گی نا ـــ؟" وہ آنکھیں موندے موندے بولا ـــ "تو میں اماں بی سے صاف کہہ دوں گا۔"

"ہاں صبح ہو گی جب نا۔" باسمہ نے افسردگی سے کہا۔ "آج کی رات بچیں گے۔ تو سحر دیکھیں گے۔ تم دیکھ لینا۔"

"کیا کہہ دو گے بی اماں سے؟" باسمہ نے بہت سی پتیاں اٹھا کر اس کی پیشانی پر سجا دیں۔

"میں کہہ دوں گا مجھے بچے کی ضرورت نہیں۔ میرا سب کچھ باسمہ ہے۔"

"وہ تو تم نو سال سے کہتے آ رہے ہو۔"

"نو سال تک اور کہتا رہوں گا۔"

"امان۔ میں تم پر نو صدیاں اور نثار ہوتی رہوں گی۔"

"باسمہ ۔ ۔ ۔ باسمہ ۔ ۔ ۔ باسمہ ۔ ۔ ۔"

صبح جب وہ دونوں رات کی مرجھائی ہوئی پتیوں سے کھیل رہے تھے ...

تو بی اماں تاریخ مقرر کرنے کے لڈو لے کر اوپر آ گئیں ۔ ۔ ۔

باسمہ نے امان کی طرف دیکھا ـــ امان کے ہونٹوں کو تالا لگ گیا۔

کیا ان لڈوؤں میں کوئی طلسماتی طاقت تھی۔ باسمہ نے گزری رات کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

اور اپنے آنسو چھپانے غسل خانے میں چلی گئی۔

مرد کی صبح اور رات میں بہت فرق ہوتا ہے۔

نیچے بی اماں کے ساتھ والا کمرہ سجاتے ہوتے باسمہ سوچ رہی تھی۔

"کیا یہ سب کرنا بھی محبت میں رقم تھا" ـــــ جب تقدیر اس کے خلاف ہو گئی تو اس نے سوچا یہ سب اپنے ہاتھوں سے کر دے۔ مرد طوطا چشم بن جائے تو عورت کو چشم پوشی کرنی چاہیئے۔ یہ امید کیا کم تھی کہ وہ اب بھی امان کی تھی۔ اور امان نے سدا اسے اپنے قریب رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ قدرت کی بعض ستم ظریفیوں کے ساتھ سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے شوہر کی شادی اپنے ہاتھ سے کرنا اور پھر اپنی سوتن کا چھپر کھٹ سجانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔۔۔۔۔

یوں کبھی کسی نے گرم سیخوں پر اپنا دل چڑھا کے اس کے کباب بنائے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔ محبت کے نام پر ـــــ یا مجبوری کے نام پر۔

وہ دلہنیدہ کا چھپر کھٹ نہیں سجا رہی تھی، بلکہ اپنے مزار پر پھول چڑھا رہی تھی۔

اسی وقت گلے میں لمبا سا ہار پہنے امان سامنے نمودار ہوا۔

اس نے جن نظروں سے باسمہ کو دیکھا باسمہ لرز گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کا دل چاہا۔ یہ جو انسانیت کا مصنوعی لبادہ اس نے اوڑھ رکھا ہے، اسے چاک کر دے ہر فرض سے منہ موڑ لے۔ باغی ہو جائے۔ اور امان کو اپنے دونوں بازوؤں میں چھپا کر یہاں سے کہیں فرار ہو جائے۔ اس میں اور امان میں ابھی صرف دو قدم کا فاصلہ

تھا۔ یہ فاصلہ بڑھتے بڑھتے سانپ بن جانے والا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول سے بچھوؤں کی صورت ڈسنے لگے۔

کل رات آخری رات تھی جو امان نے اس کے زانو پر سر رکھ کر بتا دی تھی۔ ساری شب وہ امان کے چہرے پر اپنی زلفیں پھیرتی رہی تھی اور امان مسلسل قسمیں کھاتا رہا تھا، ثابت قدمی کی، وفا کی ـــــ واہ، وہ ہر بار ہنس پڑتی۔

کیسے عیسیٰ ہو کہ بیمار کئے دیتے ہو؟

کل شب بڑی تاریک بڑی پُرسوز تھی ـــــ جب بھی بے تاب ہو کر امان قسم کھاتا، ستارے شرارت سے آنکھیں مارتے۔۔۔ ستاروں کی اس شرارت آمیز بدتمیزی پر وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

اور آج وہ نیند کی گولیاں خرید لائی تھی۔ یوں رات اس لئے تو نہیں آتی کہ ضرور آنا چاہیئے۔ مگر کبھی کبھی تو رات کے بغیر بھی سو جانے کو جی چاہتا ہے ـــــ ایک لمبی نیند ـــــ اور آج امان اسے کیسی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا ـــــ ان نظروں میں بے بسی تھی ـــــ یا فریب کے چاک ہو جانے کا ڈر ـــــ اس کا شکی دل ہر ایک سے بدگمان ہو رہا تھا۔

باسمہ نے اپنی آنکھوں کے آنسو چھپانے کے لئے یوں نظریں پھیریں جس طرح ہر جائی مرد نئی عورت کی آمد پر پھیرتا ہے۔ ان مہکی کلیوں کو اپنے آنسوؤں کی شبنم سے بھگوتی وہ اوٹ میں ہوئی جا رہی تھی کہ بی اماں لال جوڑا پہنے نمودار ہوئیں ـــــ بارات جانے کی جلدی تھی اور بی اماں باسمہ کو بارات کے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ ان کو ڈر تھا کہ اگر اس کو گھر میں چھوڑ گئے ـــــ تو شاید عروس نو کے چھپر کھٹ پر وہ کوئی نامراد کالونا ٹوٹکا کر دے گی ـــــ بھلا نامرادوں کے پاس گھر جلانے کے لئے تعویذ کہاں سے آئیں گے؟

وہ بارات کے ساتھ جانا نہ چاہتی تھی مگر جانا پڑا۔ یوں جیسے کوئی اپنے ہی جنازے کے ساتھ چل رہا ہو۔

لوگ ہمدردی نہیں کرتے۔ ہمدردی کے بہانے زبان کا چھُرا گھونپ کے تڑپنے کا تماشا دیکھتے ہیں۔ اسی لئے تو ایسے موقعوں پر اُلٹے سیدھے سوال کرنے سے باز نہیں آتے۔

"یہ ہے پہلی بیوی ——"

"ہائے کتنی خوبصورت ہے؟"

"اُف اللہ اتنی سندر مورت کے ہوتے ہوئے دوسری شادی رچا رہا ہے۔"

"نصیب کی بات ہے۔"

"سچ کہا ہے کسی نے، سہاگن وہی جسے پیا چاہے۔۔۔۔"

"بچّہ نہیں ہے بچاری کا! چہ چہ۔۔۔۔"

"ہائے ہائے بدنصیب بچاری۔ اس خوبصورت جوانی کا کیا فائدہ —— ؟ اللہ کے کام بھی نیارے ہوتے ہیں۔"

"واہ میرے مولا تیرے صدقے۔"

"ویسے ہے دِل گردے والی —— خاوند کی بارات لے کر آئی ہے۔ اور کس کس طرح ہنس ہنس کے ہر ایک کو بری دکھا رہی ہے۔"

(کاش اپنا دل دکھا سکتی)

"فہمیدہ تو اس کے پاؤں کی جوتی بھی نہیں۔"

"مگر جب اس کے بچے ہو جائیں گے تو اس پر بھی راج کریگی۔"

یوں ایسی باتیں سُن کر مسلسل مسکرائے جانا بھی حوصلے کی بات ہے لوگ تو بار بار مسکراہٹ کا پردہ چاک کرنا چاہتے ہیں —— لوگ تو چاہتے ہیں دِل میں نشتر چبھو کے بوند بوند لہو ٹپکنے کا نظارہ بھی اپنی آنکھوں سے کرلیں۔ لیکن لدے ہوئے بادل کم ظرف نہیں ہوتے۔ زمین دیکھ کر برستے ہیں ——

مسکراتے مسکراتے اس کے جبڑے دکھنے لگے —— اور جبر کرتے کرتے اس کا دِل پھوڑا بن گیا۔ تب کہیں برات گھر آئی۔

پھر وہ نیچے نہیں رُک سکی۔ دوڑ کر اُوپر آگئی۔

اوپر کمرے میں رات اندھیری تھی اور امید کا کوئی ستارہ بھی خالی آسمان پر نظر نہیں آرہا تھا۔

سچ کی اوٹ میں جو ڈرامہ ہوتا ہے، وہ اُسے بھول جانا چاہتی تھی۔ اور مرد کے اس روپ کو بھی —— جانے کیسے پل پل بیتی اندھے کنوئیں میں پھُنک رہی تھی کہ ایک شور سا اٹھا۔ پھر دھڑ سے دروازہ کھلا، اور امان اندر آگیا۔

ایک ثانیے کے لئے اس کی دھڑکنیں رُک گئیں —— اگر دل کے رشتوں کی مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ امان خوبصورت لمحات کی زنجیر توڑ کر پرانی صعبتوں کی آغوش میں چلا آیا ہے تو آج شب کے بعد وہ زندہ نہ رہے گی —— اور اس خوشی کی قیمت اپنی زندگی دے کر چکائے گی۔ اور امان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسا انعام دے جائے گی کہ وہ تر و تازہ پھول کی طرح اسے یاد رکھے گا۔

مگر امان تو بڑا ہراساں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر اور کندھوں پر جو پھول لٹک رہے تھے۔۔۔۔ وہ لرز بھی رہے تھے۔ گریبان کے بٹن کھلے تھے —— آنکھیں چڑھی چڑھی تھیں —— جیسے کسی دشمن نے پلائی ہو۔ —— سانس بے ترتیب تھی۔ اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ڈرتی کانپتی کھڑی ہو گئی۔

پیچھے ہی اماں بی اور چند عورتیں بھی کمرے میں داخل ہوئیں۔

خداوندا!

کیا کوئی اور قیامت بھی آئے گی؟

اب کونسا کھیل دھرتی پر رچایا جائے گا؟

وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"بیٹا بولو نا؟" بی اماں کی آواز آئی۔

تو وہ اپنی بھاری، لرزاں لرزاں آواز میں بولا۔

"باسمہ، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

"نہیں امان نہیں ـــــ اپنے الفاظ واپس لو ـــــ تم میرے بغیر جی نہ سکو گے۔ میں تمہارے بغیر۔۔۔"

"باسمہ، میں تمہیں ان سب لوگوں کی موجودگی میں طلاق دیتا ہوں"

"باسمہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں"

تین ہی بار بمباری کرنا تھی اُسے ـــــ

اماں بی بازو سے پکڑ کر اُسے باہر لے گئیں۔ یہ بہادری کا کارنامہ کرنے کے بعد وہ بھی نڈھال نظر آرہا تھا۔

باسمہ کی چیخیں اس کی اپنی حالتِ زار پر ہنسنے لگیں۔

یہ آخری ہدایت بھی، فہمیدہ کو اماں بی کی طرف سے تھی ـــــ "کہ جونہی اسے سرشار کرلو ـــــ ہوش اور بے ہوشی کے کنارے پہ لے آؤ ـــــ تو ایک قدم آگے بڑھنے سے پہلے طلاق کا مطالبہ کر دینا۔ دیکھو طلاق دلوائے بغیر اسے اپنا شوہر نہ بننے دینا۔ چاہے اس کے لئے کتنی ہی راتیں غارت کرنا پڑیں۔ ورنہ ـــــ اس کے بعد تم بازی جیتنے والا سب سے بڑا پتہ ضائع کر دو گی"

"امان ـــــ امان ـــــ"

باسمہ سسک نہیں رہی تھی۔۔۔۔ رو نہیں رہی تھی۔۔۔۔ اس کی یہ بے ترتیب سانس امان، امان کا ورد کر رہی تھی ـــــ اور کہہ رہی تھی ـــــ

یک بیک ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے
اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

جب تک ہوش رہا ـــــ یہی کہتی رہی ـــــ نیند کی گولیاں کھانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ـــــ ایک بار جو بے ہوش ہوئی تو پھر دن کی دھوپ نے ہی اُسے ہوش دلایا۔

اور اماں بی نے بھی نئے دولہا دُلہن کے اٹھنے سے پہلے پہلے اسے میکے پہنچا دیا ـــــ سامان بعد میں پہنچ گیا ـــــ شام تک وہ حصّہ، وہ چھپر کھٹ نئی دلہن

کے لئے سجا دیا گیا تھا۔

یہ سب کتنا ناممکن سا لگتا ہے۔ مگر جب ـــــ موت اور زندگی میں صرف ایک سانس کا فاصلہ ہے ـــــ اور پل بھر میں یہ فاصلہ پاٹ جاتا ہے ـــــ آنکھیں موندتے ہی دوسرا جہاں آجاتا ہے تو وہ کس طرح ایک دن میں اپنا طویل سفر نہیں طے کر سکتی ـــــ؟

اس وقت امان ایک جنرل اسٹور کے باہر کھڑا اپنے دوست کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا ـــــ اب وقت بے وقت فضول گوئی کرنا، دفتر سے اُٹھ کر آوارگی کرنا، جدھر چاہنا منہ اٹھا کے چل دینا اس کی عادت بن چکی تھی۔ زندگی کا کوئی رویّہ رہا تھا نہ اصول۔

جونہی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا ـــــ سامنے موٹر میں باسمہ جا رہی تھی۔ جانے کیوں اب بھی، جب وہ باسمہ کو دیکھ لیتا کوئی جیسے اس کے دل میں ایک چٹکی لیتا ـــــ دو چار سال تو ـــــ اسے باسمہ کہیں نظر ہی نہ آئی تھی۔ ویسے اس نے سُن لیا تھا کہ اس نے کسی امیر آدمی سے شادی کر لی ہے۔ اس نے اپنی کینچلی بدل لی ہے اور بڑی خوش و خرم رہتی ہے۔ جانے اسے باسمہ کی شادی کی خبر نے دکھ کیوں پہنچایا تھا ـــــ کیا وہ چاہتا تھا ساری عمر باسمہ بھکاریوں کی طرح ناداری زندگی گزار دیتی ـــــ؟

مگر کس برتے پر ـــــ؟

پھر ایسا ہونے لگا کہ شہر کے کسی چوراہے پر، کسی ریستوران میں، کسی مارکیٹ میں اسے باسمہ نظر آ ہی جاتی۔ اپنے نئے شوہر کے ساتھ، کسی نئی سہیلی کے ساتھ، کبھی تنہا اپنی نئی کار میں ـــــ اس کے تن پر دیدہ زیب لباس ہوتا اور چہرے پر اتنا اطمینان ہوتا کہ امان کا دل جل کر کباب ہو جاتا ـــــ ایسا اطمینان اور ایسا سکھ تو امان کے نصیب میں نہیں آیا تھا ـــــ حالانکہ وہ بامراد تھا۔ اور باسمہ کی کوکھ ابھی تک خالی تھی۔

جب کبھی وہ باسمہ کو اس عالم میں دیکھ لیتا، اس کا دل چاہتا ـــــ وہ جا کر سڑک پر باسمہ کو پکڑ لے ـــــ اسے کوئی کچوکا لگائے ـــــ اسے بے وفائی، کج ادائی کا طعنہ دے ـــــ کوئی ایسی بات کہے کہ ہنستی ہوئی باسمہ رو پڑے۔۔۔۔

آج بھی جب باسمہ بڑے وقار سے موٹر چلاتی ہوئی اس کے آگے گزر گئی۔ تو بے اختیار اس کا دل چاہا وہ اس کا پیچھا کرے۔ بالکل اس طرح جس طرح جوانی کے اوّلین دنوں میں وہ اس کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ باسمہ ان دنوں کالج کے آخری سال میں تھی۔ اور امان یونیورسٹی کے آخری سال میں تھا۔ دوسرے نوجوان لڑکوں کی طرح وہ بھی چھٹی کے وقت زنانہ کالج کے گیٹ کے باہر کھڑا ہو جاتا تھا۔ پھر ایک دن اس کی نظر باسمہ کے لمبے بالوں میں الجھ کر اس کی خوبصورت گہری براؤن آنکھوں میں ٹھہر گئی۔

اس دن کے بعد سے وہ صرف باسمہ کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس کا پیچھا کرتا تھا۔ اس بس اسٹاپ تک جاتا جہاں سے باسمہ گھر کے لئے سوار ہوتی تھی۔ یوں اس کی رسائی باسمہ کے گھر تک ہوئی۔ پیچھا کرنے کا یہ عمل پانچ سال تک جاری رہا۔۔۔ حتیٰ کہ باسمہ کے دل میں وہ چنگاری پھوٹ نکلی جو آتشِ عشق کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ تب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا اور باسمہ دل کے جذبوں پر ایمان لے آئی تھی۔

مگر کسی لڑکی کا پیچھا کرنے میں کس قدر مزہ آتا ہے اسے اب تک یاد تھا۔ گو وہ اب نوجوان قسم کا جوشیلا عاشق نہیں تھا مگر باسمہ ابھی تک اتنی ہی خوبصورت تھی کہ کوئی مرد اسے دیکھے تو اس کا پیچھا کرنے پر مجبور ہو جائے۔

وہ بے کلی میں ٹہلتا ٹہلتا سڑک پر دور تک نکل آیا اور مضطربانہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سڑک کے پار، بڑے چوراہے کی بغل میں اس کی نظر ٹھٹھک گئی۔ بینک کی لیڈیز برانچ کے باہر باسمہ کی پیلے رنگ کی مزدا کھڑی تھی۔ غالباً وہ بینک کے اندر گئی تھی۔

جنرل اسٹور کا مالک امان کا دوست تھا۔ امان اس کے پاس گیا اور بولا۔

"یار میری موٹر باہر کھڑی ہے۔ دھیان رکھنا۔ میں ذرا سڑک کے پار بینک تک جا

رہا ہوں؟

وہ سڑک پار کر کے بینک تک چلا گیا ـــــ گو بینک تک کہکشاں راستہ نہیں بنا رہی تھی۔ مگر جانے اسے ان راہوں پر جانا اچھا کیوں لگا ـــــ؟

پھر وہ موٹر کے قریب چلا گیا۔ اور بے اختیار جھانک کر اندر کی طرف دیکھنے لگا۔ موٹر کی پچھلی سیٹ پر بلوچی کام کی دو گدیاں پڑی تھیں۔ ونڈ اسکرین کے آگے، ایک خوبصورت سنہرے بالوں والی گڑیا لٹک رہی تھی۔ آگے انگریزی کے دو تین ناول پڑے تھے۔ ایک ڈبہ ٹشو پیپرز کا اور ایک ایئر فریشنر کی بوتل بھی نظر آ رہی تھی۔ باسمہ خوشبو کی دیوانی تھی۔ اس لئے موٹر میں بیٹھتے ہی چاروں طرف خوشبو چھڑک لیا کرتی تھی۔ اور بار بار ٹشو پیپر سے پسینہ صاف کیا کرتی تھی۔ اس کی آج بھی وہی عادت تھی۔۔۔۔ اُجلی اُجلی۔۔۔۔ مہکی مہکی۔۔۔۔۔

پھر ایک اندرونی اُبال اور تجسس کے مارے وہ موٹر کے نزدیک چلا گیا۔ موٹر کی سطح پر ہاتھ پھیر کر دیکھا ـــــ جیسے کہ باسمہ کے بدن کو چھو رہا ہو ـــــ پھسلتے پھسلتے ہاتھ دروازے کی کنڈی کو جا لگا ـــــ دروازہ کھٹ سے کھل گیا ـــــ وہ ڈر گیا۔

پھر مسکرایا ـــــ یہ عورتیں کتنی بھی ہوشیار بننے کی کوشش کیوں نہ کریں ـــــ عورتیں ہی رہتی ہیں۔ بھلا اس طرح ایک چالو سڑک پر گاڑی لاک کئے بغیر چھوڑ جانا کہاں کی انسانیت ہے کوئی مرد غلطی نہیں کر سکتا کہ وہ جانتا ہے کہ کوئی "کس حد تک کمینہ ہو سکتا ہے؟"

اپنے اس ترے پر وہ خود ہی چونک بھی گیا اور گھبرا کر دروازہ پورا کھول دیا۔ اور بالکل غیر ارادی طور پر موٹر کے اندر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اندر سے چھڑکی خوشبو کے علاوہ باسمہ کی مخصوص خوشبو بھی آ رہی تھی۔

عین اسی وقت باسمہ بینک کے اندر سے نکلی اور پرس جھلاتی ہوئی اپنی موٹر کی طرف بڑھی ـــــ امان سیٹ پر بیٹھا بیٹھا منجمد ہو گیا۔ وہ اپنی موٹر کی طرف بڑھتی بڑھتی رک گئی۔ اور پھر چاروں طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اپنا مغالطہ دور کرنا چاہتی ہو۔ اگر یہ موٹر

جس میں کوئی اجنبی بیٹھا تھا، کسی اور کی تھی، تو اس کی اپنی موٹر کہاں تھی ـــــ؟"

پھر جھک کر اس نے نمبر پلیٹ کو دیکھا ـــــ اور جھنجلاتی ہوئی اپنی موٹر کی طرف بڑھی کسی اجنبی کی دیدہ دلیری پر اس کا خون کھول اُٹھا ـــــ نہ جانے کون احمق انسان تھا؟ اس کی پریشانی بھانپ کر امان نے سر باہر نکالا اور معذرت کے سے انداز میں بولا۔

"یہی آپ کی موٹر ہے؟"

باسمہ نے چابی کو مٹھی میں گھمایا اور اسے گھورتی ہوئی آگے بڑھی۔ جھٹکے سے دروازہ کھول کر تنی تنی سی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی کہ شاید کوئی منچلے صاحب خواہ مخواہ لفٹ لینا چاہتے ہیں۔ اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس کا مزاج درست کرنا ضروری تھا۔ سر اٹھا کر غور سے دیکھا تو اس کی پیشانی کے بل لرز کر رہ گئے۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ـــــ چابی اسٹارٹ تک جا نہ پائی ـــــ اب منجمد ہونے کی اس کی باری تھی۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح امان سے ملاقات ہو جائے گی ـــــ اتنے ڈرامائی انداز میں ـــــ امان کی اس بے تکلفی پر اسے حیرت ہوئی ـــــ اور موٹر کھلی چھوڑ کر جانے پر افسوس ہوا ـــــ کچھ لمحوں تک وہ بالکل بولنے کے قابل نہ ہو سکی۔

تھوڑی دیر بعد امان رُک رُک کر بولا۔

"اس طرح موٹر کھلی چھوڑ کر نہیں جاتے ـــــ کوئی بھی ناخوشگوار حادثہ ہو سکتا ہے۔"

باسمہ نے کار اسٹارٹ کر دی۔ اب وہ حواسوں میں آ چکی تھی۔ بڑے نپے تلے لہجے میں بولی۔

"یہ بھی۔۔۔ ایک ناخوشگوار حادثہ ہے ـــــ"

امان آیا تو تھا باسمہ کو چھو کے لگانے، دل کی آگ بجھانے ـــــ مگر اس کے قریب بیٹھتے ہی موم کی طرح پگھلنے لگا۔ الفاظ پگھل پگھل کر اس کی گویائی کو سلب کرنے لگے تو باسمہ پھر بولی۔

"مہربانی کر کے آپ اُتر جائیں۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ نہیں اُتروں گا تو پھر تمہارا ردِ عمل کیا ہو گا؟"

باسمہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ اور بولی۔

"مجھے یقین ہے آپ ضرور اُتر جائیں گے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں آپ کو اس موٹر میں بیٹھنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے لہجے میں اعتماد اور زہر دونوں تھے۔

امان لرز گیا ـــــ اسے یوں لگا ـــــ آج پہلی بار وہ نصیب کی بلندیوں سے گرا ہے۔

روتے ہوئے لہجے میں ٹوٹ کر بولا۔

"چند باتیں کرنے کی اجازت دو باسمہ۔ پھر میں خود ہی اُتر جاؤں گا"

"کچھ عرصہ ہوا مجھے ڈرامائی انداز سے بالکل نفرت ہو گئی ہے" باسمہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی چلا دی۔ میں نہیں جانتی کون سی باتیں رہ گئی ہیں۔ جو آپ کو پانچ چھ سال کے بعد یاد آ گئی ہیں اور اگر ہیں تو آپ کو قانون کی رو سے میرے وکیل کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا چاہیئے تھا۔

"بالکل امیر عورتوں کی طرح گفتگو کر رہی ہو۔ تمہارا تو لب و لہجہ ہی بدل گیا ہے" امان نے بڑے یتیم سے انداز میں کہا۔

"کسی کا دل بدلتا ہے، کسی کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ دُنیا کی ہر شے بدل جانے پر قادر ہے"

یکایک امان کے لہجے میں روٹھا ہوا، ٹوٹا ہوا بچہ آن بیٹھا ـــــ

"ایسے لگتا ہے جیسے تم اپنی موجودہ زندگی سے بہت خوش ہو تم بہت مطمئن نظر آ رہی ہو۔ کیا تمہارا شوہر بہت اچھا ہے ـــــ بہت پیار کرتا ہے تم سے؟"

(اُلّو کے پٹھے۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ـــــ امان نے اپنے کان خود کھینچے ـــــ تم اس عورت کو تکلیف پہنچانے آئے تھے اور گھگھیا کیوں رہے ہو؟ ذلیل لگ رہے ہو)

"جی، میرا شوہر بہت اچھا ہے اور مجھ سے بہت پیار کرتا ہے ـــــ اور اُسے بچے کی آرزو بھی نہیں ـــــ!"

اب کے برچھی باسمہ نے پھینکی تھی۔

اور اس کے سارے تیر خطا ہو گئے تھے۔

وہ جھوٹ نہ بول سکا ـــــ کوئی بات نہ بنا سکا ـــــ مجبور چور کی طرح، اپنے دل کا ہر راز اُگلنے لگا۔

"باسمہ! مجھے دیکھو۔ میں خوش نہیں ہوں" باسمہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا وہ واقعی خوش نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ نہ چہرے پر شگفتگی تھی، نہ شادابی۔ آنکھوں کے گرد اور ٹھوڑی کے نیچے بے شمار لائنیں پڑ گئی تھیں ـــــ آدھے بال سفید ہو گئے تھے۔ جسم موٹا اور بھدا لگ رہا تھا ـــــ کوٹ میں سے توند باہر نکلی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ بے ڈھب اور ناخن پیلے تھے ـــــ کپڑے بھی کوئی خاص صاف نہیں تھے ـــــ جوتے پر پالش نہیں تھا ـــــ جس طرح پرانے گھر کا فرش ہر جگہ سے اکھڑا ہوا ہوتا ہے ـــــ اسی طرح امان کی شخصیت پر اُدھڑ جانے کے نشانات تھے۔ تبھی تو اس ادھیڑ عمر آدمی کو باسمہ دور سے نہیں پہچان سکی تھی۔ اس کی بڑی دلکش شخصیت تھی اور من موہنی صورت تھی۔ بانکا چھیلا تھا۔ خوش مذاق اور خوش مزاج تھا ـــــ صبح کو خوشبوؤں میں نہا کر جاتا تھا۔ باسمہ نے اسے ایسے رکھا ہوا تھا جیسے ماں اکلوتے بیٹے کو بنا سنوار کے رکھتی ہے ـــــ اب تو وہ کسی غریب گھر کا گیارھواں بچہ لگ رہا تھا ـــــ ذرا چربی چڑھتی تو باسمہ اس کے لئے پرہیزی کھانا بنانے لگتی ـــــ ذرا جسم ڈھیلا ہوتا تو وہ اس سے صبح کو ایکسرسائز کرواتی ـــــ ذرا حلقے نمایاں ہونے لگتے تو رات کو اسے دودھ جلیبیاں کھلاتی اور صبح کو گلاب کے عرق سے منہ دھلاتی ـــــ جس طرح کوئی موتیا کا نازک پودا اپنے کچے صحن میں لگا لیتا ہے اور پھر اسے ہاتھوں کی اوٹ دے دے کر سینچتا ہے ـــــ اس طرح باسمہ اسے سینچ رہی تھی۔ جس طرح تند ہواؤں میں کوئی بیرا گن اپنا چراغ اوڑھنی کی اوٹ میں کر لیتی ہے، اسی طرح باسمہ نے اسے حالات کی گرمی سے بچایا ہوا تھا۔

اُف کس قدر بدصورت اور تباہ حال لگ رہا تھا۔ یہ آدمی۔ جیسے باسمہ جیسی شہزادی

کا ملازم ہو۔

"باسمہ"، وہ شرمندہ سے لب و لہجے میں بولا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ بچے اس دُنیا کی سب سے بڑی سچائی ہیں اور کسی انسان کی خوشیوں کی معراج ہیں۔ جب تم میرے ساتھ رہتی تھیں تو کبھی کبھی بچے کی خلش مجھے بھی تڑپایا کرتی تھی۔ مگر محض تمہاری خوشنودی کی خاطر میں اس حقیقت سے آنکھیں پھیر لیا کرتا تھا۔ جب بی اماں نے میرا گھیراؤ کر لیا اور میرے اردگرد فہمیدہ کا دائرہ تنگ کرنے لگیں تو میری خفتہ خواہش بھی جاگ اُٹھی ـــــ ایک جوان عورت کا قرب اور ایک بچے کی آرزو۔ دونوں نے مل کر میری آنکھیں بند کر دیں۔ میں نے اپنے ذہن کی آواز سننے سے انکار کر دیا اور دل کے اشاروں پر چلنے لگا ـــــ مرد کی سوچ دور تک نہیں جا سکتی۔ اسے صرف آج نظر آتا ہے ـــــ عورت کی طرح کل اس کا خزانہ نہیں ہوتا۔ کہ وہ اسے سنبھال کر رکھ لے۔ میں وہ۔۔۔ نااہل بازیگر تھا۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی خواہشات کو اپنی انگلیوں پر نچاتا رہے گا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ چپ ہو گیا۔۔۔ جب باسمہ کچھ نہیں بولی تو پھر شروع ہو گیا۔

شاید تم جانتی ہو گی کہ اب میرے چار بچے ہیں اور پانچواں پیدا ہونے والا ہے ـــــ میں نے دنیا کی سب سے بڑی خوشی دیکھ لی ہے ـــــ پھر میں کیوں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں ـــــ اجڑ گیا ہوں ـــــ؟ منزل پر پہنچنے کی بجائے بھٹک کیوں رہا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں ـــــ فہمیدہ جتنی بدصورت لڑکی ہے اتنی ہی بدمزاج بھی ہے۔ ہر بچے کی آمد اس کی تنک مزاجی میں اضافہ کرتی جاتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے بچے پیدا کر کے اس نے مجھے خرید لیا ہے۔ اسے اپنی ذات کے سوا کسی کا خیال نہیں ہوتا ـــــ وہ انتہائی بداخلاق پھوہڑ اور بدسلیقہ لڑکی ہے۔ وہی گھر جو تمہاری موجودگی میں جنت کا ٹکڑا لگتا تھا ـــــ اب گندگی کا نمونہ لگتا ہے۔ مجھے چاندنی کے سائے میں رہنے کی عادت تھی۔ مجھے تم نے کہکشاں پر لٹایا تھا۔ مجھے تم نے ذہنی و جسمانی آسودگی کا امرت پلایا تھا ـــــ

تم نے میرے اتنے ناز اٹھائے تھے کہ میں شیشے کا شہزادہ بن گیا تھا ـــــ جو ٹھیس

لگنے سے چیخ جاتا ہے۔ فہمیدہ کم فہم اور جھگڑالو عورت ہے ـــــ وہ چاہتی ہے اس کے ناز اٹھاؤں ـــــ نہیں اٹھا سکتا تو اپنی بدزبانی سے میرا جگر زخمی کر دیتی ہے۔۔۔ میں گھر سے دور رہتا ہوں۔ باہر آوارگی کرتا ہوں ـــــ رات بھر سکون سے سو نہیں سکتا۔ گندے غلیظ بچے مجھے خوشی نہیں دے سکتے ـــــ کوئی میرا خیال نہیں رکھتا ـــــ کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔۔۔۔"

وہ چپ ہو گیا۔

جیسے کوئی گلے میں اپنی چیخ دباتا ہے۔۔۔۔

پھر اپنی آواز پر قابو پا کر بولا۔

"بہت دنوں بعد مجھے پتہ چلا ـــــ کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ایک خوش اخلاق، نیک اطوار، شفیق اور خدمت گزار بیوی ہے ـــــ تمہارا سلیقہ، تمہارا طریقہ تمہارا چلن ـــــ تمہاری محبت ایک ایک بات مجھے یاد آ آ کر رلاتی رہی۔۔۔۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکا باسمہ ـــــ اور آج بے اختیار تمہیں دیکھ کر ادھر آ گیا ہوں اور اعتراف کر رہا ہوں کہ بچے کا نہ ہونا اتنی بڑی محرومی نہیں۔ جتنی بڑی بدنصیبی تمہارے جیسی عورت کو ٹھکرانا ہے۔"

"اب آپ کہاں اُتریں گے؟"

اسی سکون سے باسمہ نے پھر پوچھا۔

"کیا یہ میری بات کا جواب ہے؟" امان نے غرا کر کہا۔ "اس وقت سے میں جھک مار رہا ہوں؟"

"کیا یہی وہ باتیں تھیں جو آپ کرنا چاہتے تھے؟"

اس کا لہجہ کیسا اجنبی تھا ـــــ!

امان کو شرم سی آنے لگی ـــــ "ہاں ـــــ" اس نے کہا۔ "کہنا تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ مگر تمہاری بے حسی نے میری زبان بند کر دی ہے۔"

باسمہ تھوڑا سا مسکرائی۔

"تم نے کہا تھا نا؟" امان جلدی سے بولا۔ "کہ تم میرے بغیر جی نہ سکو گے۔" تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب میں زندہ تو ہوں مگر۔۔۔" پھر اس نے باسمہ کو غور سے سر سے پیر تک دیکھا۔ اور تلخی سے بولا ـــــ "مگر تم خوش ہو۔ مسرور ہو ـــــ تمہارے حلیے سے نظر آرہا ہے ـــــ ورنہ تم اتنی بنی سنوری کبھی نہ ہوتیں ـــــ تم نے بھی تو کہا تھا اگر میرے علاوہ کوئی اور مرد تمہیں چھو لے گا تو تم مر جاؤ گی ـــــ عورتیں کس قدر جھوٹی اور ہرجائی ہوتی ہیں۔ سچ ہے عورت صرف دولت پر مرتی ہے۔ تم نے ایک امیر آدمی سے شادی کر لی اور تمہیں وہ غریب آدمی بالکل بھول گیا ـــــ موٹر لئے پھرتی ہو ـــــ اپنا چہرہ دیکھو۔ اتنا میک اپ تم پہلے کبھی نہیں کیا کرتی تھیں۔ اتنی دیدہ دلیر اور فیشن ایبل تم پہلے کبھی نہ تھیں۔ سچ بتاؤ کیا تمہیں میرا نعم البدل مل گیا ہے؟

"امان صاحب!" باسمہ نے گیئر بدلا اور بولی۔

"سب سے بڑی دولت قناعت کی دولت ہے۔ پر مرد دنیا میں اللہ کا خلیفہ بن کر بھی مطمئن نہیں ہوتا ـــــ جب کہ ایک عورت اگر بانجھ پیدا کر دی جائے تو وہ اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہو جاتی ہے۔ مرد کو اللہ کی رضا پر صبر نہیں آتا۔ اللہ کی بنائی ہوئی دنیا میں دخل اندازی کرتا رہتا ہے۔ اس لئے بے سکون رہتا ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت مطمئن اور مسرور ہوں اور اللہ کی احسان مند بھی ـــــ!"

"کیا تمہارا شوہر تم سے بے حد محبت کرتا ہے؟" امان نے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا ـــــ اور پھر اپنے سوال کا زخم خود ہی کھا کر جواب دے بیٹھا۔

"کوئی بدقسمت مرد ہو گا ـــــ جو تمہیں حاصل کر کے تم سے محبت نہ کر سکے۔ تم تو خود سر تا پا محبت ہو۔"

اسٹیئرنگ پر باسمہ کے ہاتھ لرز اٹھے ـــــ اب معاملہ برداشت سے باہر ہوا جا رہا تھا اور ممکن تھا کہ ضبط کے اس سنگم پر کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ بڑی دیر سے وہ اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی ـــــ اور الفاظ ڈھونڈ رہی تھی اپنی کہانی کے حسب

حال ـــــ

اس دن جب اماں بی نے اسے نیم غشی کے عالم میں باپ کے گھر پہنچا دیا۔ تو دنیا اس کے آگے اندھیر ہو گئی۔ ماتم کرنے کی ستمگر نے مہلت نہ دی تھی اور جلدی جلدی کتابِ زندگی کے ورق پلٹ گئے تھے۔ اس لئے اس نے چپ کا روزہ رکھ لیا۔

مگر کئی دن تک وہ بستر پر پڑی امان کا انتظار کرتی رہی تھی کہ شاید صبح کی بھول شام کو یاد آجائے ـــــ نو سال کی تین ہزار دو سو پچاسی راتیں اس کے ساتھ بسر کی تھیں انہی راتوں میں کوئی شوخ رات خندی بالک بن کر اس کی انگلی پکڑ لائے۔۔۔ اپنی کج ادائی پر اسے رونا آجائے اور خود چلا آئے ـــــ مگر اماں بی کا انتظام کچھ ایسا کچا نہیں تھا! انہوں نے پورے چار ماہ کے لئے امان اور فہمیدہ کو اس شہر سے باہر اپنی بہن کے پاس بھیج دیا تھا۔ فہمیدہ کے پاس ہدایات کی گٹھڑی بھی تھی۔ البتہ طلاق کے باقاعدہ کاغذات گھر آگئے تھے۔

آپا جی کی زبان مفلوج ہو چکی تھی۔ گو بول نہیں سکتے تھے، مگر دیکھ تو سکتے تھے۔ باسمہ جانتی تھی کہ آپا جی جاننے والے ہیں۔ مگر اس نے ان سے یہ خبر چھپائی نہیں ـــــ بلکہ انہیں سب کچھ بتا دیا ـــــ آپا جی کی بولتی آنکھیں لمحے بھر کو ساکت ہو گئیں ـــــ پھر انہوں نے اپنے وکیل کو بلا بھیجا ـــــ پہلے اپنی ساری جائیداد وقف کر کے جا رہے تھے۔ اس میں سے کچھ فلیٹ اور دوکانیں باسمہ کے نام کر دیں۔۔۔ نئے سرے سے وصیت نامہ لکھوایا۔ نئے سرے سے ہدایات جاری کیں۔

باسمہ کی عدت ختم ہو گئی ـــــ مگر آپا جی کا دم اٹکا رہا۔ باسمہ کو اکثر یوں محسوس ہوتا کہ آپا جی پرواز کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کے پر اڑنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ شاید وہ آپا جی کی پرواز میں حائل ہو رہی تھی ـــــ ان کی مردہ آنکھوں میں ایک زندہ سوال تھا جیسے کہنا چاہتے ہوں۔

"مرنا چاہتا ہوں۔ مر نہیں سکتا۔ یوں میرے سامنے بیٹھی رہو گی تو کیسے مروں گا۔؟"

آپا جی کے پاس جو وکیل صاحب آتے تھے ان کا نام بھی عبدالوکیل تھا۔ اور وہ شہر کے نامی گرامی وکیل تھے۔ عمر میں آپا جی سے چھوٹے تھے۔ مگر آپا جی سے دوستانہ مراسم

ایک عرصے سے تھے۔ بہت زیادہ لمبے اور دُبلے پتلے تھے۔ ہاتھوں کی رگیں بھی صاف نظر آتی تھیں ـــــ رنگت ان کی زرد زرد سی تھی ـــــ اور آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔

ایک دن جب وہ کاغذات کے پلندے ابّا جی کے پاس رکھ کر جانے لگے، تو باسمہ ان کے پیچھے لپکتی چلی گئی اور بولی۔

"وکیل صاحب، ایک ذاتی سا سوال کرنا چاہتی ہوں۔"

"فرمائیے ـــــ" وکیل صاحب موڑ میں بیٹھتے بیٹھتے رُک گئے۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی اب تک ـــــ؟" وکیل صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا ـــــ ناگواری کی شکن ان کی پیشانی پر نمودار ہوئی ـــــ مگر آہستہ سے بولے۔

"کوئی مجبوری تھی۔" اور موڑ میں بیٹھ گئے۔

باسمہ دوسری طرف سے دروازہ کھول کر ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"کیا آپ نے کسی کو دھوکہ دے رکھا تھا ـــــ؟"

وکیل صاحب کو باسمہ کی یہ دخل اندازی بُری لگ رہی تھی ـــــ

"نہیں۔" وہ سختی سے بولے ـــــ "بعض لوگ محرومیوں کے ساتھ پیدا کئے جاتے ہیں۔ اگر میں شادی کا اہل ہوتا تو مناسب وقت پر رشتوں کی کمی نہ تھی۔"

"ہاں وکیل صاحب! باسمہ جلدی سے بولی۔ "قدرت بہت انصاف پسند ہے۔ وہ صرف مردوں پر ایسے ظلم نہیں ڈھاتی، عورتوں پر بھی ڈھاتی ہے۔ میں بھی پیدائشی بانجھ ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے طلاق ہوگئی ـــــ آپ نے شادی نہیں کی کہ ایسی بدمزگی سے بچنا چاہتے تھے۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے شادی کو نبھانے کی کوشش کی، مگر بربادی میرا مقدر بن گئی۔"

وکیل صاحب نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی دیانت داری سے بولی۔

"آپ میرے ساتھ شادی کر لیں۔"

"بی بی، آپ ہوش میں ہیں۔"

"بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کہہ رہی ہوں۔ میرے باپ کا دِل مجھ میں اٹکا ہے۔ اُن

کو سُرخرو کرنا چاہتی ہوں۔

آپ تو خود قانون دان ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک عورت جوان ہو۔ خوبصورت ہو اور پھر طلاق شدہ بھی ہو اور اس کے سر پر شرعی سائبان نہ ہو تو یہ دنیا اسے الزامات کے خنجر سے لہولہان کرتی رہتی ہے۔ اس کو ناکردہ گناہوں کی سلاخوں سے داغا جاتا ہے ـــــ اس کے اُجلے دامن پر پاپ کی پیک پھینکی جاتی ہے ـــــ اگر آپ مجھ سے شادی کر لیں گے تو مجھے ایک باعزت اور شریف آدمی کا تحفظ مِل جائے گا۔ معاشرے کی سب سے بڑی سیکورٹی مِل جائے گی۔

ہے تو میری خود غرضی ـــــ مگر آپ سے کیا چھپانا ـــــ؛ میں نے ہوش سنبھالتے ہی امان کو اپنا دین و ایمان سمجھا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی دوسرا آدمی کبھی مجھے چھُو بھی سکتا ہے ـــــ اگر کسی دِن، کسی نے مجھے غلطی سے بھی چھُو لیا تو میں مر جاؤں گی۔ اس بات کا خطرہ آپ کے ساتھ رہنے میں تو نہیں نا؟ ـــــ اس لئے تو جھولی پھیلا کے آپ کے سامنے آ گئی ہوں۔ بھلا کبھی کوئی عورت یوں سوالی بن کے بھیک مانگتی ہے۔"

"اس کے عوض میں آپ کو کیا دوں گی؟" ـــــ آپ کے گھر میں آپ کی خادمہ بن کر رہوں گی۔ آپ بیمار رہتے ہیں۔ آپ کو ایک نرس کی ضرورت ہوگی۔ ایک تنہا مرد نرس رکھنے کا الزام کہاں اٹھا سکتا ہے ـــــ مجھے نرس بنا کر رکھ لیجئے۔ آپ کو ایک منشی کی ضرورت ہوگی ـــــ چپراسی کی ضرورت ہوگی ـــــ بی اے تک میری تعلیم ہے ـــــ آپ کے دفتر کا بہت سا کام کر سکتی ہوں۔ آپ کے مؤکلوں سے مل سکتی ہوں ـــــ اور بھی کئی چھوٹے موٹے کام نکل آئیں گے ـــــ بڑھاپے میں کسی دوست کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ تنہا گھر میں دم گھٹتا ہے اور کیا آپ کے اطمینان کے لئے اتنا کافی نہیں کہ آپ ایک بے آسرا عورت کو سہارا دے رہے ہیں ـــــ میں اپنی ہر سانس کے ساتھ آپ کو دعا دوں گی۔ دعا کی تو ہر خاکی کو ضرورت ہوتی ہے۔

دُعا لینا چاہتے ہیں آپ وکیل صاحب؟"

باسمہ نے سب کچھ ایک ہی سانس میں اُگل کے وکیل صاحب کی طرف

رحم طلب اور پُرامید نظروں سے دیکھا۔

وکیل صاحب نے باسمہ کی آنکھوں میں دیکھا ـــــ اس کے سچے اور صبیح چہرے کو پرکھا اور پھر مُسکرا دیئے۔

دوسرے دن چند احباب کی موجودگی میں نکاح ہوگیا۔

ابا جی بول نہ سکے۔ مگر ٹکر ٹکر باسمہ کو دیکھتے رہے ـــــ کہ اس نے ایک مریض اور بڑی عمر کے آدمی کا ہاتھ کیونکر پکڑ لیا۔ اور تیسرے دن ابا جی نے زبان کے ساتھ آنکھیں بھی بند کرلیں۔

جانے خوشی تھی یا صدمہ ـــــ؟

اطمینان پاتے ہی چلے گئے . . . . .

باسمہ وکیل صاحب کے گھر آگئی۔ گھر ویسا ہی تھا جیسا عورت کے بغیر ہوتا ہے۔ میلا کچیلا ـــــ اور دوائیوں کی بے شمار خالی اور بھری ہوئی بوتلیں۔

باسمہ کو ستھرائی اور پاکیزگی کا جنون تھا۔

گھر دُلہن بن گیا تو وکیل صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

بولے۔

"کون بدقسمت تھا وہ جس نے تمہیں طلاق دے دی ـــــ مجھے یوں لگتا ہے اب سے پہلے میں قبرستان میں رہتا تھا۔ اگر ایک خوب صورت گھر میں، ایک سلیقہ شعار عورت رہتی ہو اور لوگ اسے تمہاری بیوی کہیں تو زندہ رہنے کے لئے یہی احساس کافی ہے ـــــ باسمہ تم نے میری عمر بڑھا دی ہے۔"

ویسے لوگوں نے وکیل صاحب اور باسمہ کو کم باتیں نہیں بنائی تھیں۔

"کھوسٹ کو عشق کا سودا ہوا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے تو سہرا باندھنے کا خیال آگیا۔"

"اسے نہیں۔ ایک آدمی کا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ روز آنا جانا تھا وہاں ـــــ اس کی بیوی اُڑا لایا ـــــ"

دیکھو تو اس کے کرتوت ـــــ کسی شادی شدہ جوڑے کو طلاق پر آمادہ کرلینا ان وکیلوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"سچ ہے مرد کا کسی عمر میں اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔"

"اور پھر باسمہ سے کون خوش تھا ـــــ؟"

"چار دن بھی نہ گزارے گئے شوہر کے بغیر ـــــ عدت ختم ہوتے ہی شادی رچالی۔ سُنا ہے پہلی شادی عشق کاری کا نتیجہ تھی۔ خوبصورت عورتوں کو شادیاں رچانے کا شوق ہوتا ہے۔"

"اللہ جانے بیچ میں کیا بات تھی۔ سنا ہے وکیل صاحب سے اس کا پرانا یارانہ تھا۔ باپ کے پاس آیا تھا۔ بس وہیں سے کوئی گڑبڑ شروع ہوگئی اور بات طلاق تک پہنچ گئی۔ تبھی تو جھٹ اس نے باپ کی عمر کے آدمی سے شادی کرلی۔"

"باپ بچارا اسی صدمے سے مرگیا۔ اب دوسرے شوہر کو کھائے گی۔"

باسمہ ان سب باتوں سے بے پرواہ ـــــ دن بھر گھر کو بناتی، سنوارتی۔ شام کو وکیل صاحب دفتر گھر پر ہی لگاتے تھے۔ ان کی منشی گیری کرتی۔ ان کے مہمانوں کو چائے بنا بنا کر پلاتی۔ ان کی فائلیں ترتیب دیا کرتی۔

رات گئے ان کو بہت سی دوائیاں کھلا کر پانی کی بوتل میز پر رکھ کے۔ شب بخیر کہہ کے اپنے بیڈ روم میں آجاتی۔ بیڈ روم کی ہر شے سفید تھی۔ مصفا اور معصوم ـــــ بستر پر رات گئے تک لیٹ کر وہ کتابیں پڑھا کرتی ـــــ اور پھر اپنی پرانی محبت کو خراج دینے کے لئے بلا ناغہ آنسو بہاتی اور سو جاتی۔

کبھی کبھی وکیل صاحب رات کو اُٹھ کر اسے دیکھنے آتے تھے۔

وہ سوتے میں انہیں بہت اچھی لگا کرتی تھی۔ اپنے ہلکے زرد رنگ کے نرم تکیئے کو دونوں بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگا کے اپنا ایک رخسار اس پر ٹکا دیتی تھی۔ سوتے میں وہ معصوم بچی لگا کرتی تھی۔ جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو ـــــ اور وہ مچلتے مچلتے سو گئی ہو۔ کبھی کبھی اس کی لمبی پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسو وکیل صاحب کو صاف نظر آجاتے شاید وہ سوتے میں مسلسل روتی تھی ـــــ کیونکہ وہ جاگتے میں مسلسل مسکراتی رہتی تھی۔ وکیل صاحب بے خودی کے عالم میں اسے دیکھتے رہتے۔ بڑھ کر کبھی نہیں چھوتے

تھے ـــــ وہ جانتے تھے۔ چھونے سے یہ پری مرجائے گی ـــــ بڑی نازک ہے سانس کی گرم ہوا بھی نہیں سہہ سکتی۔ وہ اسے ہمیشہ زندہ دیکھنا چاہتے تھے ـــــ اس لئے اکثر دیکھ کر چلے جاتے تھے۔

رات بھر رونے والی باسمہ صبح تازہ دم ہوکر اٹھتی۔ نئے سرے سے کاموں کی ابتدا کرتی۔ دس گیارہ بجے کاموں سے فارغ ہوکر وہ بہترین لباس پہنتی ـــــ خوب قرینے سے میک اَپ کرتی، اپنی آنکھوں کو مسکارے سے سجاتی ـــــ ہونٹوں، رخساروں، پپوٹوں پر گلابیاں پھیر دیتی ـــــ وکیل صاحب کے کورٹ جانے کے بعد ـــــ وہ بھی اپنے اوپر خوشبوؤں کی بارش کرتی۔۔۔۔ اور پھر موٹر نکال کر باہر نکل جاتی۔ وکیل صاحب نے اپنے بہت سے کام اس کے سپرد کر رکھے تھے۔ یعنی بنکوں میں جانا ـــــ ڈاکٹروں سے ربط رکھنا۔ ٹی وی اور موٹر کے لائسنس بنانا ـــــ وکیل صاحب کے دفتر کا حساب کتاب لکھنا ضروری خطوں کے جواب دینا، ان کے عزیزوں سے رابطہ رکھنا ـــــ وکیل صاحب کی زندگی کے کئی شعبے اس نے سنبھال رکھے تھے۔ ہر کام خوش اسلوبی سے کر رہی تھی۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر نظر آتی تھی کہ وہ وکیل صاحب کی واقعی مشکور تھی ـــــ اگر وہ اس پر چادر نہ ڈالتے تو اس کا کیا حشر ہوتا ـــــ خوب میک اَپ کرتی تھی کہ چہرے کی کوئی سلوٹ دل کی شگفتگی کا راز نہ فاش کردے۔ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی کہ اس کا نام باسمہ تھا۔ اور باسمہ کا مطلب ہے "مسکرانے والی"۔ ـــــ مسکرانے والیاں تو ہر دل کو اچھی لگتی ہیں ـــــ ان کا دل مسکرائے یا نہ مسکرائے۔

اس پر آج اس ظالم نے سرِراہ اسے پکڑ لیا تھا اور اس کے پُرسکون سمندر میں لہروں کا مدوجزر پیدا کرنا چاہ رہا تھا۔

"امان!" باسمہ نے پُرسوز ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"بی اماں کہا کرتی تھیں ـــــ بانجھ عورت آسیب زدہ مکان کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں کوئی مرد صرف پل دو پل ہی ٹھہر سکتا ہے۔"

"وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں آسیب زدہ مکان کو کتنا بھی سجائیں، قمقموں اور فانوسوں

سے مالا مال کردیں ـــــ آرام دہ بنائیں ـــــ جنت نظارہ بنائیں ـــــ خوشبوؤں میں بسائیں ـــــ تب بھی کون بسیرا لیتا ہے ایسے مکان میں ـــــ

سنسناہٹوں کی چیخیں اور وسوسوں کی آہٹیں اسے بھاگ جانے پر مجبور کرتی ہیں۔

نو سال تک میں اپنے جسم کے مکان کو سجا کے بیٹھی رہی۔۔۔۔

پھر ایک دن تم نے مجھے آسیب زدہ ہونے کا احساس دِلا دیا ـــــ کیا جینے کے لئے اتنا حوصلہ کافی نہ تھا۔۔۔۔

ایسے مکان کی مالیت اور کرایہ کم کردینے سے، کچھ مجبور لوگ بلاؤں کے ساتھ بسر کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں ـــــ"

"باسمہ۔۔۔۔"

اب کے امان نے بڑی محبت سے کہا۔

خوش تم بھی نہیں ہو شاید ـــــ میں نے تمہیں ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے بچھڑ کر ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں ـــــ آؤ اچھے دوستوں کی طرح دوبارہ ملا کریں۔"

"اچھے دوستوں سے تمہاری کیا مراد ہے ـــــ؟"

"ہونی انہونی تو نہیں ہوسکتی۔ مگر ہم اپنی زندگی کا کچھ وقت خوب صورتی سے ضرور گزار سکتے ہیں۔"

"ایک دم باسمہ کا پاؤں بریک کو لگ گیا اور کار پچھلی کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ تب اس نے آہستہ سے اپنی موٹر اس خطرناک موڑ سے نکالی اور ایک کونے میں کھڑی کردی۔ اور اپنی خوبصورت گیلی گیلی آنکھوں پر اجنبیت کی کالی عینک چڑھا کر بولی۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ لہورونے والی آنکھوں کو، نت برسنے والی پلکوں کو مسکارے کا غسل دیا جاتا ہے۔ سسکیاں بھرنے والے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہہ جمائی جاتی ہے ـــــ اور داغ داغ دل کو خوبصورت ملبوسات میں لپیٹ دیا جاتا ہے ورنہ یہ دُنیا جینے کا حق چھین لیتی ہے۔"

تھوڑی دیر کے لئے وہ رُک گئی جیسے اپنے آنسو ضبط کر رہی ہو۔ پھر بولی۔

"امان!

طوائف اور عورت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مرد ـــــ اس فرق نہیں پہچان سکتا۔ اس کے خمیر میں خود غرضی کے عناصر زیادہ شامل ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت دونوں ہی ایک مکان کی مانند ہوتے ہیں۔ مگر فرق میں تمہیں بتاتی ہوں۔ مرد ایک ایسا مکان ہے جو بار بار اپنے مکین بدلنا چاہتا ہے۔ نت نئے کرائے دار بدل کے اسے مزہ آتا ہے۔ وہ پرانے لوگوں سے جلدی بیزار ہو جاتا ہے ـــــ مگر عورت ـــ ایک ایسا مکان ہے جو زندگی میں صرف ایک بار آباد ہوتا ہے ـــ ایک ہی بار مکین آتا ہے ـــ اور اس میں سما جاتا ہے ـــــ اگر وہ پہلا مکین چھوڑ کر چل دے تو عورت اپنی مرضی سے آسیب زدہ مکان بن جاتی ہے ـــــ تاکہ کوئی دوسرا اس کے اندر قدم نہ رکھ سکے۔ میں نے تم پر احسان کرنے کے لئے تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتایا ـــــ ایک فلسفہ سمجھایا ہے کہ میں نے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ کیوں کر سیکھا۔

تمہارے جانے کے بعد اپنے تن کے اس مکان کو مقفّل کر دیا ہے ـــــ اور اس کی چابی یادوں کے بچھواڑے پھینک دی ہے ـــــ پھر وقتاً فوقتاً میں نے اس قفل پر اپنی محرومیوں کے اتنے آنسو بہائے ہیں کہ یہ تالا زنگ آلود ہو گیا ہے۔ محبت کے زنگ آلود قفل کو دنیا کی کسی زبان کی حلاوت نہیں کھول سکتی ـــــ اس کو توڑنا پڑتا ہے ـــــ جو صرف موت کا پیغامبر اپنی پہلی ضرب سے توڑ دیتا ہے۔

میرا شوہر ایک شریف آدمی ہے ـــــ میرا اس کے ساتھ ایک معاہدہ ہے ـــ میں مقفّل در کے اندر بیٹھی ہوں، مجھے دنیا کے شور و شر سے کچھ مطلب نہیں.... اسی لئے تو مطمئن ہوں کہ چوری کا کھٹکا نہیں ہے۔

کل رات تک میں ہر رات تمہاری یاد میں آنسو بہا کر سویا کرتی تھی۔ میں نے اپنے جی میں یادوں کا ایک تاج محل بنا لیا تھا ـــــ جس میں بچے کی ناآسودہ خواہش ممتاز محل کی طرح پڑی سوتی تھی ـــ اور ہر رات میں تمہاری یاد کے چند آنسو پھولوں کی جگہ اس کی

نذر کیا کرتی تھی امان!

ایسی گھٹیا بات کر کے تم نے مجھ سے یادوں کا وہ چراغاں چھین لیا ہے ـــــ آج کے بعد میں تمہیں اس طرح یاد نہ کر سکوں گی۔

مگر ـــــ ایک بات یاد رکھنا ـــــ قفل میرے تن پر اسی طرح رہے گا۔"

باسمہ نے دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھول دیا اور تیزی سے بولی۔

"اب تم جا سکتے ہو ـــــ!"

مَتھے دا تِلک بچاندی دَا
کِتے پیر تِلک نہ جاتے!

. . . . . .

جھانجھر دا شور لکاندی دا
کِتے پیر تِلک نہ جاتے!

. . . . . .

معمولی آدمی

لکڑی کے اس کابک نما اپارٹمنٹ میں لیٹی وہ صبح سے چھت کو تکے جا رہی تھی۔ اتنی خالی نظریں جیسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ دو دفعہ جونی آیا تھا۔ پہلے تو اُسے جگانے آیا تھا۔ اور دوسری مرتبہ اس کا حال پوچھنے آیا تھا ـــــ اس کی ایک آواز پر وہ یوں جاگ گئی، جیسے وہ سوئی ہی نہ تھی۔ حالانکہ رات کو اس نے اُسے ذہنی سکون کی گولیاں دے کر سُلایا تھا۔

جب اس نے دوبارہ آکر پوچھا "کیا حال ہے بھئی؟" تو اس نے آنکھوں کے اشارے سے کہہ دیا کہ ٹھیک ہوں۔

جونی دوڑ کر باورچی خانے میں چلا گیا تھا۔ شاید اُس نے چائے کی کیتلی لگا رکھی تھی اور اسے پانی کے اُبلنے کی آواز آ رہی تھی۔

قوسیہ کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ سوچے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے نا؟ ذہن میں شدید طوفان ہوتے ہیں۔ خیالات میں سُرخ آندھیاں چل رہی ہوتی ہیں ـــــ ذہنی کرب کے گرد باد سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اس وقت انسان چاہتا ہے۔ یونہی چت لیٹا رہے اور خالی خالی نظروں سے آسمان یا چھت کو گھورتا رہے۔

اتنا خالی النظر ہو کہ آسمان کو بھی اپنی سُبکی محسوس ہو۔

لیکن کیا وہ واقعی خالی النظر تھی؟

یا خالی الذہن تھی ؟

فرار کی یہ کوئی نئی کیفیت تھی شاید !

اُس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ بظاہر کیسا فضول سا کمرہ تھا ـــــ یہی بیڈ روم یہی ڈرائینگ روم اور یہی ڈائینگ روم۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا اسٹور تھا۔ جسے بوقتِ ضرورت گیسٹ روم کے طور پر استعمال کرلیا جاتا تھا۔ گھر میں ایک ہی غسل خانہ تھا! اور ایک چھوٹا سا کچن۔

جونی کے لئے تو یہ گھر کافی سے زیادہ تھا ـــــ تنہا رہتا تھا یہاں ـــــ اور آج تک ایسا کوئی مہمان نہیں آیا تھا۔ جس کے لئے اسٹور روم کو بیڈ روم بنانا پڑتا ـــــ ہاں رات جب قوسیہ اُس کے ہاں آگئی۔ تو اُس نے بیڈ کا فولڈڈ بیڈ اٹھایا اور خود یہی ادھر سونے چلا گیا۔ اس وقت قوسیہ بھی اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ نہ جانے کیسے یہاں آگئی۔

اور اب یہاں آکر، یہاں لے آنے والے سارے واقعات اسے یاد آرہے تھے گو ذہن اب بھی سُن تھا اور رو رو کر آنکھیں سوج چکی تھیں۔ مگر آنکھ کھلتے ہی وہ کچھ پُرسکون سی ہوگئی تھی۔ یہاں دیارِ غیر میں آج اگر جونی نہ ہوتا تو پھر اُس کا کیا حشر ہوتا۔ جونی پانچ سال سے یہاں بریڈ فورڈ میں رہ رہا تھا۔ یہ معمولی سا اپارٹمنٹ اس نے کرائے پر لے رکھا تھا اور ہزاروں، لاکھوں پاکستانیوں کی طرح مشینی انداز میں زندگی بسر کر رہا تھا۔

پہلے پہل جب اُسے معلوم ہوا تھا۔ کہ جونی ایسے گندے علاقے میں رہتا ہے تو اسے بہت گھن آئی تھی۔ جانے لوگ باہر جاکر اپنے وطن کو بدنام کیوں کرتے ہیں۔ جب اُسے اپنے وطن میں اچھی خاصی نوکری مل گئی تھی۔ رہنے کو شاندار گھر تھا۔ تو وہ یہاں رہنے کیوں چلا آیا ـــــ بریڈ فورڈ میں ہر وہ علت ہے جو پاکستان میں پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے کمتر کے ساتھ سمجھوتہ کرکے خود اپنی عزت کم کر رکھی ہے۔ یا شاید پاکستانیوں کو سستی رہائش یہیں میسر آجاتی ہے۔ اور پیسے بچانے کے لئے ادھر کا رُخ کرتے ہیں۔ مگر جونی پیسہ کمانے یہاں نہیں آیا تھا ـــــ نہ ہی دل بہلانے آیا تھا۔ ورنہ لندن کا رُخ کرتا ـــــ

بس بُزدل ہے جونی بھی ـــــ

اُس نے ٹھنڈی سانس چھوڑ کر چاروں طرف دیکھا۔

ایک صوفہ، ایک بیڈ، کھانے کی میز ـــــ کیسی بے سروسامانی تھی یہاں ـــــ سارا کام جونی خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اب تو کھانا بھی بہت اچھا پکانے لگا تھا۔

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ جونی ناشتے کی ٹرے لگائے اس کے کمرے میں آیا۔

"بھوک لگی ہے کہ نہیں ـــــ ؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"دیکھو اکتنا اچھا ناشتہ بنا کر لایا ہوں۔ اٹھو جلدی سے کلی کرکے ناشتہ کرلو۔"

"یہ ایک گولی میز پر رکھ دی ہے ـــــ ناشتے کے بعد کھا لینا ـــــ زیادہ پریشان نہ ہونا۔ میری ٹرین نکل جائے گی۔ اب چلتا ہوں۔ شام کو آؤں گا ـــــ

بھوک لگے تو اندر لٹن میں سینڈوچ پڑے ہیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت جو چاہو بنا لینا۔

اچھا ـــــ" وہ رُک گیا۔

"کچھ منگوانا ہو تو بتا دو ـــــ"

"کچھ نہیں ـــــ" اُس نے آنکھ کے اشارے سے کہا۔

"ارے بابا ـــــ کچھ منہ سے بھی بھولو نا ـــــ ؟ رات سے تمہاری آواز نہیں سُنی ـــــ کہیں ایسا تو نہیں کہ صدمے سے تم گونگی ہوگئی ہو۔ بول کر ذرا اپنی آواز سناؤ۔"

قوسیہ سوگواری سے ذرا سا مسکرائی اور پھر گرم بھاپ دیتی چائے کا پیالہ اٹھا کر مُنہ سے لگا لیا۔

"توبہ بابا۔ منت کرنے کا وقت بھی نہیں ہے" ـــــ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ "اندر والے سوراخ میں چابی لگائی ـــــ اندر سے لاک کرلینا۔ یہاں بھی پاکستانی رہتے ہیں۔" اُس نے آنکھ دبا کر کہا۔

"میں باہر سے خود کھول کر آجاؤں گا۔"

قوسیہ چپ چاپ بیٹھی چائے پیتی رہی۔ فرائی انڈوں کی بڑی پیاری خوشبو آرہی تھی۔ گرم گرم سنکے ہوئے توس اور مکھن اُس کی اشتہا کو تیز کرنے لگے۔ اس نے مکھن کا پیکٹ کھولا۔ اور ٹکڑوں پر لگانے لگی۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ جنم جنم کی بھوکی ہے ـــــ جانے

کب سے اُس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔

اور یہی سوچتے سوچتے اُس نے سارا ناشتہ ہڑپ کر لیا۔ ناشتہ کر چکنے کے بعد جیسے اس کے تن میں نئی توانائی آ گئی۔ آہ فاقہ کتنی بھیانک چیز ہے۔ وہ غربت کی وجہ سے ہو ـــــ یا شدتِ غم کی وجہ سے!

وہ غریب نہیں تھی۔ نادار نہیں تھی۔ انگلینڈ میں آئی ہوئی تھی۔ اور اچھے سے اچھے ہوٹل میں ٹھہرنے کی استطاعت رکھتی تھی۔ پھر بھی وہ تین دن سے بھوکی تھی۔ اور جسم کی وہ کیفیت تھی۔ جیسے میلوں دوڑتی آ رہی ہو ـــــ تھکن سے چُور چُور، آبلہ پا، بیدم، سانس چڑھی ہُوئی ـــــ

جونی نے بڑی عقلمندی کی جو رات اُسے یہاں لے آیا۔ ابھی ابھی جیسے وہ زندہ ہُوئی تھی۔

جھوٹے برتن اُٹھا کر باورچی خانے میں رکھے ـــــ غسلخانے میں جا کر گرم پانی کا نلکا کھولا۔ اور پھر نیم گرم پانی میں غسل کیا۔ تین دن بعد کپڑے بدلے۔ آئینے کے آگے کھڑے ہو کر کنگھی کی ـــــ چہرے پر کریم لگائی ـــــ بدن کس قدر ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ جیسے کنول ندی کی سطح پر تیر رہا ہو۔

اُف انسان ایک کیفیت سے کتنی جلدی تھک جاتا ہے۔ خصوصاً غم کی کیفیت سے۔ ایسے لگتا ہے۔ جیسے اُس پر سے صدیاں گذر گئی ہیں۔ وہ بوڑھا ہو گیا ہے ـــــ ہنسنے سے آدمی کبھی نہیں تھکتا۔ مگر مسلسل رونے سے تھک جاتا ہے ـــــ پھر غموں سے آنکھ چُرانے کے لئے اِدھر اُدھر سہارے ڈھونڈتا ہے۔

افوہ! کیسا غم کا پہاڑ ٹوٹا تھا اس پر، پردیس میں۔

اُس نے کرسی پر بیٹھ کر پشت پر سر ٹکا دیا۔

ایک دم دروازے پر نظر پڑ گئی ـــــ بولٹ لگانا تو وہ بھول ہی گئی تھی۔ اُٹھ کر دروازے کو تالا لگایا۔ پھر سارے کمرے کو درست کیا۔ بستر ٹھیک کیا۔ کرسیاں ترتیب سے رکھیں۔ جھاڑ پونچھ کی عورت صفائی کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک دم سے کمرہ بہت خوب صورت لگنے لگا

تھا ـــــ ابھی صرف دن کے دس بجے تھے۔ سارا دن کیسے گذرے گا؟ وہ اِدھر اُدھر پڑھنے کے لئے کوئی کتاب تلاش کرنے لگی۔

اُردو کی کچھ کتابیں تھیں۔ مگر زیادہ تر شاعری کی کتابیں تھیں ـــــ باقی کتابیں انگریزی میں تھیں۔ اُس نے چھانٹ کر ایک کتاب نکالی۔ ٹائیٹل پر لکھا تھا (LIVING)

"ہوں! تو کتابیں جینے کا درس دیتی ہیں۔" اس نے وہ کتاب نکال لی۔ اور آ کر بستر پہ دراز ہو گئی۔ صفحے پلٹے اور پہلا باب شروع کر لیا ـــــ کتنے ہی صفحے اُس نے پڑھ ڈالے۔ خاک سمجھ میں نہ آیا۔ تب اسے پتہ چلا کہ وہ تو صرف الفاظ پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ دھیان اس کا کتاب کی طرف نہ تھا۔ زندگی کا نام آتے ہی وہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگی تھی ـــــ اور ذرا سی دیر میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔

زندگی کیا ہے ـــــ؟

اور اس کا فلسفہ کیا ہے ـــــ؟

اور ہم کہاں ہیں ـــــ؟ کیا ہم کٹھ پتلیاں ہیں؟ ہماری ڈوری کس کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ تیز رفتار زندگی اسے کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔

وہ کیا تھی ـــــ؟

اور کیا ہو گئی تھی؟

اور زندگی میں جس آنچ کی کمی تھی وہ اس ایک مہینے نے پوری کر دی تھی۔

ایک مہینہ ہوا تھا اُسے انگلینڈ میں آئے ـــــ

اور ایک مہینے میں وہ بوڑھی ہو گئی تھی۔

جانے کیا کیا دیکھا اور محسوس کیا تھا اُس نے ـــــ؟

اُف ذرا دیر پہلے وہ کتنی خالی الذہن تھی۔ مگر جیسے لدے بادل کی طرح اُس کا ذہن بوجھل ہونے لگا تھا۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

وہ سمجھ رہی تھی آنسو ختم ہو گئے۔ مگر کیسا ہے آنسوؤں کا خزانہ جتنا لٹاؤ اُتنا ہی بھرتا جاتا ہے۔

گرم گرم آنسوؤں سے چہرہ بھر گیا ـــــ اس نے کتاب بند کر کے سرہانے کی طرف

رکھ دی ـــــ اور اپنا چہرہ تکیے پر رکھ کر الٹی ہو گئی۔ اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

میرا بچہ ـــــ !

آہ ـــــ وہ مظلوم بچہ !

خداوندا ! ایسے موڑ پر تو اپنی مصلحتیں ظاہر کیا کر۔ ایسے دُکھ دیتا ہے کہ جن کا کوئی مداوا نہیں۔

کیوں کبھی کبھی دل تنہا ہو جاتا ہے ـــــ بھری پری دنیا ویران لگنے لگتی ہے۔ اب یہی دیکھیں۔ اس کے بے شمار رشتہ دار تھے ـــــ سہارے تھے ـــــ آسرے تھے۔ اور پیار کرنے والے تھے۔ مگر وہ پردیس میں پڑی تڑپ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ دنیا میں ہمیشہ سے تنہا ہے۔

مگر کیوں ـــــ ؟

وہ بڑی بھرپور اور صحت مند زندگی گذارنے کی قائل تھی۔ صرف تین سال میں اُس کے خیالات میں اتنا بڑا انقلاب آ گیا تھا۔

یہ انقلاب کیسے آیا۔ اُس نے دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں اور پھر سیدھی ہو کر لیٹ گئی ـــــ لکڑی کی چھت میں جیسے روزن نکل آئے۔

اور اُس کو وہ خوبصورت اور تیز و طرار لڑکی دکھائی دینے لگی۔ جو اپنے گھر میں سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔

قوسیہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اور اتنی چھوٹی کہ جب اس نے ہوش سنبھالا، سب بہن بھائی بیاہے جا چکے تھے۔ کبھی کبھی سب لوگ مذاق میں کہتے تھے کہ قوسیہ امّی کے بڑھاپے کی بھول ہے۔ بس غلطی سے آ گئی۔

"کم بختیں" امی چادر میں مُنہ چھپا کے ہنسا کرتیں۔ اب یہ تو قدرت کے کام ہیں جب ایک بیٹا اور ایک بیٹی بیاہ چکی تھیں۔ تو تب قوسیہ نے آنا تھا۔

پہلے بچوں کے پالنے سے اماں کی تھکن اُتر چکی تھی۔ اس واسطے قوسیہ کو بڑے محبوب طریقے پر پالا ـــــ نئی نئی چیزیں آتیں اُس کے لئے ـــــ گھر میں ہر قسم کی آسائش تھی۔ آزمائشوں کے دن نکل چکے تھے۔ اس لئے قوسیہ شہزادیوں کی طرح پلنے لگی۔ بڑے بہن بھائی

بھی ہمیشہ محبت کی نظر سے دیکھتے ـــــ بہن کی بجائے اپنی بیٹی سمجھتے۔ اور ہمیشہ تحفے تحائف اور فرمائشیں پوری کرتے رہتے۔ ان باتوں نے اسے بگڑی ہوئی بچی کے بجائے انتہائی نفیس اور ذہین بچی بنا دیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی جب اس نے بی۔ اے کر لیا ـــــ تو اِدھر اُدھر سے رشتے آنے لگے۔ مگر اماں کو اس کے بیاہ کی ایسی جلدی نہ تھی۔ اور پھر قوسیہ بھی تو ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ اماں کی کسی بیٹی نے ایم اے نہ کیا تھا۔ اماں نے فٹ اسے یونیورسٹی بھیج دیا۔ بڑی بہنوں نے یاد دلایا کہ انہوں نے کیا خطا کی تھی جو بی اے کرتے ہی ان کو اگلے گھر سدھارا ـــــ مگر اماں تو جیسے سارے ارمان قوسیہ پر ہی نکالنا چاہتی تھیں۔ اُس کے جانے کے خیال سے اماں کو بھول آتے تھے۔ اتنا بڑا گھر قوسیہ کے دم سے آباد تھا۔ چلی جائے گی تو سنسان ہو جائے گا۔ اور قوسیہ کے لائق ہو گا بھی کون ـــــ ؟

قوسیہ بڑی عجیب و غریب لڑکی تھی۔ ہمیشہ انوکھی باتیں سوچا کرتی، نرالے کام کرتی۔ جو بھی کام شروع کرتی اس کو انتہا تک پہنچا دیتی ـــــ جس بات کے پیچھے لگ جاتی وہ کر کے رہتی دنیا جہان کی کتابیں وہ پڑھا کرتی ـــــ اس کی بے شمار سہیلیاں تھیں ـــــ بڑی بہنیں اپنے اور اپنے بچوں کے کپڑے ہمیشہ قوسیہ کے مشوروں سے سلواتیں ـــــ بڑے بھائی اپنی موٹریں قوسیہ کے مشورے سے خریدتے ـــــ بھابیاں اُسے الگ بازار لے جاتیں۔ گفتگو کا اُس کو ایسا قرینہ آتا تھا کہ پہلی ملاقات میں ہی دل موہ لیتی۔ ہر وقت مسکرانا اس کی فطرت تھی۔

اس پر غضب یہ ہوا کہ اللہ نے صورت بھی بڑی پیاری دے دی تھی۔ متناسب اعضاء کے ساتھ ایک خوبصورت دماغ بھی دیا تھا

قوسیہ انوکھی نرالی تھی اس لئے اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس کے لئے کوئی انوکھا نرالا آدمی آئے گا۔

کیسا ہو گا وہ ـــــ ؟ اسے کبھی سمجھ نہ آئی۔

خاندان میں جتنے سوالی تھے، ان میں کوئی اُسے پسند نہ آیا تھا۔ سبھی دُور و نزدیک کے رشتے دار اسے دلچسپی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور اس کا التفات حاصل کرنے میں کوشاں

رہتے تھے۔ مگر وہ سب کا مذاق اُڑایا کرتی تھی ـــــ ان میں اس کا پیدائشی عاشق جونی بھی تھا ـــــ جونی کا اصلی نام جنید احمد تھا۔ ـــــ وہ اُس کی سگی خالہ کا بیٹا تھا۔ دونوں کی عمروں میں تھوڑا سا فرق تھا۔ بچپن میں زیادہ اکٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی بزرگ ان کو مذاق مذاق میں چھیڑا کرتے تھے کہ ان کا بیاہ ہوگا۔ قوسیہ تو ازل سے لاپرواہ تھی۔ البتہ جونی نے یہ بات اپنے دل کی گرہ میں باندھ لی تھی ـــــ اور چپکے چپکے قوسیہ کو یوں پوجنا شروع کر دیا، جیسے وہی اس کی منزل ہو، قوسیہ جانتی تھی۔ طرح طرح سے اس کا مذاق اڑاتی تھی عجیب و غریب فرمائشیں کر کے اس کا ناطقہ بند کیا کرتی۔

نت نئی شرارتوں سے اُسے نکو بناتی۔ مگر وہ بھی اصیل عاشق تھا۔ ایک ہی رٹ کہ قوسیہ سے شادی کرے گا۔

ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ساری جائداد کا وارث تھا۔ اس لئے خالہ کو یقین تھا کہ قوسیہ کو بہو بنا کر لے آئے گی۔

جب قوسیہ نے ایم اے کر لیا تو خالہ نے باقاعدہ سوال اُٹھا دیا۔

گھر والوں کو بھی اعتراض نہ تھا۔ گو جونی کو ایم اے کر کے ملازم ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ تاہم گھر کا بچہ تھا اور زیادہ چھان بین کی ضرورت نہ تھی۔ مگر قوسیہ نے شور مچا دیا۔

"توبہ اللہ ـــــ میں اور جونی سے شادی کروں۔ ذرا سوچو تو اس میں آخر کیا خاص بات ہے ـــــ کم بخت یونہی سا ہے۔"

"سب مرد پہلے ایسے ہی ہوتے ہیں ـــــ!" اُس کی آپا نے سمجھایا۔

"میں ابھی جا کے اُس کی خبر لیتی ہوں۔" قوسیہ سیدھی جونی کے گھر پہنچی۔ اور بولی:

"جونی، عشق کرنے کا صرف تمہیں تو حق نہیں ہے۔ مجھے بھی قدرت نے یہ حق دیا ہے۔"

"تو تم سے یہ حق کون چھین رہا ہے۔" جونی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تم چھین رہے ہو تم ـــــ! میں بچپن میں تمہارے ساتھ کھیلتی رہی ہوں۔ یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں کہ تم میری ساری جوانی کو اس کی سزا دو۔ آخر یہ کیوں سمجھ لیا جاتا ہے کہ دو بچے جو ایک ساتھ مل کر کھیلے ہوں۔ جوان ہونے پر ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو چکے ہوں گے۔

یہ فلمی تصور کب ختم ہوگا۔ ہمارے ہاں ـــــ" جونی شرمندہ سا سر جھکائے کھڑا تھا۔

"یہ ضرور ہے کہ تم میرے کزن ہو۔ میں تمہارے ساتھ بے تکلف ہوں۔ تمہیں اچھا دوست سمجھتی ہوں۔ مگر کبھی تمہارے ساتھ شادی کا تصور تک نہیں کیا ـــــ؟

اور تم نے مجھ سے مشورہ کئے بغیر اپنے آپ کو ہیرو سمجھتے ہوئے جھٹ رشتہ بھی مانگ لیا۔"

"رشتہ مانگنا کوئی جرم نہیں۔ اور بھی بہت سے لوگ تمہارے لئے کہہ رہے ہیں۔ میں نے بھی کہہ دیا ـــــ" بڑی دیر کے بعد جونی بولا۔

"اور بھی بہت سے لوگوں سے میں نے انکار کر دیا ہے ـــــ اور تمہارے لئے بھی ـــــ"

"کوئی بات نہیں۔" جونی نے ہنس کر کہا۔ "اتنی سی بات پر لڑ کیوں رہی ہو ـــــ؟"

"یہ اتنی سی بات ہے ـــــ خالہ اور امی جان میں تفرقہ پڑ سکتا ہے۔"

"نہیں پڑ سکتا۔ سب تمہیں جانتے ہیں۔"

وہ جانے لگی تو جونی بولا۔

"یہ تو بتاتی جاؤ۔ آخر کبھی نہ کبھی تو تمہیں شادی کرنا ہی ہے ـــــ؟"

"ہاں ضرور کروں گی۔ جب میرا دل چاہے گا ـــــ!"

"تب تک میں انتظار کر لیتا ہوں۔ ممکن ہے تمہارا دل . . . . . ."

"توبہ ـــــ استغفر اللہ ـــــ" قوسیہ بھپر کر بولی۔

"تمہارے جیسے آدمی کے ساتھ میں بالکل شادی نہیں کر سکتی۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی ایسا جواب میں بھی نہ سوچنا۔ اگر میرے ساتھ دوستی رکھنا چاہتے ہو، تو شادی کا خیال دل سے نکال دو ہمیشہ کے لئے۔"

جونی کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ اب تک وہ قوسیہ کی باتوں کو ایک جذباتی لڑکی کی ضد سمجھ رہا تھا۔

اس کی شکل دیکھ کر قوسیہ کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا بولی ـــــ "میں اس صاف گوئی

کی معافی چاہتی ہوں۔ تم نے مجھے یہ سب کچھ کہنے پر مجبور کیا۔"

"کوئی بات نہیں قوس ——" وہ سوگواری سے بولا۔ "مجھے تمہاری صاف گوئی بھی بہت اچھی لگتی ہے۔"

"اچھا ——" پھر وہ رُک کر بولا۔ "کچھ مجھے اپنے آئیڈیل کے بارے میں بتاتی جاؤ۔"

"کیا فائدہ بتانے سے ——" وہ جاتے جاتے بولی۔ "جب ڈھونڈ لوں گی تو تمہیں دکھا دوں گی۔" قوسیہ چلی گئی۔

سارے خاندان میں یہ بات مشہور ہوگئی۔ قوسیہ جیسی لڑکی سے جو کچھ بھی سرزد ہو جائے۔ کوئی بُرا نہیں مانتا تھا۔ البتہ دور و نزدیک کے جتنے رشتے داروں میں سے سوالی اٹھے تھے۔ آپ ہی آپ پیچھے ہٹ گئے۔

اور کچھ ہی عرصہ بعد اُس نے سنا کہ جونی انگلینڈ جا رہا ہے۔

اونہہ —— اسے سن کر بڑی ہنسی آئی۔ سولہویں صدی کے عاشق بننے چلے ہیں۔ دل برداشتہ ہو کر وطن چھوڑے جا رہا ہے۔ جیسے مجھے بہت پرواہ ہے۔ پلپلے ہوتے ہیں۔ یہ آدمی بھی!

محبوبہ سے شادی نہ ہو سکے تو خودکشی کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ وطن چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر وہاں جاتے ہی جب کسی گوری نے پرچایا تو سارا ہجر و فراق بھول کر اُس کی زلف کا اسیر ہو جائے گا۔ اور پھر عرصہ بعد سنیں گے، جونی نے وہاں شادی کر لی۔ بڑی ظالم شے ہے عورت اس کے چکر میں عشق و شق سب بھول جاتا ہے۔ اور جونی سمجھتا ہوگا میں اس کے جانے پر بوکھلائی ہوئی دوڑی آؤں گی —— اُسے مناؤں گی۔ اپنے آپ کو مجرم محسوس کروں گی —— واپس آنے کی قسمیں دوں گی۔ میری بلا سے!

اس نے ایسا پروگرام بنایا کہ اُس سے مل ہی نہ سکے۔ چند دنوں کے لئے پنڈی اپنی ایک دوست کے پاس چلی گئی۔

جب وہ چلا گیا تو لوٹ آئی۔

اس کے بعد بھی جب کوئی رشتہ آیا۔ اُس نے ٹوٹا دیا۔ اب تو اماں کو بھی کچھ کچھ فکر ہونے لگی تھی کہ کہیں یہ بے جا ڈھیل لڑکی کو نہ لے ڈوبے —— گو لڑکی خوب صورت تھی ——

گھر میں دولت کی فراوانی تھی۔ بھائی اچھے عہدوں پر تھے۔ مگر آخر کب تک —— ایک عمر پر پہنچنے تک لڑکی کی ضرور شادی ہو جانی چاہیئے۔

خود قوسیہ کو سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ کیسا آدمی چاہتی ہے۔ کچھ انوکھی نرالی بات ہونی چاہیئے اس میں —— طبیعت مختلف ہونی چاہیئے۔ کوئی نیا پن ہو —— انفرادیت ہو۔

نرا شوہر ہی نہ ہو۔

جس طرح اس کی بڑی بہنوں کے شوہر تھے۔

توبہ!

شادی پر تو بڑے اسمارٹ بن کر آتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی توند نکل آتی۔ گنجم شوہر نظر آتے۔ روایتی انداز میں بیویوں کے پیچھے چلتے ہوتے۔ بس عشق اُن کا ایک بچے کی پیدائش کے بعد ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔ خود بھی ایک ڈگر پر چل پڑتے۔ اور بیویوں کو بھی ایک لائن میں لگا دیتے۔ چی چی! نفرت تھی اُسے ایسے شوہروں سے۔

انتہائی معمولی آدمی لگتے تھے۔

اُسے تو کسی غیر معمولی آدمی کا انتظار تھا۔ غیر معمولی آدمی کیسا ہوتا ہے، اسے خود علم نہ تھا مگر وہ بچپن سے ہی بڑا اچھوتا خواب دیکھتی آئی تھی۔ کئی بار اس نے اپنے خواب کو مجسم کرنے کی کوشش کی، مگر وہ کسی پیکر میں نہ سمایا۔

جتنے رشتے آئے اُن میں وہ خاکہ نہ تھا۔

کئی بار اُس نے سوچا کہ بھئی لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پہلے لڑکے ہوتے ہیں۔ اُدھورے سے چُلبلے سے —— پھر آدمی بن جاتے ہیں۔ بھاری بھرکم —— تبر!

جس طرح عورت۔ ماں بن کر ڈھیلی ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ خاندان کے باقی لوگ بھی سوچنے لگے تھے۔ کہ اس کے لئے کوئی خاص الخاص آدمی آئے گا —— نرالی وضع اور انوکھے انداز والا —— بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سب لوگوں کو اس اَن دیکھے آدمی کا انتظار تھا۔ جو منظر پر آنے والا تھا۔

اس کی سہیلیاں اس سے کہتیں۔

"کم بخت! کہیں آنکھ لڑا لے۔ اور اس قصّے کو پاک کر ـــــ سب کی نظریں تیری ثنا دی پر لگی ہوتی ہیں۔"

"کیا کروں ـــــ" وہ شرارت سے کہتی۔ "زکام ہوتا ہے، نزلہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ فلو بھی ہو جاتا ہے۔ مگر محبت نہیں ہوتی۔ بہت دفعہ کوشش کی ـــــ یونیورسٹی میں تو میں نے اپنے دل کو کئی بار کہا تھا۔ ہو جا کسی کے عشق میں مبتلا ـــــ کم بخت کو چوراہے پر رکھا۔ کسی پر آیا ہی نہیں ـــــ"

اور اس بات پر ساری سہیلیاں خوب کھلکھلا کر ہنسا کرتی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کی امّی نے اسے یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران کسی کو پسند کر لینے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر بڑا ہوا اس اجازت کا ـــــ ہر لڑکا بونا نظر آنے لگا۔ اور محبت کے نام سے اُسے گھِن آنے لگی۔

مزہ جب ہے کہ دل خود بخود آئے ـــــ وہ سحر انگیز شخصیت سامنے آئے کہ دل پھڑک کر سینے سے نکلے اور اُس کے آگے سجدہ ریز ہو جائے۔ وہ ہمارے اوپر اپنی مرضی ٹھونسے ـــــ حکم چلائے۔ ہم کوردندے، کچلے، جو بھی کرے۔ مگر اُس کی برتری کا احساس برابر اُس کے ساتھ رہے۔

ایم اے کئے اُسے دوسرا سال تھا

سارا دن گھر میں لیٹی وہ کتابیں پڑھا کرتی۔ یا گیت سُنا کرتی، بڑے بھیا حال ہی میں امریکہ سے آئے تھے اور اُس کے لئے نیا کیسٹ ریکارڈر اور بیشمار TAPES لائے تھے۔

کھانا، پڑھنا، گیت سُننا اور سو جانا ـــــ کیسی مزے کی زندگی گذر رہی تھی۔ شاید ایسی زندگی کو جنّت کہتے ہیں۔ مگر انسان خود ہی اپنی جنّت سے تنگ آ جاتا ہے۔ اور اُسے درہم برہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

انہی دِنوں بڑی آپا اور اُن کے بے شمار بچّے فیصل آباد سے آ گئے تھے بچّوں نے اُس کے کیسٹ پر بھی مشقِ ستم کی اور وہ گیت سننے سے محروم ہو گئی۔

اسی دن عصر میں بل کھاتی وہ کیسٹ اٹھا کر بازار گئی اور دکاندار کو ایک دن کے اندر اندر

ٹھیک کرنے کا نوٹس دے کر آ گئی۔

دوسرے دن اس نے بڑی خوشامد کر کے آپا سے گاڑی مانگی۔ کیونکہ اس کی ڈرائیونگ کی وجہ سے گھر میں اس کا گاڑی چلانا بند تھا۔

اور سیدھی دکان پر پہنچی۔

"جناب وہ میرا کیسٹ ریکارڈر ٹھیک ہو گیا ہے؟" اُس نے اپنی مخصوص گھونگھرو بجاتی آواز میں کہا۔

وہاں جنبش ہی نہیں ہوتی۔ ایک سیکنڈ، دو سیکنڈ، تین سیکنڈ.....

"جی وہ میرا کیسٹ ریکارڈر ٹھیک ہو گیا ـــــ؟"

وہ پیٹھ پھیرے پلیئر میں محو تھا۔ جیسے اُسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ اور نہ ہی اس نے کوئی آواز سُنی ہو۔

بڑا ہی کمینہ آدمی ہے ـــــ اُس نے دل ہی دل میں کوسا ـــــ یعنی..... حد ہو گئی۔

اُس کو ایک جوان لڑکی کی سُریلی آواز نہیں چونکا رہی۔ لوگ تو سڑک پر گذرتی لڑکیوں کی آواز سننے کے لئے ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ گدھا کہیں کا....

"جناب! کیا آپ اونچا سنتے ہیں ـــــ؟" اس دفعہ اس نے ذرا چلا کر کہا۔

وہ بڑی ادا کے ساتھ گھوما۔ اس نے مُنہ میں پلیئر کی سُوئی پکڑی ہوئی تھی۔ جلدی سے سُوئی کو اپنی انگلیوں میں تھاما۔ ماتھے پر آتے بالوں کو دوسرے ہاتھ سے پرے کیا۔ اور گھور کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے خفگی سے بولا۔

"میں تو اونچا نہیں سنتا، مگر آپ کی نظر ضرور کمزور ہے۔"

تو سیہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ یہ وہ آدمی نہیں تھا۔ کل جب وہ دکان پر آئی تھی تو دو جوان سے لڑکے بیٹھے تھے۔ گو اُس نے انہیں غور سے نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی اُسے پکا یقین تھا۔ اس حلیئے کا کوئی آدمی دکان پر نہیں تھا۔ کافی خوش پوش اور اسمارٹ آدمی تھا اور شخصیت سے ہی کوئی امیر آدمی معلوم ہو رہا تھا۔

تو کیا ہے ـــــ؟ اُس نے دِل میں سوچا۔ آجکل دکاندار بھی اتنے ہی اسمارٹ اور

خوش پوش ہوتے ہیں۔ اور پھر اچھے کپڑے پہننے کا ذوق مردوں میں بھی عام ہو گیا ہے اب یہ بن ٹھن کر جو دکان میں گھسا بیٹھا ہے۔ تو مجھے کیا معلوم کون ہے؟

ابھی وہ کوئی اور وار کرنے کا سوچ رہی تھی۔ کہ سٹراپ سے ایک آدمی دکان میں داخل ہوا۔

اوہ ——— یہی وہ دکان دار تھا کل والا۔

اس کے ہاتھ میں کچھ بجلی کے آلات اور پرزے تھے۔ ——— شاید کہیں باہر سے لینے گیا تھا۔ وہ گھوم کر کاؤنٹر پہ آ گیا۔ اور بولا۔

"فرمایئے!"

اوہ ——— قوسیہ کی جان میں جان آئی۔ کہ اس نے کوئی اور سوال کر کے اپنی پوزیشن خراب نہیں کی تھی۔ مہذب طریقے سے بولی۔

"جی میں وہ کل اپنا کیسٹ ریکارڈر دے گئی تھی ———" وہ پرس میں سے رسید نکالنے لگی۔

"جی ——— وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔" دوکاندار نے رسید کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ کیسٹ ریکارڈر نکال کر کاؤنٹر پہ رکھ دیا۔ اور سوئچ لگا کے اس کو آن کر دیا۔

"ٹرائی کر لیں۔"

مگر قوسیہ کن انکھیوں سے اسی آدمی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس نے اپنا پلیئر پیک کر لیا تھا اور اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ شاید وہ کوئی پرانا گاہک تھا۔ یا دکان دار کا دوست تھا۔ پتہ نہیں یہ گاہکوں کی کونسی قسم ہوتی ہے، جو دکان کے اندر گھس کر یہ امپریشن دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے وہ دکان کے مالک ہوں۔

وہ آدمی جانے کے لئے کاؤنٹر سے باہر آ گیا۔ دکان دار نے قوسیہ کی طرف سے توجہ ہٹائی اور دوڑ کر اس کے قریب چلا گیا۔ جھک کر اس سے پیسے لئے۔ بقایا اس کے ہاتھ میں تھمائے اور شکریہ ادا کیا۔

وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ کس قدر بدتہذیب ہوتے ہیں۔ یہ دکاندار بھی ——— ایک عورت کو چھوڑ کر مرد کو اٹینڈ کرنے لگ گیا ہے۔ مانا کہ وہ بڑی آسامی ہے۔ پرانا گاہک ہو گا۔ مگر تہذیب کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے جس کو اٹینڈ کر رہے ہو اس کا کام ختم کر کے دوسری طرف

رجوع کرو۔

اُونہہ۔ انہیں تو سو سالوں میں بھی عقل نہیں آئے گی۔ خواہ کتنے بڑے کاروباری ہو جائیں دکاندار پھر آ گیا تھا۔ قوسیہ نے بل کھول کر کاؤنٹر پہ رکھا اور اس پر پیسے رکھ دیئے۔ اپنا ٹیپ ریکارڈر اٹھایا اور غصے میں فوں فوں کرتی باہر کو لپکی۔

پارکنگ والی جگہ اب بالکل بھر چکی تھی۔ اور اتنی بے شمار موٹروں میں سے اپنی موٹر نکالنا اُسے کافی مشکل نظر آ رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اللہ کا نام لیکر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ کئی گاڑیاں اپنی جگہ سے ہل رہی تھیں۔ ذرا سی جگہ بن جاتے تو وہ احتیاط سے نکال لے۔ آج وہ آپا کی موٹر لے آئی تھی۔ اس کے بہنوئی تو بڑے خبیس آدمی تھے۔ آپا نے ان سے چوری اسے گاڑی لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور اب احتیاط سے گاڑی نکالنا اس پر لازم ہو گیا تھا۔

مگر ہوتا یوں ہے کہ ——— "جو ڈرتا ہے وہ مرتا ہے"۔ جتنی بھی احتیاط کرو اتنا ہی کام خراب ہو جاتا ہے۔

دھمک سے گاڑی پیچھے جا لگی۔ سر نکال کر دیکھا تو وہی خوش پوش آدمی خونخوار نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔

اوئی میرے خدا ———

گاڑی تو اس کی بتیوں سے جا ٹکرائی تھی۔ جانے کتنا نقصان ہوا ہو گا ——— نقصان تو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر اُس نے سرِ عام پکڑ لیا اور سب کے سامنے بے عزتی کرنے لگا تو ——— کتنی دیر تک وہ اپنی سیٹ پر گم صم بیٹھی رہی۔ یوں دم سادھے جیسے ابھی کوئی اس کا گلا گھونٹنے والا ہے۔ باہر نکل کر اپنی بے عزتی کروانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

اس نے سوچا وہ بیٹھی بیٹھی ہی اُس کی تلخ و ترش سن لے گی۔ جب کافی دیر ہو گئی ——— اور دو چار اور گاڑیاں بھی نکل گئیں تو اُس نے ڈرتے ڈرتے سر باہر نکالا ——— اِدھر اُدھر آگے پیچھے دیکھا۔

وہ جا چکا تھا۔ اس کے پاس شاید اتنا وقت نہیں تھا کہ فضول بک بک میں ضائع کرتا

یا لڑکی سمجھ کر اُس نے اسے چھوٹ دے دی تھی۔ بہرحال وہ کالی شیوا مپالا ـــــ نہ جانے کس طرف جا چکی تھی۔ جگہ کافی خالی ہوگئی تھی۔ دوسری بار وہ دل میں بے حد شرمندہ ہوئی۔ عجیب آدمی تھا ـــــ بہرحال دنیا عجیب و غریب لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔

یونہی وہ سیدھی سڑک پر چلی جا رہی تھی ـــــ کافی ٹریفک تھا۔ ایک چوراہے پر موٹریں ادھر ادھر ہوئیں تو اچانک وہی کالی شیوا مپالا اس کے آگے نمودار ہوگئی۔

تو حضرت اُدھر جا رہے ہیں۔

اب سڑک کچھ خالی تھی۔ نہ جانے اس کا دل کیوں چاہا کہ وہ اپنی موٹر اس گاڑی سے آگے نکال لے۔ ویسے یہ اس کی عادت تھی۔ وہ جب موٹر چلا رہی ہوتی اس کا دل چاہتا وہ سڑک پر جاتی ہوئی ہر موٹر کو پیچھے چھوڑ جائے۔ اور اسی جنون یا دیوانے پن میں وہ کئی بار گاڑی ٹکرا چکی تھی۔ اس لئے پاپا نے اسے موٹر چلانے کی ممانعت کر دی تھی۔ اب اپنی گاڑی تو ہاتھ نہیں آتی تھی اس لئے وہ دوسروں سے ہتھیا لیا کرتی۔ اُس نے اس طرح گاڑی آگے نکالی۔ جیسے اتفاقاً آگے نکل گئی ہو۔ پھر ٹیڑھی آنکھ سے اُس کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ اس کی گاڑی کی ایک بتی ٹوٹ گئی تھی۔

اوہو! اس کا تو نقصان ہوگیا۔

اور اس شریف آدمی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ شاید لڑکیوں سے الجھنا اس کی عادت نہیں اب وہ بھی ایسی اخلاق کی گئی گذری نہیں کہ اس سے معافی نہ مانگے۔

قوسیہ نے دو تین ہارن دے کر گاڑی بالکل اُس کے آگے روک دی۔

نتیجۃً اس آدمی کو بھی اپنی گاڑی روکنا پڑی۔

دونوں ایک ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکلے۔

"فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی ـــــ"

اس نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ قوسیہ پہچان نہ سکی۔ وہ طنز کر رہا ہے یا خلوص سے کہہ رہا ہے۔ مگر اس کے انداز پر قوسیہ کو ہنسی آگئی۔

"کہئے تو گاڑی کی دوسری آنکھ پیش کر دوں؟"

قوسیہ نے گاڑی کی ٹوٹی ہوئی بتی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی فوکس ویگن کی پشت پر دیکھا۔ اس کی گاڑی کو بس دو تین خراشیں آئی تھیں۔ جبکہ اُس بے چارے کی گاڑی کی بتی، شیشہ اور بلب سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

"آئی ایم ویری سوری ـــــ" قوسیہ نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "آئی مین اِٹ۔"

"دیکھیئے میں نے معافی مانگنے کے لئے ہی آپ کو روکا ہے۔ ویسے آپ کوئی شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو جانے میری کیا درگت بناتا۔ اگر آپ کہیں تو میں ہرجانہ ادا کرنے کو تیار ہوں ـــــ"

"یعنی ـــــ؟"

"یعنی ـــــ اُس کی درستگی کا بل ادا کر دوں۔"

"آپ کیا کرتی ہیں ـــــ؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"پڑھتی ہیں؟"

"پڑھ لیا ـــــ!"

"کتنا ـــــ؟"

"دو سال ہوئے ایم اے کئے!"

"میں تو محترمہ! آپ کو ناقص سا مشورہ دوں گا، کہ آپ موٹروں کا ایک ورکشاپ کھول لیں۔ جس لڑکی کو ٹکر مارنے کی اور بعد میں بل ادا کرنے کی عادت ہو۔ اُس کا فائدہ اسی میں ہے کہ اُس کا اپنا ایک ورکشاپ ہو۔ تاکہ بل واپس اُس کے پاس آجائے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسی ـــــ

وہی مخصوص قہقہہ جو اس کی پہچان تھا۔ جلترنگ تھا۔

جب ہنس چکی، تو بولی۔

"آپ اپنے حربے میں کامیاب نہیں رہے۔ آپ نے دراصل مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں شرمندہ ہونے والی جنس نہیں ہوں۔"

"ہاں وہ تو مجھے دکان میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔"

اس نے اس انداز میں کہا کہ قوسیہ کو دوبارہ ہنسی آ گئی۔

"آپ کو بہت بُرا لگا ہو گا۔ میں نے آپ کو دکاندار کہہ دیا تھا۔ ویسے تو پتہ نہیں آپ کیا ہوں گے۔ مگر دوکان میں کھڑے ہوئے تو بالکل دوکان دار لگ رہے تھے۔"

"ویسے تو ایک خوبصورت لڑکی مرد سے جو بھی کہہ دے وہ بُرا نہیں مانتا۔ سچ سچ بتائیں کیا آپ کی نظر اتنی کمزور ہے کہ دکاندار میں اور مجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آیا؟"

"میں اس سے پہلے اس دکان پر ایک بار ہی آئی تھی۔ جلدی میں ٹیپ ریکارڈر دے کر چلی گئی۔ پھر مجھے مردوں کو غور سے دیکھنے کی عادت ہی نہیں ہے ——— اور دکانداروں کو بالکل سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔"

"گو ہر مرد اس قابل نہیں ہوتا مگر بعض مرد ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں غور سے دیکھنا چاہیئے۔"

"مثلاً آپ ——— ؟ ہے نا؟" وہ جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"کیا بات ہے آپ میں کہ آپ کو غور سے دیکھا جائے۔ صرف یہی نا کہ آپ نے سوٹ ذرا قیمتی پہن رکھا ہے۔ اور سگریٹ امپورٹیڈ پیتے ہیں۔"

"جی نہیں ——— مجھ میں اور ان لوگوں میں جو فرق ہے۔ وہ آپ نہیں سمجھ سکیں گی۔"

"بہر حال میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنی نظر ٹیسٹ کرائیں اور گاڑی چلاتے وقت عقل بھی استعمال کیا کریں۔"

"شکر ہے آپ نے صرف عقل استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے یہ نہیں کہا کہ گاڑی چلانا چھوڑ دو۔"

"میں اتنا تنگ نظر نہیں ہوں۔ اور پھر لڑکیاں گاڑیاں چلاتی ہوئی خوبصورت بھی لگتی ہیں۔"

"اچھا تو ——— کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا یا ہرجانہ لیں گے۔"

"معاف کر دیا!"

"لڑکی سمجھ کر . . . ."

"نہیں ——— تم بہادر ہو ——— تم میں نہ صرف مقابلہ کرنے کی ہمت ہے۔ بلکہ اپنا قصور ماننے کا حوصلہ بھی ہے اور ایسے شخص کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ جس نے اعترافِ جرم کر لیا ہو۔"

"شکریہ بہت بہت۔ آپ نے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا۔" وہ جانے کو مڑی۔

"باقی دا ——— یہ گاڑی آپ کی اپنی ہے۔"

"جی نہیں ———" اُس نے ادا سے کہا۔

"اسی لئے تو ڈر سے جان نکلی جا رہی تھی۔ یہ گاڑی میری بہن کی ہے اور وہ آج رات واپس فیصل آباد جا رہی ہے۔ اب پہلے اس کو درکشاپ لے جاؤں گی اور یہ خراشیں درست کراؤں گی۔ کیونکہ میرے بہنوئی ذرا کفایت شعار دوسرے معنوں میں خسیس واقع ہوتے ہیں پٹرول کے قطرے قطرے کا حساب مانگتے ہیں۔ شکر ہے اللہ کا۔ ان کی گاڑی کو زیادہ گزند نہیں پہنچی اور میری عزت بچ گئی۔ آپ کا بھی شکریہ آپ نے خندہ پیشانی سے نقصان برداشت کر لیا ورنہ دونوں جانب سے میری شامت آ جاتی۔"

وہ جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑی۔

وہ اپنی گاڑی چلا کر اس کے برابر لے آیا۔ اور بولا۔

"فوکس ویگن چلاتی ہوئی لڑکی اچھی نہیں لگتی۔ وہ بھی اتنے پُرانے ماڈل کی۔"

"اگر لڑکی کے پاس اتنی بڑی (اُس نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا) موٹر نہ ہو تو وہ کیا کرے؟"

"کسی سے مانگ کر دیکھے۔"

"یعنی آپ سے ———"

"ہاں۔"

"اچھا تو اگر میں آپ سے یہ گاڑی مانگوں تو آپ دے دیں گے۔"

"ضرور دے دوں گا۔"

"ہمیشہ کے لئے ———"

"نہیں ——— ہمیشہ کے لئے تو آپ سنبھال بھی نہ سکیں گی۔ کبھی کبھی چلانے کے لئے

دے سکتا ہوں۔"

"اور اس کے بدلے مجھ سے کیا مانگیں گے؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"بڑا تلخ تجربہ ہے آپ کو گاڑی والوں کا ——"

"نہیں مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا" وہ خود اعتمادی سے بولی۔ "اور نہ میں بزدل لڑکی ہوں کہ مجھ پر تجربے کئے جائیں۔ یہ میرا مشاہدہ ہے —— اور آئے دن ایسے کئی واقعات سننے میں آتے رہتے ہیں۔ خوب صورت گاڑیوں کا فریب دے کر لوٹنا اس شہر میں امیرزادوں کا شیوہ ہے۔"

"اچھا تو میں امیرزادہ نظر آتا ہوں۔"

"نظر آنے کی کوشش تو کر رہے ہیں۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"کہو پھر سودا منظور ہے؟" وہ کش لے کر شرارت سے بولا۔

"جی نہیں ——"

"بہت مہنگی کار ہے۔"

"اور عزت کار سے کہیں زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔ کئی کاریں اس پر نثار کی جا سکتی ہیں۔"

"ہم نے تو ایسا کہیں نہیں سنا۔ لڑکیاں تو صرف ایک پجارو دیکھنے کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہیں۔"

"ہوں گی —— ؟ دنیا میں، ہر قسم کے لوگ ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔"

پیچھے سے کسی گاڑی نے ہارن دیا۔ وہ مزے سے باتیں کرتے چلے آ رہے تھے چونک کر دونوں آگے پیچھے ہو گئے۔ کچھ دور جا کر سڑک پھر خالی ہوئی تو وہ اس کے برابر آ گیا۔

"آپ واقعی بڑی نڈر لڑکی ہیں۔"

"میں چاپلوسی میں بھی نہیں آتی ——"

"مجھے بھی لڑکیوں کی خوشامد کرنے کی عادت نہیں ہے۔"

"تو پھر اپنا رستہ ناپئے —— یہ سڑک میرے یا آپ کے آباؤ اجداد کی نہیں ہے، جو

اس پر ہماری ہی اجارہ داری ہو۔ دیکھیں ٹریفک زیادہ ہو رہا ہے ——"

"ویسے میرے والد کی تو ہے یہ سڑک —— کیونکہ وہ سڑکوں کی ٹھیکیداری کا کام کرتے ہیں۔"

"اچھا دیکھئے —— پیشتر اس کے کہ میں ناقص سڑکوں کا حوالہ دے کر آپ کے والد کی شان میں گستاخی کروں —— آپ اپنے راستے پر تشریف لے جائیے۔"

"چلئے میں آپ کے پیچھے آتا ہوں۔ آگے نہ سہی ——"

"اوہو۔ آپ بھی مرد ہی نکلے۔ آگے نا اپنی اوقات پر۔ چلئے میں ایک طرف روک لیتی ہوں۔ جب آپ چلے جائیں گے تو یہاں سے جاؤں گی ——"

وہ آدمی کھسیانا ہو کر روانہ ہو گیا۔ وہ دُور تک دیکھتی رہی۔ جب وہ کار ایک اور سڑک کی طرف مڑ گئی تب اُس کو تسلی ہوئی۔

"ذرا ان لوگوں کو مُنہ لگاؤ۔ ہاتھ پکڑنے کو دوڑتے ہیں۔ مفت میں سارا وقت ضائع کروا دیا۔ ابھی ورکشاپ میں دو گھنٹے لگیں گے۔"

نوکر نے آکر کہا۔ "جی کوئی صاحب آپ سے ملنے آتے ہیں۔" تو وہ کتاب پڑھتی پڑھتی چونک گئی۔

"مجھے یا پاپا کو ——— ؟"

"جی آپ کو ———"

"مجھے ——— ؟" اُس نے پھر حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں ———"

"کیا نام ہے اُن کا ——— ؟"

"پتہ نہیں جی!"

"ہزار بار کہا ہے۔ نام پوچھ کر آیا کرو۔ اُلوؤں کی طرح مُنہ اُٹھا کر چلے آتے ہیں۔ پتہ نہیں کون ہے ——— کس سے کام ہے۔ کس کو مِلنا ہے ———" بڑبڑاتی ہوئی وہ چپل گھسیٹتی ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوئی ——— نہ تو ہاتھ سے بکھرے بال سنوارے ——— اور نہ کپڑوں کی سلوٹیں دُور کیں۔ جیسے لیٹی تھی۔ ویسی ہی اُٹھ کر آگئی۔

ڈرائنگ روم میں آکر ٹھٹک گئی۔

وہی تھا بالکل وہی۔

مُسکرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"اُمید ہے آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا ———"

"آپ ..... آپ ....." وہ اتنی حیرت زدہ تھی کہ اُس کی شکل سے صاف صاف عیاں تھا۔

آخر اس نے گھر کا پتہ کیسے لگایا ———

وہ قریب آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

مگر دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں موٹر کے سلسلے میں نہ آیا ہو۔

"بہت حیرت ہوتی مجھے دیکھ کر ——— ؟"

"جی ..... جی ..... حیرت کی تو بات ہی ہے ———"

"آپ سے جان نہ پہچان۔"

"جان پہچان تو آپ نے ٹکر مار کر پیدا کر لی تھی ———" وہ ہنسا۔

مگر وہ بالکل نہیں مسکرائی۔ ہونق سی بنی کھڑی رہی۔

"شاید آپ کو میرا آنا ناگوار گذرا ہے ———"

"جی گزرا تو ہے۔"

"بات دراصل یہ ہے ———" وہ بڑی خوش دلی سے بولا۔ "کل سارا دن اِدھر اُدھر گھوم کر جب میں گھر گیا۔ تو آپ کا خیال مسلسل ذہن میں تھا۔ عجیب بات ہے۔ میں سارا وقت آپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ لڑکیاں تو مجھے اور بھی بہت ملتی ہیں۔ مگر آپ میں ایک انوکھا پن دیکھا میں نے ——— آپ کا پہلا تاثر ایسا تھا کہ مجھ پر اثر چھوڑے بغیر نہ رہ سکا ——— میں نے کہا 'یار! کیا بودے آدمی ہو۔ زندگی میں پہلی بار ایسی انمول لڑکی نظر آئی ہے ——— اور تم ہو کہ ڈرے جا رہے ہو۔ میں نے کہا چلتے ہیں۔ قسمت آزمائی کرتے ہیں۔"

"جی ——— ؟" قوسیہ گرتے گرتے بچی۔

"مگر ..... مگر ..... مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ آپ کون ہیں؟ آپ کا نام کیا ہے ———"

"شناسائی کے لئے ان لوازمات کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ یہ بتائیں میں آپ کو پسند آیا ہوں یا نہیں ——— ؟"

"اتنی جلدی ———"

"ہاں، اس بات کا پتہ تو پہلی مُلاقات ہی میں لگ جاتا ہے ——!"
قوسیہ کا دِل دھڑک اٹھا۔

(عجیب آدمی ہے۔ اس کے دِل نے کہا)

"پہلے آپ یہ بتائیں، آپ نے میرے گھر کا پتہ کیسے لگایا؟"

"تھوڑی دور جانے کے بعد مجھے خیال آیا آپ کا پتہ ضرور لگانا چاہیئے۔ دائیں ہاتھ پہ "ماڈرن آٹوز" ورکشاپ ہے نا؟ تو میرا خیال تھا کہ آپ اس سے گاڑی ٹھیک کروائیں گی۔ میں نے ایک خفیہ جگہ پر اپنی گاڑی پارک کی اور آپ کا انتظار کرنے لگا۔ واقعی آپ ورکشاپ کے اندر چلی گئیں۔ مجھے معلوم تھا وہاں آپ کو دو تین گھنٹے لگیں گے۔ میں اپنے گھر گیا۔ وہاں سے دوسری گاڑی لے آیا اور اس میں بیٹھ کر کافی فاصلے سے آپ کا پیچھا کیا اور گھر دیکھ کر واپس چلا گیا۔"

"ہوں —— تو یہ خالص مردانہ حرکت تھی ——"

"جی۔ اب آپ خالص زنانہ حرکت مت کریں پلیز۔"

"کیا مطلب؟" وہ ذرا شیر ہو گئی۔

"ٹال مٹول.... ڈانٹ ڈیٹ.... لیت ولعل۔ وغیرہ وغیرہ...."

"اچھا تو محاوروں پر بھی خاصی دسترس ہے۔"

"جی، دسترس تو اور بھی بہت سی باتوں پر ہے۔ موقع دیں گی تو انشاء اللہ دست شناسی دکھاؤں گا۔ مگر ابھی تک نہ آپ خود بیٹھی ہیں اور نہ مجھے بیٹھنے کو کہا ہے۔"

"بیٹھئے ——" وہ ذرا آگے آئی۔ اس کو اشارہ کیا اور خود بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ کیوں ڈرے —— کوئی چور ہے —— کوئی بزدل ہے۔

"آپ نے اپنا باقاعدہ تعارف تو کرایا نہیں ——"

"باقاعدہ تو میں جانتا نہیں —— بے قاعدہ یہ ہے کہ مجھے جمالی کہتے ہیں۔"

"کہتے ہوں گے ——" وہ بے نیازی سے بولی۔ "میں نے پورا نام دریافت

کیا ہے۔"

"میرا نام ہے منوچہر جمالی۔"

"منوچہر ——؟"

"جی، اسی خاطر میں آپ کو نام نہیں بتا رہا تھا۔"

"یہ تو بالکل پریوں کی کہانیوں والا نام ہے۔"

"کبھی کبھی پریوں کا شہزادہ مجسم بھی تو ہو سکتا ہے۔"

وہ صرف مسکرائی۔

"کیا مطلب ہوتا ہے منوچہر کا ——؟"

"جی.... وہ.... دیکھیں نا جب میں مطلب بتاؤں گا۔ تو آپ کہیں گی.... کہ.... یہ انتہائی ناموزوں نام ہے۔ وغیرہ وغیرہ —— کیونکہ ہر بچہ ماں کی نظر میں انوکھی انمول شے ہوتا ہے ——"

"مطلب بتایئے ——"

چاند کے چہرے والا ——"

قوسیہ نے ڈرامائی انداز میں اس کا چہرہ دیکھا —— کچھ کہنا چاہا —— پھر وہ خاموش ہو گئی —— نظر جھکا لی۔

"کہیئے —— کچھ میرے چہرے کے بارے میں کہیئے۔"

"میں چونکہ ماں کے جذبات کا احترام کرتی ہوں۔ کچھ نہ کہوں گی۔ ہر ماں کو اپنا بچہ چاند کا ٹکڑا لگتا ہے ——"

"آپ کو بھی لگے گا ——"

پھر ایک بار اُس کا دِل دھڑک کر حلق تک آ گیا۔

(چہرہ اس کا روشن تھا۔ چاند کی طرح.... اُس کے دِل نے کہا)

اب میں آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔"

"قوسیہ ——"

قوسیہ بھی کوئی نام ہوتا ہے۔"

"اگر منوچہر ہو سکتا ہے تو قوسیہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"سُنا نہیں میں نے کبھی ——"

"اب تو سن لیا۔"

"جی سن بھی لیا اور دیکھ بھی لیا۔"

"اس کی وجہ تسمیہ بتائیں ——"

"بس ایسے ہی اماں کہتی ہیں۔ جب میں پیدا ہوئی رم جھم رکی تھی۔ اور آسمان پر خوبصورت رنگوں کی قوسِ قزح بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے میرا نام قوسیہ رکھ دیا ——"

"بہت موزوں نام دیا آپ کو، قدرت کے سب حسین رنگ آپ میں ہیں۔"

"اس چاپلوسی کے عوض میں آپ کو چائے تو پلوا ہی دوں۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا —— اور قوسیہ بھاگ کر نکل گئی۔

باورچی خانے میں اماں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"اری کیا ہے ——"

"اماں ذرا ڈرائنگ رُوم میں چائے بھجوا دیں۔ بڑی پُرتکلف ——"

"کون آیا ہے ——" اماں نے پوچھا۔

"وہی —— وہی ——" وہ مڑی

"کون وہی وہی لگا رکھا ہے۔"

"وہ جس کی موٹر کو ٹکر ماری تھی ——"

اور وہ پھر ڈرائنگ روم میں واپس چلی گئی۔

اماں کی پیشانی پر شکنیں اُبھریں۔

پہلے کبھی لڑکی کا یہ انداز نہیں تھا۔

واپس جا کر وہ کوئی بات ہی نہ کر سکی۔

چائے آ گئی۔ اِدھر اُدھر کی چند باتوں میں انہوں نے چائے پی۔ اور پھر وہ کھڑا ہو گیا۔

"اب میں چلوں ——"

وہ بھی کھڑی ہو گئی ——

وہ کھڑا ہوا تو اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ بڑا شاندار آدمی تھا —— پور پور روشن تھی —— صاف، چمکدار، اچھی صحت، خوبصورت سراپا! نفاست ہی نفاست ——

"خدا حافظ"

"خدا حافظ"

وہ چلا گیا ——

وہ آہستہ آہستہ چلتی ڈرائنگ روم سے باہر آ گئی۔ زمین کی طرف دیکھ کر یوں سوچ میں مگن تھی۔ جیسے کوئی شے کھو گئی ہو۔ اور اسے ڈھونڈ رہی ہو۔ اماں اُس کی محویت سے چونکیں۔

"کون آیا تھا ——؟"

چونک کر اس نے سر اٹھایا۔

"اماں اس دن میں نے ایک آدمی کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔ وہ آیا تھا۔"

"ہرجانہ لینے ——؟"

"نہیں اماں ——" وہ ہنس پڑی —— "ایسے ہی، پتہ نہیں وہ کیوں آیا تھا میں کیا جانوں؟"

اماں نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور دُور جا کر بیٹھ گئیں۔

لڑکی کبھی پہلے یوں سوچ میں مگن نہ ہوئی تھی۔

اماں بھی آج کل عاجز تھیں۔ چاہتی تھیں کہیں خود ہی لڑھک جاتے۔ اس کو سوچنے کا موقع دے کر ٹل گئیں۔

رات کو جب وہ سونے لگی ـــــ تو کسی نے کہا

"چاند کے پہرے والا ـــــ"

اور وہ چونک اٹھی۔

تھا شاندار آدمی ـــــ اُس نے کروٹ بدل کر سوچا۔ کپڑوں سے بڑی پیاری مہک اُٹھ رہی تھی ـــــ مسکرانے کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔

اُس کے خیال پر دل بُری طرح دھڑک رہا تھا ـــــ

اور پھر دل کے ساتھ ساتھ سارے احساسات، جذبات اور تخیلات کارواں بنا کر چل دیئے ـــــ

"کدھر جا رہے ہو کمبختو!"

اُس نے انہیں پکارا ـــــ

پر جیسے اس کا بھی دل چاہنے لگا کہ ان کے پیچھے پیچھے چلے ـــــ دور تک چلتی جائے وہاں جہاں سرے پر الاؤ بھڑک رہا ہے ـــــ

تن میں جو چنگاریاں اٹھ رہی ہوں۔ وہ اسی الاؤ سے مل کر ہی ٹھنڈی ہو سکتی ہیں۔

تو یہ کیسا جذبہ تھا ـــــ

جو راتوں رات جاگا تھا ـــــ

توبہ کروٹیں لیتے لیتے رات تمام ہوئی ـــــ

کم بخت، خوشبوئیں دیتا، کبھی اس طرف سے آجاتا۔ اور کبھی اس طرف سے ـــ

کتنی بار تو اس کی گرم گرم خوشبودار سانس اسے اپنے نتھنوں پر محسوس ہوئی ـــــ

گھبرا کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

صبح وہ دیر سے اُٹھی ـــــ ایک پیالی چائے کی پی کر برآمدے میں آ بیٹھی ـــ
ایسے لگ رہا تھا جیسے بدن میں میٹھا میٹھا درد ہے ـــــ رات کوئی میلوں کا سفر کیا ہے اس نے۔
شاید کوئی ڈیپریشن ہے۔
سمجھ نہیں آ رہی تھی جی نیچے نیچے کیوں جا رہا ہے۔
ایک دم ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
چونک کر اس نے ریسیور اٹھایا۔
"ہیلو!"
"کیا حال ہے قوسیہ صاحبہ!"
"افوہ!" یہ تو وہ تھا۔ دل پھر اسی انداز میں دھڑکا۔
"ٹھیک ہوں!"
"کیا کر رہی تھیں؟"
"ابھی چائے پی کر بیٹھی ہوں۔"
(یہ اس نے فون نمبر کہاں سے لے لیا۔ جو آدمی گھر ڈھونڈ سکتا ہے۔ کیا فون نمبر حاصل نہیں کر سکتا؟)

"تو تمہیں بھی ساری رات نیند نہیں آتی ـــــ"
"تمہیں بھی سے کیا مطلب ہے آپ کا ـــــ؟"
"مجھے میں تو ساری رات نہیں سو سکا ـــــ"
وہ خاموش رہی۔
"وہ ریکارڈ بار بار سنتا رہا ہوں۔"
"اے دل دیوانہ چل، چل وہیں دوبارہ چل۔"
وہ پھر بھی خاموش رہی۔
"آؤں تمہارے ہاں ـــــ"
"کیوں ـــــ؟"
"واہ.... آج میں دفتر بھی نہیں جا سکا ـــــ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میرے جیسے مصروف اور باقاعدہ آدمی کے شب و روز ضائع ہوتے جا رہے ہیں۔ اور تم پوچھتی ہو کیوں؟ ـــــ اچھا تو پھر تم آجاؤ میرے ہاں ـــــ؟"
"توبہ توبہ ـــــ"
"اے جی میں شریف آدمی ہوں۔ سارا وقت تمہارے سامنے دو زانو بیٹھا رہوں گا۔ دونوں مل کر گیت سنتے رہیں گے۔"
"یہ خواب تو مت دیکھیے ـــــ صاحب!"
"تو پھر میں آ رہا ہوں۔"
"ضرورت نہیں آنے کی ـــــ"
قوسیہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔
جھٹ اماں سر پہ پہنچ گئیں
"کون تھا جس پر خفا ہو رہی تھیں؟"
"وہی ـــــ وہی تھا کم بخت ـــــ" اُس نے بوکھلاتے بلغ کہا۔
"تو قرینے سے جواب دیا ہوتا" آج اماں لڑکی کے ماتھے کی شکنوں میں ایک نئی شکن

دیکھ رہی تھیں۔

"اماں کہہ رہا تھا میں آؤں ـــــ ؟"

اس نے منہ پھلا کر کہا۔ قوسیہ نے اماں سے کبھی کوئی بات نہ چھپائی تھی اور نہ کبھی شرمائی تھی۔

ابھی اماں کوئی جواب نہ دے پائی تھیں کہ پھر گھنٹی بجی۔ انہوں نے قوسیہ کو اُٹھانے کا موقع دیا۔

"ہیلو ـــــ!"

"دیکھو قوسیہ۔ سارا دن اسی طرح تنگ کرتا رہوں گا۔"

"تو میں گھر سے کہیں چلی جاؤں گی۔"

"سڑک روک لوں گا!"

"تو میں کیا کروں؟"

"بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔"

"کیا ـــــ؟"

"چلو ہم شادی کر لیتے ہیں!"

"جی ـــــ!" اس نے جی ذرا لمبی کر دی۔

"دیکھو نا میں تو بالکل روایت پسند نہیں ہوں۔ اور نہ تم مجھے عام سی لگتی ہو۔ کبھی ہاں کبھی نہ ـــــ؟ اقرار بھی۔ انکار بھی ـــــ اور پھر کہیں جا کے معاملہ طے ہوتا ہے مجھے ایک رات میں پتہ چل گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہیں بھی کچھ نہ کچھ تو محسوس ہو ہی رہا ہوگا ـــــ چلو وقت ضائع نہ کریں۔ اور جلدی سے شادی کر لیں۔"

"اچھا تو آپ کے یہاں یہ معاملے ٹیلی فون پر طے ہوتے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ ہاں ـــــ بھئی اگر دل سڑک پر مل سکتے ہیں۔ تو باقی معاملے۔۔۔۔۔ چھا بھئی اچھا ـــــ غلطی سے سب کہہ گیا ـــــ اب بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"اماں آپ ہی بات کریں۔ یہ تو ایسے ہی اول فول بکے جاتا ہے۔"

اس نے عاجز آ کر ٹیلی فون اماں کو پکڑایا اور اندر چلی گئی۔

اماں خوب جانتی تھیں۔ اب کیا کہنا چاہیئے۔

شام کو اُسے باقاعدہ چائے پہ بُلایا۔ وہ بھی خوب بن ٹھن کر آیا۔ اماں اور پاپا دونوں کو پسند آگیا۔

تب اُسے احساس ہوا وہ اسے بھی بہت پسند تھا۔ پتہ نہیں کیسے وہ چپکے سے دل میں اُتر گیا تھا۔ بعد میں اُس نے چُن چُن کر اُس میں سے عیب نکالنے چاہے تو کوئی نہ ڈھونڈ سکی۔ جتنا خوب رو تھا اتنے ہی خوبصورت انداز میں بات کرتا تھا۔ اتنی خود اعتمادی تھی اس کے اندر کہ قوسیہ کا دل اُس کے سامنے پگھلنے لگتا۔ قد و قامت بالکل کہانیوں جیسی تھی۔ اُونچا لمبا چوڑا چکلا ـــــ سرخ و سفید ـــــ تیز و طرار انتہائی سیاہ آنکھیں ـــــ پہننے کا اُسے خوب سلیقہ تھا۔ ٹائی سے لے کر بُوٹ تک ـــــ موٹر چلانے کا انداز بڑا دلکش تھا۔

اور اس کا پیشہ ـــــ

ہاں پاپا بتا رہے تھے۔ کراچی میں اُس نے اپنے ابا کا سارا کاروبار سنبھال رکھا ہے۔ ویسے اُس کے ابا لاہور میں رہتے تھے وہیں اُن کا ہیڈ آفس تھا۔ مگر جب سے اُن کا لڑکا کاروبار میں شریک ہوا تھا۔ انہوں نے ایک دفتر کراچی میں بھی بنا لیا تھا ـــــ آدھا وقت وہ کراچی میں رہتے اور آدھا وقت لاہور میں جو کنٹریکٹ کراچی میں ملتے وہ ان کا بیٹا سنبھال لیتا۔ اس طرح بہت اچھا کاروبار جا رہا تھا۔

بظاہر اماں اور پاپا کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ سو وہ گھر میں ہر روز آنے لگا۔ اور جب اُس کے ابا کراچی آئے تو اس نے باقاعدہ رشتے مانگنے کے لئے انہیں بھیجا۔ ایک ہی بیٹا تھا اُن کا اور انہوں نے آج تک اُس کی کوئی بات ٹالی نہ تھی۔

ایک دن وہ بولا۔

"بھئی یہ شادی کا معاملہ تو لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں۔ شادی روایتی انداز میں نہ ہو ـــــ"

"تو کیسے ہو ـــــ؟"

"بالکل ڈرامائی انداز میں ——"

"بھئی اپنی امّی سے کہو جلدی سے کوئی تاریخ رکھ دیں۔ مَیں تو اپنے سارے دوستوں کو فون کر کے کہوں گا۔ شام کو میرے ہاں اکٹھے ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔ وہ آئیں تو ان کو پکڑ کر اُدھر لے آؤں اور نکاح ہو جائے۔"

"واہ کیا اچھی تجویز ہے۔ قربان ہو جانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"دیکھو اگلے ہفتے میرے ابّا امریکہ جا رہے ہیں۔ شاید دو ماہ بعد آئیں اور دو ماہ میں انتظار نہیں کر سکتا۔ پھر تمہیں اغوا کروانا پڑے گا۔"

"اتنا عرصہ کیسے گذارہ کیا تم نے ——؟"

"ہو ہی جاتا تھا گذارہ ——؟" وہ ایک آنکھ بند کر کے بولا۔ "مگر اب جب تمہیں دیکھ لیا ہے تو گذارہ نہیں ہوتا۔"

"سوچ لو ہم نے ہر کام دُنیا سے ہٹ کر کرنا ہے۔"

تجویز تو بڑی انوکھی تھی۔ اس نے دِل میں سوچا —— کون سی بات اس شخص کی عجیب یا زالی نہیں تھی۔ ہر بات میں کوئی نیا پن تھا۔ اسی واسطے تو قوسیہ بُری طرح ڈول گئی تھی۔

پُورے خاندان میں اُس کی عجیب و غریب دریافت کے چرچے ہو رہے تھے۔ سہیلیاں اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتیں۔ اور کہتیں۔

"آخر تو نے وہ انوکھا نرالا —— آدمی ڈھونڈ ہی لیا نا؟"

"جوئندہ یابندہ" وہ آنکھیں نچا کر کہتی۔ "بندیو —— ! ڈھونڈنے والا پا ہی لیتا ہے۔ اگر آدمی مایوس نہ ہو تو ——"

ویسے جب تنہائی میں اُس نے منوچہر کی پیش کش پر غور کیا تو وہ اُسے بہت اچھی لگی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود شادی کے رسم و رواج کی قائل تھی۔

اماں یہ بات نہ مانتی تھیں۔ ان کا جی چاہتا اپنی لاڈلی اور سب سے چھوٹی بیٹی کو خوب ارمان نکال کر رخصت کریں۔

لیکن بات ہفتے کے اندر اندر ٹھہرانی پڑی —— منوچہر جیت گیا تھا —— اور شادی والے دن اُن کے ہاں اتنا رش تھا۔ سب لوگ اس خاص الخاص آدمی کو دیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے۔ جسے قوسیہ نے خود چنا تھا۔ بلکہ خود ڈھونڈ کر لائی تھی۔

دیکھنے میں اس کی شخصیت دلآویز تھی۔ اور انداز بھی جداگانہ تھا۔ اس لئے سبھوں نے تعریف ہی کی، بلکہ اس کی پسند کی داد دی کہ لڑکی واقعی تیز تھی، جو کہا کر دکھایا۔ ایسا نصیب بخت لوگ لاتے ہیں۔

شادی کے بعد منوچہر اُس کو بازو سے پکڑ کر یوں موٹر تک لایا۔ جیسے آج ان کی شادی کی سالگرہ ہو —— لوگ دیکھتے رہ گئے اور وہ موٹر اسٹارٹ کر کے چلا بھی گیا —— گھر پہنچ کر اُس نے قوسیہ سے کہا۔

"اب روایتی دلہن بن کر مت دکھاؤ۔ ابھی لوگ آنا شروع ہو جائیں گے۔ انہیں انٹرٹین کرو۔ اور انہیں بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیئے کہ تم آج پہلی بار اس گھر میں آئی ہو ——"

بڑا عجیب حکم تھا۔

قوسیہ مُسکرائی۔

یہ بھی اچھا تجربہ ہو گا۔

اُس نے مہمانوں کو ایک پل کے لئے محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ آج کی دلہن ہے بہت لوگ تھے جن کو اچانک فون کر کے بلایا گیا تھا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں زیادہ تھے۔ خوب ہنگامہ ہوا —— شور و غل، ہاؤ ہو —— چیخ و پکار —— خورد و نوش —— گیت سنگیت —— منوچہر اُس کو پکڑ کر ہر ایک سے کچھ اس انداز میں تعارف کرا رہا تھا۔

"یہ قوسیہ ہے میری گہری دوست!"

بڑی جدّت تھی اس تعارف میں۔

اور وہ اس کے ہاتھوں میں پگھلتی جا رہی تھی۔

جانے کب رات ڈھلنے لگی۔

وہ جب اپنے کمرے میں آنے لگے تو صبح کے تین بجے تھے۔

اُف ——

تھکاوٹ سے اُس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور جلد از جلد سو جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے منوچہر کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ چور تھا —— کیونکہ اُس نے باری باری کئی لڑکیوں کے ساتھ رقص کیا تھا۔ ٹھیک ہے اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے اور دھم سے پلنگ پر گر پڑا۔

وہ جب غسلخانے سے واپس آئی تو وہ اوندھا لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔

واہ ——

وہ دور کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ یہ کیسی سہاگ رات ہے۔ دولہا میاں تھک ہار کر بے سُدھ پڑے ہیں۔

نہ حسنِ خوباں کی بات —— نہ کیف و مستی کی رات ——

تھوڑا سا اس کے جی میں غصہ آیا۔ پھر نہ جانے وہ کب سو گئی۔ صبح اس وقت اس کی آنکھ کھلی جب منوچہر اُس پر جھکا ہوا تھا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے ——" وہ نیند میں بڑبڑائی۔

"اچھا تمہاری زبان میں اس کو بے ہودگی کہتے ہیں۔"

"رات تو ایسے اجنبی بنے تھے۔"

"اچھا تو رات کا غصہ ہے۔ بھئی اس ہنگامے کے بعد کسے ہوش تھا۔"

"اچھا چھوڑیئے پھر، رات گئی۔ بات گئی۔"

"اب اتنی روایتی نہ بنو۔ یاد رکھو ہم نے ہر کام دنیا سے نرالا کرنا ہے۔ لوگ سہاگ رات مناتے ہیں۔ ہم سہاگ دن منائیں گے ——"

"واہ ——" قوسیہ کو ہنسی آ گئی۔ "جو بھی آپ کہہ دیں۔ اسی پر ایمان لے آئیں؟"

"ہاں لانا ہی پڑے گا۔"

"آج تو نہیں ——"

"دیکھتے ہیں۔ کیسے نہیں۔ . . . ."

اور پھر اس تمکنت کے جنون کے آگے قوسیہ کو ہار ماننی پڑی۔ کس قدر خوبصورت تھا۔

وہ دن ——

وہ دن —— جو کئی ہزار سہاگ راتوں سے انوکھا، نرالا اور خوشبوؤں سے بھرا تھا۔ اُس کی محبت کا انداز بھی بالکل منفرد تھا۔

اگلا ایک ہفتہ دونوں نے گھر پر گذارا۔

نہ کہیں باہر گئے، نہ کسی سے ملے —— نہ کوئی گھر پر آیا۔ اگر کوئی آتا، تو ملازم کہہ دیتا —— "مری گئے ہیں۔"

وہ دونوں تھے اور محبت کی وارداتیں ——

تبھی تو پہلی رات کی بے حسی کا شکوہ قوسیہ کے دل میں نہ تھا۔

زندگی میں ایک موڑ آتا ہے۔

جب یوں محسوس ہوتا ہے، آدمی کہکشاں پر چل رہا ہے۔ ارد گرد تارے بکھرے پڑے ہیں۔ حتیٰ کہ قدموں کے نیچے بھی تارے ہی تارے ہیں۔

جب ستاروں کی روشنی اس قدر قریب ہو اور آنکھوں کو چکا چوند کر رہی ہو۔ تو پھر بہت سی چیزیں نظر نہیں آتیں۔

ہنی مون کا زمانہ اسی طرح گزرنے لگا۔ جیسے اکثر نو بیاہتا جوڑوں کا گزرتا ہے۔ ایک مہینے بعد ہی دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ منوچہر کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ شہر کے رئیس، زعیم، فنکار، صنعت کار، سب سے اس کی دوستی تھی۔ حتیٰ کہ حسین و جمیل، شوخ و شنگ لڑکیاں بھی اس کی دوستی کے حلقے میں تھیں۔ تب تو سیہ سوچا کرتی کہ وہ واقعی بڑی خوش قسمت ہے۔ اتنے بے شمار لوگوں میں اُس نے اُسے چنا تھا۔ کوئی بات تو تھی اس میں غرور اور سُرور سے وہ سرشار ہو جاتی۔ اور چاہتی بھی یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ منوچہر کی پسند میں ڈھل جائے ـــــ اس کی رضا کا پیراہن اوڑھ لے۔ انگ انگ اس کے رنگ میں رنگ لے۔

دعوتیں اور پارٹیاں خواہ گھر میں ہوتیں، یا گھر سے باہر ـــــ منوچہر ہمیشہ یہ چاہتا وہ اس کی پسند کے کپڑے پہنے، اس کی پسند کا میک اپ کرے اور جس طرح وہ چاہے اسی طرح محفل میں اٹھے بیٹھے، ہر تقریب پر جانے سے پہلے وہ کپڑوں کے بارے میں اس سے

مشورہ لیتی تھی۔ منوچہر ہمیشہ یہ چاہتا کہ وہ بالکل سادہ کپڑے پہنے۔ برائے نام میک اَپ کرے ـــــ اُس کے دوستوں سے زیادہ بے تکلف نہ ہو ـــــ محفل میں زیادہ ہنسا اور بولا نہ کرے۔

ٹھیک ہے۔ وہ دل میں سوچا کرتی۔ آتنا ہر دلعزیز آدمی نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی کسی طور پر ہدفِ تنقید بنے۔

مگر اس کے ڈھیروں کپڑے یونہی ضائع چلے گئے۔ کبھی جو وہ اپنی پسند سے تیار ہو گئی تو اس نے فوراً بدلوا دیئے۔

رفتہ رفتہ وہ اُسے اس بات کی تلقین کرنے لگا کہ اچھی اور مہذب عورتیں گھروں میں بیٹھتی ہیں۔ گھرداری اور باورچی خانے میں دلچسپی لیتی ہیں۔ تو سیہ زیادہ اہتمام کرنے لگی۔

اگر وہ کسی پارٹی یا فنکشن میں اسے نہ لیجانا چاہتا۔ تو وہ کبھی ضد نہ کرتی۔ اگر وہ رات گئے گھر لوٹتا تو بڑی خندہ پیشانی سے اس کا انتظار کرتی رہتی۔ دیر سے آنے پر کبھی بازپرس نہ کرتی۔ اسے اپنے آدمی پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ اور وہ اس کی آئیڈیل عورت بن جانا چاہتی تھی۔ محبت کے معاملے میں وہ اتنا حاسد تھا کہ کسی کی شراکت بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اس واسطے اس کو سارے رشتوں ناطوں سے منہ موڑنا پڑا۔ اماں کو بھول گئی۔ پاپا کا خیال چھوڑ دیا۔ اپنی عزیز بہنوں کے ہاں کبھی نہیں گئی۔ یہ یاد نہ رہا کہ اس شہر میں اس کی بے شمار سہیلیاں ہیں اور فون کر کر کے تھک گئی ہیں۔

ساری دُنیا چھوڑ دی اس منوچہر کے لئے ـــــ عشق میں یوں دنیا تیاگ دینا بھی ایک خوبصورت مرحلہ ہے۔ اپنا آپ وار دینا اسی کو کہتے ہیں۔ اپنا آپ جو دُنیا میں سب سے پیارا ہوتا ہے۔ وہ کسی کے قدموں کے تلے رکھ دینا، عشق کی معراج ہے۔ کبھی جو پرانی سہیلی سرِ راہ مل جاتی تو طعنہ دیتی۔

"ارے تیسے جیسی اس طرح خاوند پر مرمٹی ہے۔ تو ہم جیسوں کا کیا ٹھکانا؟"

اور وہ سوچتی میرے شوہر جیسا شوہر بھی تو کسی کا نہیں ہے۔ ہر روز وہ اسے پہلے سے اُونچا نظر آتا۔

ہر روز وہ اس کے ساتھ پہلے سے زیادہ عشق کرتی۔
اسی طرح چھ ماہ گذر گئے۔

اب منوچہر اپنے کاروبار میں زیادہ مگن ہوگیا۔ اور قوسیہ کو گھر میں بہت تنہائی محسوس ہونے لگی۔

سارا کام وہ جلدی سے کرلیتی۔ پھر اُس کی سمجھ میں نہ آتا وہ کیا کرے۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور اس کے پاس کافی وقت تھا۔

ایک دن اس نے سوچا کیوں نہ وہ منوچہر کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹایا کرے۔ اب تو پڑھی لکھی بیویاں دفتروں میں اپنے شوہروں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

رات کو جب اس نے بڑے پیار سے منوچہر سے بات کی تو اُس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"میں سمجھتا ہوں۔ عورت کا صحیح مقام اس کا گھر ہے۔"

"میں کونسا گھر سے باہر جا رہی ہوں۔"

"مجھے عورتوں کا دفتروں میں کام کرنا پسند نہیں۔"

"اپنے شوہر کے دفتر میں تو کوئی ہرج نہیں۔"

"تمہیں نہیں معلوم دفتروں میں کس قسم کے لوگ آتے ہیں۔"

"مگر جب اپنا شوہر وہاں موجود ہو تو۔۔۔۔"

"مجھے اس طرح کی جرح پسند نہیں۔" وہ غصّے سے بولا۔ "میں نے تمہیں دفتر میں بٹھانا ہوتا تو تمہارے ساتھ شادی نہ کرتا، اور میرے دفتر میں تو عورت کا کوئی کام ہی نہیں ——"

وہ خاموش ہوگئی۔

بلکہ اسے دل میں خوشی بھی ہوئی کہ منوچہر کو دفتر میں عورت رکھنے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔

کچھ دنوں بعد اُسے ایک سہیلی ملی جس نے ایک نرسری اسکول کھول رکھا تھا۔ اور قوسیہ سے کہا۔ اگر اس کے پاس ٹائم ہو تو دو گھنٹوں کے لئے آجایا کرے۔ قوسیہ نے وعدہ کرلیا۔ اس کا خیال تھا کہ منوچہر کو اعتراض نہ ہوگا۔

مگر منوچہر کا موڈ خراب ہوگیا ——

"آخر تم کس لئے کام کرنا چاہتی ہو۔ کس شے کی کمی ہے تمہارے پاس!"

"بس ذرا وقت کٹ جاتا ہے ——"

یا باہر کی دلچسپیاں تمہیں گھر سے زیادہ لبھاتی ہیں۔"

وہ خاموش ہوگئی۔

پھر اس نے سوچا وہ پُرانی سہیلیوں سے ملنا شروع کردے۔ صبح آٹھ بجے منوچہر گھر سے نکلتا تھا اور رات کو آٹھ دس بجے آتا اور یہ سارا وقت وہ کیا کرے —— ؟ گھر کے کام تو دن کے پہلے حصّے میں ہی ختم ہوجاتے تھے۔ کتابیں پڑھ پڑھ کے بھی وہ تھک گئی تھی۔ اب ریکارڈ سننے میں بھی مزہ نہیں آتا تھا۔ جب شادی ہوجاتے تو پھر یہ چیزیں نہیں بہلاتیں ——

رفاقت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن منوچہر کا کام اس نوعیت کا تھا کہ مجبوری تھی۔ وہ جلدی گھر نہیں آسکتا تھا۔

پرانی سہیلیوں سے اس نے دوبارہ ملنا شروع کر دیا۔ طے یہ پایا کہ سب ہی ایک دن کسی ایک کے گھر جمع ہوا کریں ـــــ وہاں گپ شپ لگایا کریں۔ اور کبھی کبھی بچہ کا پروگرام بھی بنایا کریں۔

بہت سے دن بہت اچھی طرح گذر گئے۔ ہر دفعہ وہ رات کو منوچہر کو دن کی روداد سُنایا کرتی۔

پھر ایک دن منوچہر کا موڈ خراب ہو گیا۔

"میں نے تمہیں ایک غیر معمولی لڑکی سمجھ کر تمہارے ساتھ شادی کی تھی۔ مگر تم بھی عام سی لڑکی نکلیں ـــــ؟"

"میں نے کیا کیا ہے ـــــ؟"

"جو باقی ساری عورتیں کرتی ہیں۔ گھروں سے نکل جاتی ہیں۔ شوہروں کی پرواہ نہیں کرتیں۔ ان کو عیش و نشاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ فلمیں، پکنک، پارٹیاں، اور سب بکواس ـــــ"

"مگر میں تو اس وقت جاتی ہوں۔ جب تم گھر پر نہیں ہوتے"

"اور گھر سے باہر کس لئے جاتا ہوں۔ میں بھی تو تمہیں عزت و آبرو کی زندگی دینے کے لئے اتنی محنت کرتا ہوں ـــــ"

قوسیہ کو بڑی شرم آئی۔ واقعی، شوہر بیوی کے آرام کے لئے ہی تو اتنا روپیہ کماتا ہے بیوی کو اس کی قدر کرنی چاہیئے، نا کہ شوہر کا روپیہ اس طرح لٹائے۔ اس نے پارٹیوں میں جانا بند کر دیا۔ سہیلیوں سے قطع تعلق کر لیا۔ زیادہ سے زیادہ منوچہر کی خوشنودی میں لگی رہتی۔

عجیب بات ہے۔ وہ منوچہر کی کوئی بات ٹال نہ سکتی تھی۔ نہ اس کے ماتھے پر شکن دیکھ سکتی تھی۔ نہ کبھی اس سے بحث کر کے اپنی بات منوائی تھی۔ کبھی اتنا بھی تو نہ کہہ سکی کہ وہ ان بندشوں کو اٹھا لے۔ اُسے بچے کی اشد ضرورت ہے۔ منوچہر نے پہلے دن اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ ابھی بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتا ـــــ بچہ ایک زنجیر بن جاتا ہے۔ ابھی وہ خود ساری

دنیا دیکھنا چاہتا ہے اور اُسے بھی دکھانا چاہتا ہے۔

تب قوسیہ کو منوچہر کی یہ بات بہت اچھی لگی تھی! اور اس نے بھی سوچا تھا۔ دو چار سال زندگی کا لطف اٹھانے کے بعد بچہ پیدا کرنا چاہیئے ـــــ مگر اب تقریباً سال ہو گیا تھا اُسے گھر بیٹھے ہوتے ـــــ اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ ہاں سب سے اچھی مصروفیت بچے کی ہوتی ہے۔ اگر بچہ ہو جاتا یا ہونے والا ہوتا تو وہ کتنی مصروف ہوتی۔ نت نئے کام کرتی نظر آتی۔ اور پھر اسے نہ گھر سے باہر نکلنے کا خیال آتا۔ نہ وقت کاٹنے کو دوڑتا ـــــ قدرت نے جو نظام بنائے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ بچے سے بڑا دل بہلاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

عورت اپنے شوہر کو بھی بھول جاتی ہے۔

اور پھر جب تک بچہ نہ ہو جائے، عورت اپنے آپ کو ادھوری سمجھتی ہے۔ جب کبھی وہ منوچہر سے ذکر کرتی۔ تو وہ اس کا مذاق اڑاتا ـــــ

"لڑکیاں سب بے وقوف ہوتی ہیں ـــــ بس اوپر ایک تمغہ چڑھا لیتی ہیں۔ جب کہ ہمارے ملک کی لڑکی کبھی بھی نہیں بدل سکتی ـــــ"

وہ بڑی حیران ہوتی۔ لڑکی تو پیدائشی ماں ہوتی ہے اور بچے کی تمنا کوئی معیوب نہیں ہے ـــــ دنیا کے ہر خطے کی عورت یہ تمنا رکھتی ہے۔

بہر حال منوچہر تو ایک عام آدمی نہیں تھا۔ وہ تو ایک غیر معمولی قسم کا انسان تھا اور جس کی انوکھی عادتوں پر وہ مرمٹی تھی۔

سال پورا گذر گیا۔

پورا سال وہ اسی ادھیڑ بن میں لگی رہی ـــــ اور آخر کامیاب ہو گئی۔

کبھی کبھی ایسی حرکتوں سے جی بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی، اگر بچہ ہو جائے تو پھر منوچہر کا کیا ردِ عمل ہو گا۔ بچہ دیکھ کر تو اس پر پیار آ ہی جاتا ہے! اور پھر ایک سال گزر گیا تھا۔ اس عرصے میں کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ منوچہر ہمیشہ کام میں مصروف رہتا تھا۔ اسے سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی اور وہ ساری دنیا دیکھنے کا خواب اب معدوم ہو گیا تھا۔

تین مہینے پورے اس نے چھپائے رکھا۔ اور جب طبیعت قابو میں نہ رہی۔ تب

منوچہر کو بتانا پڑا ——

وہ حسب توقع برہم ہوا ——

وہ اس کی ہزاروں باتیں مانتی تھی اور ماننا چاہتی بھی۔ مگر یہ بات ماننے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ کوئی اپنی جھولی خالی کرتا ہے —— کسی نے کبھی خوبصورت پھل توڑ کر گندگی میں پھینکے ہیں —— کوئی لہلہاتی کھیتیوں پر ہل چلاتا ہے ——؟ تو وہ کیوں اپنا کھیت ویران کرے —— گود کا پھول نوچ کر پھینکے —— اگر بچہ باپ کے لئے خوشی کا باعث نہیں بن سکتا —— تو ماں کے لئے زندگی کی سب سے بڑی راحت ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے لئے ہر دکھ برداشت کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ پھر اسے ڈر بھی لگتا تھا۔ ایسا کرنے سے اللہ ناراض ہو جائے گا۔ ممکن ہے۔ پھر اس کی کوکھ ہی نہ ہری ہو۔ ایسے کئی قصے وہ سُن چکی تھی اور اللہ کے کاموں میں دخل نہیں دینا چاہتی تھی۔

لیکن منوچہر اُس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔ جلد از جلد اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پہلے پیار سے سمجھاتا رہا —— پھر ڈانٹ ڈپٹ پر اُتر آیا مگر قوسیہ نے ایک بار بھی حامی نہیں بھری —— دن پر دن گزرتے گئے۔ اور وہ خاموشی سے ..... اپنے فیصلہ پر ڈٹی رہی۔

بس یہی بات اختلافات کا موجب بن گئی۔

اب غصہ کسی بھی بات کا ہوتا منوچہر اسی پر نکالتا اور وہ حوصلے سے سہہ لیتی۔ وہ جانتی تھی یہ عارضی غصہ ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر وہ اس کی کسی بات کا بُرا اس لئے نہیں مانتی تھی کہ اُسے معلوم تھا وہ بالکل مختلف قسم کا آدمی ہے۔ عام مردوں کی طرح نہیں ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی۔ اس کو سدھانا پڑے گا۔ اس میں بہت محنت پڑے گی —— مگر اس کے پاس اتنا حوصلہ ہونا چاہیئے کہ وہ تحمل سے اس پُل صراط پر سے گزرتی چلی جائے —— اتنی باتیں منوانے والے آدمی کو —— کبھی نہ کبھی کسی کی مان لینی چاہیئے۔ ورنہ جو اس کی شخصیت کا حسن ہے۔ وہی اس کی سب سے بڑی بدصورتی

بن جائے گی۔ پہلے تو وہ اسے کبھی کبھی باہر بھی لے جاتا تھا۔ پکچرز بھی دیکھ لیتے تھے۔ دوستوں کے ہاں بھی جاتے تھے۔ مگر اب کہیں نہیں لے جاتا تھا ——

اس لئے کہ وہ اپنے حلقۂ احباب میں بات کا دھنی مشہور تھا اور اس نے کہہ رکھا تھا۔ وہ پانچ سال تک بچہ پیدا نہیں کرے گا اور اس کی بیوی نے اس کی گردن جھکا دی تھی۔

حالانکہ وہ صاف صاف کہہ سکتا تھا کہ یہ مشیتِ ایزدی ہے۔ بالکل انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ مگر وہ بچہ ضائع کروا کے اپنی بات کا بھرم رکھنا چاہتا تھا۔ اور یہ پہلی بات بھی جو قوسیہ نے نہیں مانی تھی —— سال بھر میں پہلی بات! —— کبھی کبھی تو بیوی کو بھی اپنی بات منوانے کا حق ہونا چاہیئے۔

پھر بھی قوسیہ خفا نہیں تھی۔ کم از کم وہ سچ بولتا تھا۔ جو محسوس کرتا تھا کہہ دیتا تھا دل میں نہیں رکھتا تھا۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

موسم بہت سرد ہو رہا تھا۔ خنکی خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ننھی منی چیزیں بننے میں لگی رہتی ——

ایک دن منوچہر نے آکر بتایا کہ وہ لوگ مری سنو فال دیکھنے جا رہے ہیں۔

"میں بھی جاؤں گی" وہ خوشی سے بولی۔ کیونکہ وہ ہنی مون کے لئے کہیں نہیں گئے تھے اور منوچہر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو سنو فال دکھانے لے جائے گا۔

"تم اس حالت میں جاؤ گی ——؟" اس نے طنز سے کہا۔

"کیوں میری اس حالت کو کیا ہے —— عورتیں اس حالت میں جاتی ہیں"

"مگر تم نہیں جا سکتیں ——"

"میں آج ہی اپنی ڈاکٹر سے پوچھ آؤں گی"

"تم اس لئے نہیں جا سکتیں کہ سب مرد جا رہے ہیں"

"اچھا ——" وہ خاموش ہو گئی۔

یہ درست تھا۔ سب مردوں میں ایک عورت عجیب سی لگے گی۔ اور پھر وہ بھی ایسی حالت میں، ٹھیک ہے مرد خواہ مخواہ جھینپتا رہتا ہے۔

اُس نے خوشی خوشی منوچہر کا سارا سامان درست کر دیا۔ اس کے اصرار نہ کرنے پر وہ خوش ہو گیا تھا۔ اس لئے گھر سے بڑی اچھی طرح رخصت ہوا۔ ایک ہفتے کا پروگرام تھا۔

وہ روز رات کو دس بجے گھر پر فون کر کے قوسیہ کی خیریت دریافت کر لیتا۔ اُس کے آنے سے ایک دن پہلے اُس کا ایک دوست گھر پر آیا ـــــ جو ساتھ ہی گیا ہوا تھا۔

قوسیہ نے اس کے جلد آنے کی وجہ پوچھی ـــــ تو اس نے بتایا کہ اس کی بیوی گر گئی تھی اور اس کے پاؤں کو موچ آ گئی تھی۔ اس لئے وہ جلد ہی آ گیا ـــــ

"کیا بھابی بھی گئی تھیں؟"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ ہم نے آپ کو بہت مس کیا۔ مگر پتہ چلا کہ آپ کو ڈاکٹر نے اس سفر سے منع کیا ہے۔"

قوسیہ کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔

"ہاں ـــــ" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ پھر پوچھا

"اور کون کون لوگ تھے ـــــ اور کس کس کی بیویاں ساتھ تھیں؟"

"سبھی لوگ اپنی بیویوں کو لے کر گئے تھے۔ سوائے منوچہر اور اظفر کے ـــــ آپ کو معلوم ہے اظفر کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی ـــــ وہ اپنی گرل فرینڈ کو ساتھ لے گیا تھا۔"

"اس کے علاوہ اور کون لوگ تھے ـــــ؟"

اُس نے دھڑکتے دل پر قابو پا کر پوچھا۔

"بس ہمارا پورا گینگ تھا۔ ہاں ایک اور لڑکی بھی تھی۔"

"کیا نام تھا اُس کا ـــــ؟"

"مہ پارہ اس کا نام تھا۔ اور سب اسے پارہ پارہ کہتے تھے۔"

"وہ کس کے ساتھ گئی تھی ـــــ؟"

"غالباً منوچہر کے ساتھ گئی تھی۔ کہہ رہا تھا اس کی سیکرٹری ہے۔ ابھی دفتر میں رکھی ہے اُس نے ـــــ!"

اس کے بعد اگرچہ اُس میں زیادہ سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ مگر وہ بیٹھی رہی۔ اتنی تیزی

سے اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوئی ـــــ کہ اُسے یقین آ گیا۔

اس کے جانے کے بعد ـــــ قوسیہ اس طرح پڑی رہی جیسے لاش ہو۔

صدمہ اس بات کا نہیں تھا کہ منوچہر بھی عام آدمیوں کی طرح ہرجائی نکلا۔ صدمہ اس بات کا تھا کہ اس نے جھوٹ بولا۔ اور جھوٹ کی بنیاد پر جو رشتے استوار ہوتے ہیں، وہ کبھی دُور تک نہیں جا سکتے۔

اگلے دن وہ آ گیا۔

اتنا ہشاش بشاش اور خوش و خرم تھا کہ اُسے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ بس بے حسی سے اس کی سب باتیں سنتی رہی۔ بے شمار تحفے تحائف لایا تھا۔ اس کے لئے ـــــ

وہ نہیں چاہتی تھی، پہلی رات ہی لڑائی کرے۔ زیادہ تر خاموش ہی رہی ـــــ اور وہ اس کی بے حسی محسوس کئے بغیر سو گیا۔

دو تین دن میں جب اُس کی طبیعت سنبھلی تو اس نے پوچھ لیا۔

"سُنا ہے تم نے دفتر میں لڑکی رکھی ہے؟"

"ہاں ـــــ" وہ غرا کر مڑا۔

"تم تو کہتے تھے، مجھے دفتر میں لڑکیاں رکھنا پسند نہیں۔"

"اُس وقت ضرورت نہیں تھی۔"

"کیا یہ ضرورت کوئی مرد پوری نہیں کر سکتا تھا؟"

"اچھا تو اب تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟"

"میں نے تو ابھی صرف پوچھا ہے۔ تم خود چور کی داڑھی میں تنکا بن رہے ہو۔"

"خبردار جو کوئی الزام لگانے کی کوشش کی۔ میں اپنے قول و فعل کا خود ذمے دار ہوں۔"

"اسی واسطے تو تم اپنی بیوی کے بجائے سیکرٹری کو مری لے گئے تھے؟"

"بکواس بند کرو ـــــ" اس نے اتنی زور سے کہا کہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک لرز گئی۔

ایسا نہ ہو کہ اس کا ہاتھ اٹھ جائے ـــــ وہ خاموش ہو گئی۔ اور پھر جب مرد کا ہاتھ ایک بار اُٹھ جائے، پھر کبھی نہیں رُک سکتا۔

کتنے دن تک وہ خود ہی اس سے خفا رہا۔

اور زندگی پر دکھ کی کُہر چھا گئی۔

اور دلچسپی کا سامان ہی یہاں کیا تھا۔ رات کو آ کر کسی وقت بات کرتا تھا۔ وہ بھی اس نے بند کر دی۔ بلکہ بہت دیر سے آنا شروع کر دیا۔

دو چار دن وہ بھی خفا رہی اور جب اس کو یقین ہو گیا کہ وہ اسے نہیں منائے گا تو خود اسے پہل کرنا پڑی۔

یوں تو اور بہت سے میاں بیوی کے جھگڑے اس نے سُن رکھے تھے اور اُن کے ہاں یہ کوئی معیوب بات بھی نہ تھی پھر بھی وہ نہیں چاہتی تھی، لوگ اس کی پسند پر کیچڑ اُچھالیں اور اُسے طعنہ دیں۔

ادھر وہ ایسی حالت میں تھی کہ ذرا سا دکھ بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ ظالم اس کی دلجوئی کرنے کی بجائے تکلیف دینے کی حرکتیں کرتا۔

جانے کیسے صلح ہو گئی۔ اور صلح بھی اس نے غیر مشروط طریقے پر کر لی تھی۔

اب زیادہ وقت منوچہر کا دفتر میں گزرتا۔ اور گھر میں بھی ہوتا تو بار بار اُس کی سیکرٹری کا فون آتا رہتا ـــــ

جب قوسیہ نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا تو وہ بولا

"یہ میرے کاروباری معاملے ہیں۔ خبردار جو آئندہ کبھی ان میں دخل دیا۔ تم بیوی ہو۔ اور بیوی بن کر رہو ـــــ"

ان لڑائی جھگڑوں کا اثر یہ ہوا کہ اس نے دفتر میں دو تین اور جوان لڑکیاں رکھ لیں ـــ اور شام کو وہ جتنی دیر تک دفتر میں بیٹھا رہتا۔ وہ لڑکیاں وہیں رہتیں ـــــ کوئی اسے چائے پلاتی کوئی فون پکڑاتی ـــــ کوئی ہنس کر دکھاتی۔

کوئی دکھ سا تھا قوسیہ کے سینے میں، جسے وہ محسوس نہ کرنا چاہتی تھی، بس اُسے تو اپنے بچے کا انتظار تھا۔ جیسے یہ بچہ ہی اس کے لئے خوشیوں کی نوید تھا۔ منوچہر کو اس کی تکلیف سے کوئی سروکار نہ تھا، کبھی جو وہ ہائے وائے کرتی، تو وہ کہتا ـــــ

"خود بھگتو، بک بک کر کے مجھے نہ ستاؤ!"

دن بہت تکلیف سے گزر رہے تھے۔ جب تکلیف ہو تو پھر دن بھی رینگ رینگ کر گزرتے ہیں۔ وہ چاہتی۔ جلدی سے بچہ ہو جائے۔ اس کا دھیان بدل جائے۔ اس کا دل بدل جائے۔ وہ اپنا تمام تر سگمتا ہوا پیار بچے کو دے دے۔ شاید زندگی کسی ڈگر پر چل پڑے۔

ڈاکٹر کوئی صاف بات اس سے نہیں کہتی تھی۔ جو کہتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہرحال وہ دن بھی آ گیا ـــــ

عورت کی آزمائش کا کڑا ترین دن ـــــ

اذیت اور کرب و بلا کا انتہائی لمحہ ـــــ

کہ اس لمحے سے گذرے بغیر عورت کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

یہ وہ بھٹی ہے جس میں اُسے پکنا ہوتا ہے ـــــ اور بار بار پکنا ہوتا ہے اور تب کہیں جا کر اس کی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس کی پیدائش کا مقصد حل ہوتا ہے۔

گو اُس نے اماں کو بُلوا لیا تھا۔ مگر اس کا دل چاہتا۔ منوچہر اس کے ساتھ رہے۔ اس کا ہاتھ تھام لے ـــــ پھر وہ اس اذیت، اور کرب سے ہنستے ہوتے گذر جائے گی۔ منوچہر اس وقت گھر پر ہی تھا۔

فوراً ہی ہسپتال لے کر چلا۔ راستے میں تسلیاں دیتا گیا۔ مگر اندر اس کے ساتھ نہ جا سکا۔ جا سکتا تو دیکھتا کہ عورت کتنی بہادر ہوتی ہے۔ کتنی بڑی ہوتی ہے۔ ہوش، بے ہوشی اور درد کے درمیان نکلتے ہوئے نہ جانے کتنے گھنٹے گذر گئے تھے ـــــ وہ تو کبھی کبھی سمجھتی وہ عالمِ بالا میں پہنچ گئی ہے۔ مگر پھر اماں کی آواز پہچان کر زمین پر آ جاتی۔

صحیح معنوں میں اپنے زندہ ہونے کا احساس اسے اس وقت ہوا، جب اس نے ایک نومولود کی ..... چیخ سنی ـــــ

کیسی خوشی تھی ـــــ اور کیسی ٹھنڈک تھی؟

درد کی لہریں خود ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ اور یوں لگتا تھا اس زخم زخم جسم میں جا بجا پھول

کھل رہے ہیں ـــــ پور پور سے آہ نہیں واہ نکل رہی ہے۔

اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں ـــــ دو نرسیں اور ایک ڈاکٹر ـــــ سب اپنی کارروائی میں مگن تھیں۔ ایک نرس بچے کو کاٹ میں لٹا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ اُسے ہوش آگیا ہے ـــــ اور اُس کی نیم وا آنکھوں میں ایک سوال ہے ـــــ وہ سوال جو ہر بچے کی ماں کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔

"بیٹا ہوا ہے ـــــ" لیڈی ڈاکٹر نے بڑے کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے معنی خیز نظروں سے اس نرس کی طرف دیکھا، جو بچہ لٹا رہی تھی۔ اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

قوسیہ نے نڈھال ہو کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

بہت پیارا احساس تھا ـــــ

اب وہ مرے یا جیئے ـــــ بیٹے کی ماں بن گئی تھی ـــــ میرا بیٹا، میرا منوچہر ـــــ میرا اپنا منوچہر ـــــ دوبارہ شاید وہ بے سدھ ہو گئی تھی۔

دوسرے دن بھی نرس بچے کو کمرے میں نہیں لائی۔ اور تیسرے دن بھی ـــــ تو اس نے چلانا شروع کر دیا۔

دو دن تو اس کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ روز اسے فینڈ کی گولیاں دے کر سلا دیتے تھے۔ مگر تیسرے دن تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔ اس نے اماں سے شکایت کی۔ تو اماں بولیں۔

"میں کیا جانوں ہسپتال کے دستور، میری تو کوئی سنتا نہیں ـــــ"

دو تین بار نرسوں سے کہا۔ انہوں نے کہا۔ جب ڈاکٹر صاحب کا حکم ہوگا۔ بچہ لایا جائے گا۔

شام کو منوچہر ذرا کی ذرا آیا ـــــ

اس کے چہرے پر ایسی روشنی نہ تھی، جو بچے کی پیدائش کے بعد آجاتی ہے ـــــ اس نے منوچہر سے شکایت کی کہ ابھی تک بچہ لا کر اس کو نہیں دکھایا۔ وہ بولا

"میں ڈاکٹر سے بات کروں گا ـــــ"

کچھ ایسے ہی رُوکھی رُوکھی باتیں کیں اور اٹھ کر چلا گیا۔ کیا اس طرح شوہر اپنی بیویوں کو پوچھنے

ہسپتال میں آتے ہیں۔ کیا یہ پہلے بچے کی خوشی منائی جا رہی ہے ـــــ اماں ہیں تو الگ سر نہیوڑے بیٹھی ہیں۔ باقی بیٹیوں کی دفعہ تو ہسپتال میں چہکا کرتیں۔ لڑکی ہو یا لڑکا ـــــ خوشی سے پاگل ہو ہو جاتی تھیں ـــــ

کیا وہ لوگوں سے اپنے لئے خوشی کی بھیک مانگنے جاتے۔

چوتھی صبح خود ڈاکٹر دیکھنے آئی تو وہ رو پڑی ـــــ اس کا گرم گرم دودھ بھی اتر آیا تھا ـــــ اور دودھ بچے کو بلا رہا تھا۔ وہ ایک کرب میں مبتلا ہوتی جاتی تھی۔

ڈاکٹر نے سب کو کمرے سے نکال دیا اور اس کے پاس پلنگ پر ہی بیٹھ گئی۔ اور پھر بولی۔

"آپ پڑھی لکھی ہیں۔ سمجھ دار ہیں اور پڑھی لکھی سمجھدار لڑکیوں سے کوئی بات نہیں چھپانی چاہیئے۔ ان کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھتی بھی ہیں اور نصیحت پر عمل بھی کرتی ہیں۔ میں خود ماں ہوں اور ماں کے جذبات بڑی اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ خصوصاً پہلے بچے کی پیدائش پر ذہن اور دل کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ خوب جانتی ہوں۔ ـــــ میں نے تین دن آپ سے ایک بات چھپائی تھی۔ اب چونکہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں آپ سے آپ کے بچے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن آپ وعدہ کریں میری بات غور سے سنیں گی۔ اور اس پر عمل کریں گی۔"

گو قوسیہ کا دل کسی ناخوشگوار بات کے اندیشے میں ڈوبتا جاتا تھا۔ مگر اُس کو جاننے کی بھی جلدی تھی۔

آنسو پونچھ کر اس نے وعدہ کر لیا۔

"آپ کو معلوم تو ہے کہ آپ کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ مگر بدقسمتی سے یا سوتے اتفاق سے بچہ ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے وہ دماغی طور پر ٹھیک نہ ہو۔ فی الحال ماہرین کو دکھایا جا رہا ہے۔ اس کے سر کے ساتھ ایک بہت بڑا گولا ہے۔ جو بعد ازاں آپریشن کے ساتھ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔ اب میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔ ہر قسم کے علاج اور اپریشن ہو رہے ہیں۔ بعض اوقات ناممکن، ممکن ہو جاتا ہے۔ بچہ آپ کے پاس لایا جائے گا۔ مگر آپ بیوقوف ماؤں کی طرح اسے دیکھ کر رو تیں چلائیں گی نہیں، بلکہ ہمارے ساتھ تعاون کریں گی اور جب تک ہسپتال میں رہنا پڑا رہیں گی۔ ہم سب کی یہ کوشش ہوگی کہ بچہ ٹھیک ہو جائے۔"

قوسیہ نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

آنسو پھر دوڑے چلے آرہے تھے۔ میرا بچہ ـــــ میرا بچہ ـــــ اس کا ایک ایک آنسو کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نرس بچہ لے کر آگئی۔

بچہ بہت پیارا تھا۔ گول مول ـــــ صحت مند ـــــ مگر اُس کا سر ـــــ

اُس کا اپنا سر تیزی سے گھومنے لگا۔

ڈاکٹر نے بچہ اس کی گود میں دے دیا۔ اور پھر اپنی ڈاکٹری کی زبان میں سب اونچ نیچ اسے سمجھاتی رہی اور کہا کہ دودھ پینے کے وقت بچہ اس کے پاس بھیج دیا کرے گی۔ جب تک باقی ڈاکٹر کوئی اور مشورہ نہیں دیتے، وہ ہسپتال میں ہی رہے گی۔

دُکھ کرنے اور جلنے کڑھنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، وہ جانتی تھی ـــــ

اس وقت دعا اور دوا کی ضرورت تھی ـــــ

اور اس سے زیادہ صبر اور تحمل کی ـــــ بچے کے لئے ماں صلیب پر لٹک جاتی ہے۔

سو اس نے بھی اپنے دل میں ایک صلیب بنالی۔

اُسے تین ماہ ہسپتال میں رہنا پڑا۔ دو مہینے کے بعد بچے کے سر کا ایک آپریشن ہوا۔ جس کے نتائج خاطر خواہ نہیں تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا۔ ایک سال گزرنے کے بعد اس کا ایک اور آپریشن ہوگا اس کے بعد معلوم ہو سکے گا، بچہ دماغی طور پر صحیح ہوگا یا ناکارہ ہوگا۔

دُکھ کی وزنی صلیب سینے پر اٹھا کر وہ گھر آگئی۔

بچہ تو گود میں تھا مگر خوشی دل میں نہ تھی۔

وہ معصوم سارا دن پالنے میں پڑا رہتا۔ بھوک کے وقت ذرا سا روتا، جیسے رونے کی طاقت نہ ہو۔ کبھی کبھی آنکھ کھولتا مگر نظر میں پہچان نہ ہوتی ـــــ نہ خواب میں سپیاں دیکھ کر ہنستا ـــــ نہ پریوں کے اڑ جانے پر منہ بسورتا ـــــ

غوں غوں نہ کرتا ـــــ ٹانگیں نہ چلاتا ـــــ رو رو کر ماں کو پریشان نہ کرتا۔ نہ وہ دوڑی دوڑی اِدھر اُدھر پھرتی۔

ـــــ وہ خود ہی وقت پر دودھ پلا دیتی۔ بعض اوقات بغیر مانگے ہی ـــــ کہ کھائے بغیر تو کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔

اتنے پیارے پیارے کپڑے ـــــ چیزیں ـــــ کھلونے۔

یونہی اسے نہلا کر اچھے کپڑے پہنا کر چیزیں اِدھر اُدھر رکھتی رہتی۔

اسے چھوڑ کر کہیں نہ جاتی ـــــ ایسے بچے کا کون خیال رکھ سکتا ہے ـــــ؟ کوئی آتا تو اس کو بچہ نہ دکھاتی۔ کوئی بچے کا نام پوچھتا۔ تو خلاؤں میں دیکھتی رہتی۔

کیا نام رکھوں اپنے بچے کا ـــــ

جس کی آنکھ میں ماں کی تصویر نہیں ـــــ

جو ماں کو پہچانتا نہیں ـــــ ہنستا نہیں ـــــ روتا نہیں ـــــ جس کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا ـــــ کچھ بھی نہیں ـــــ

وہ بچہ۔ ماں کی ٹھنڈک اور اس کی آنکھوں کا تارا۔ اس کا دل درد سے لبریز ہو جاتا۔ نہیں یہ میرا بچہ ہے۔ بس میرا ہے۔ جیسا بھی ہے۔ میری آنکھوں کی روشنی ہے۔ میری امیدوں کا گلشن ہے۔

اور پھر اُس نے خود ہی اس کا نام "چمن" رکھ دیا۔

میرے چمن میں بھی بہار آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ وہ اس کا خوشبوؤں سے بھرا مکھڑا چوم لیتی اور پھر دیوانہ وار چومتی ہی چلی جاتی۔

چمن ـــــ چمن ـــــ اسے پکارا کرتی۔ اس نے کبھی ماں کی زبان سے اپنا نام نہیں سنا۔ اور نہ ہنس کر جواب دیا۔

لیکن وہ اس کا چمن تھا ـــــ اور وہ مامتا کی ریت نبھاتے جاتی۔

ماں کو وہی بچہ زیادہ پیارا لگتا ہے جو کمزور ہو۔ بیمار ہو ـــــ سب بچوں سے کم تر ہو۔ مگر اس کا تو یہی ایک آنکھ کا تارا تھا۔

کیا وہ اس بات پر سارا دن جلا اور کڑھا کرتی کہ باقی ایسا بچہ اس کو خدا نے کیوں دے دیا؟ تو سنئے اُس نے اس پھول کو سینچا تھا۔ اور اب جیسا بھی تھا۔ وہ اس پر سے نثار ہو جانا چاہتی تھی دنیا تو اس نے پہلے ہی چھوڑ رکھی تھی۔ اب تو بالکل ہی تارک الدُنیا ہو گئی تھی۔ شہر میں کیا ہو

رہا ہے۔ لوگ کیا کچھ کر رہے ہیں ـــــ تفریح کسے کہتے ہیں ـــــ سنگھار، کپڑے ـــــ فیشن ـــــ کب اور کیسے ـــــ؟

سب ایک بچے پر وار دیا تھا اس نے ـــــ ہاں ہفتے میں ایک بار وہ ہسپتال ضرور جاتی تھی بچے کو لے کر ـــــ یا اُس کے علاوہ جب ڈاکٹر سے مشورہ لینا ہو۔ تب اسے ارد گرد دیکھنے کا کچھ ہوش نہ ہوتا۔

امّی اور بہنیں آ کر اس کی خبر لے جاتیں اور اسے خوب تسلّی دیتیں۔ کتنی بار انہوں نے کہا کہ بچے کے لئے آیا رکھ لے۔ اور ذرا سی دیر کو تفریح کے لئے باہر نکلا کرے۔ مگر وہ انکار کر دیتی ایسے بچوں کا آیا کب خیال رکھتی ہے۔ اُسے تو ایک منٹ چھوڑنا بھی گوارا نہ تھا۔ چاہے اس کا کتنا بڑا نقصان ہو جاتا۔ ہاں یہ احساس اسے بہت دن سے ہو رہا تھا۔

منو چہر اس کی طرف سے لاپرواہ ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں دو چار بار اسے کہیں جانے کو کہا تو اس نے بچے کا عذر کر دیا۔ اب وہ کہتا ہی نہ تھا۔ ہاں وہ کب جانا چاہتی تھی۔ منو چہر اس کی دلدہی کرے ـــــ اس کو تسلّی دے۔ چاہے جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے کہے کہ بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔

پھر کیا ہوا ـــــ یہ بھی اتفاق ہے۔ اللہ کو ہماری آزمائش مقصود ہے۔ مجھے تو کوئی گِلہ نہیں۔

وہ تو کچھ بھی نہیں کہتا تھا۔ شام کو وہ اکثر اُسے بچے کے بارے میں بتاتی۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہتا۔ اور پھر کروٹ لے کر سو جاتا۔

ایک دن وہ اُلجھ پڑی ـــــ

"کیا یہ صرف میرا بچہ ہے؟"

"تمہاری ضد سے ہوا ہے۔ میں نے کہا تھا ضائع کرا دو۔ مگر خود سر عورتیں اپنی سزا ضرور بھگتتی ہیں ـــــ"

"کیا میں خود سر ہوں؟" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ماتا کو اگر خود سری کہا جاتا ہے تو واقعی میں خود سر تھی۔ بچے کی چاہ کی۔ اور پھر اُس کو پیدا کرنا چاہا ـــــ مجھے کیا معلوم تھا ایسا

ہوگا۔ ورنہ گناہ کر لیتی۔ تب بھی شاید ضمیر کی خلش جینے نہ دیتی۔ صبح کو اس نے بچے کو سینے سے لگا کر کہا ـــــ

"تو صرف میرا بچہ ہے۔ تو صرف میری مرضی سے آیا ہے ـــــ اور تو بیمار ہے ـــــ بیمار بچہ صرف ماں کا ہوتا ہے ـــــ"

تو میرا چمن ہے ـــــ میری پژمردہ آرزوؤں کا پژمردہ چمن ـــــ!

شکوہ اچھا نہیں لگتا۔ اور ویسے بھی اس کو عادت نہ تھی۔ پر کبھی اُس کا جی گھبرا اُٹھتا۔ دل چاہتا ہے کوئی اور ہمارا بوجھ بٹائے۔ بٹانے میں کسی کا کیا جاتا ہے۔

ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے بڑے پیار سے کہا۔

"منو، تم روز ہی دیر سے آتے ہو۔ رات کو مجھے ڈر لگتا ہے"۔

"روایتی عورت نہ بنو۔ اب تم ماں ہو۔ اور ننھی بچیوں جیسی بات کر رہی ہو"۔

"کیا ماں عورت نہیں ہوتی۔ اور عورت کا دل نہیں ہوتا۔ اتنے بڑے گھر میں بیمار بچے کے ساتھ میں رات بھر جاگتی ہوں سو طرح کے وہم آتے ہیں۔

"اچھا کل سے میں ایک اور چوکیدار کا بندوبست کر دوں گا۔ جو رات بھر جاگا کرے گا ـــــ"

تو سیہ اُٹھ کے بچے کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اکثر بچے کے کمرے میں ہی سوتی تھی۔ کیونکہ منو چہر نے تو بچے کی پیدائش سے پہلے ہی کہہ دیا تھا وہ یہ بک بک اپنے کمرے میں پسند نہیں کرے گا۔ رات کو سکون سے سونا چاہتا ہے کہ صبح کو اُٹھ کے کام کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بھی رات کو بچے کے کمرے ہی میں سو جاتی تھی۔

اس نے دل میں سوچا پیسے والے آدمی سے یہ کہنا کہ مجھے ڈر لگتا ہے، کتنی فضول بات ہے وہ چوکیدار کے علاوہ کیا سوچ سکتا ہے۔ مگر چوکیدار دل کے اندھیرے تو نہیں دور کر سکتے۔ صرف محبت اور اعتماد کی ایک مشعل دُور تک روشنی دکھاتی ہے۔

مگر دوسرے دن گھر میں ایک اور چوکیدار آ گیا۔ ہو ساری رات ڈنڈا لے کر گھر کے ارد گرد چکر لگاتا رہتا۔

پھر ایک دن منو چہر نے بتایا کہ آج گھر میں ڈنر ہے۔ اور بہت سے لوگ آئیں گے۔ اس کو

اپنی زندگی میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوتی۔ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا گھر میں یہ سب کچھ ہونے لگے گا۔ تو وہ بھی مصروف ہو جائے گی۔ ذرا دل بہل جایا کرے۔ وہ سوچنے لگی۔ آج کیا کیا پکانا ہوگا ــــ کیسے گھر سجانا ہوگا۔

ــــ مگر منوچہر کے جاتے ہی ایک موٹر آکر رُکی۔ بے شمار لوگ اترے۔ ملازم نے آکر بتایا کہ "صاحب نے ان لوگوں کو بھیجا ہے۔ یہ خانسامے اور بیرے ہیں۔ اور کچھ لوگ گھر کی سجاوٹ کے لئے آئے ہیں۔"

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔

سب لوگ اپنے اپنے کام میں مگن ہو گئے۔ منوچہر نے اُن کو سمجھا دیا تھا۔ باورچی خانے میں کھانا پکنے لگا ــــ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم میں مزید سجاوٹ شروع ہو گئی۔ ایک مکروہ صورت لڑکی بھی تھی جو سارے گھر میں پھول سجاتی پھر رہی تھی۔ دو بجے تک وہ لوگ گھر سجا کر چلے گئے۔ لیکن خانسامے اور بیرے باورچی خانے میں مگن رہے۔ اس نے اٹھ کر سارا گھر دیکھا ــــ یہ سب تو وہ بھی کر سکتی تھی۔

پھولوں کی سجاوٹ میں کیا نئی بات تھی۔ بیسیوں قسم کے پھول تو وہ خود لگا سکتی تھی۔

شام کو چھ بجے منوچہر آیا ــــ اور جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔ اُس نے سوچا وہ بھی تیار ہو جائے۔

"میں کون سے کپڑے پہنوں آج ــــ"

وہ اس سے پوچھنے گئی۔ وہ بولا ــــ "کیوں ــــ؟"

"آج گھر میں دعوت ہے۔"

"تمہیں اس میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں ــــ" اس نے بے رُخی سے کہا۔

"یہ خالص کاروباری دعوت ہے۔ اور میں بیوی کو اس میں شامل کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔"

"اور لوگوں کی بیویاں بھی تو آئیں گی۔"

"وہ سب مجبوری ہے۔ ایسی محفلوں میں بُلانا پڑتا ہے۔"

"تو میں بھی ایک طرف چپ کر کے بیٹھ جاؤں گی۔"

"میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ تمہیں جانا چاہیئے یا نہیں ــــ"

"تو عورتوں کی پیشوائی کون کرے گا؟"

"دفتر سے لڑکیاں آجائیں گی۔"

"دفتر کی لڑکیوں کا شامل ہونا ضروری ہے۔ اور بیوی کا نہیں ــــ"

"اتنی سی بات تمہاری عقل میں نہیں آسکتی۔ تو تم میری بیوی کہلائے جانے کے قابل کیسے ہو سکتی ہو۔ بک بک کر کے میرا موڈ خراب نہ کرو۔ اگر اس طرح تنگ کرتی رہیں تو میں تمام کاروباری محفلیں گھر سے باہر کرنے لگوں گا ــــ شہر میں ہوٹلوں کی کمی نہیں ہے۔"

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

خوب روئی، دل کھول کے روئی۔ بیوی ہونا جرم تھا کیا؟

اور جب اچھی طرح رو چکی تو پھر اس نے اپنے دل سے کہا۔ اتنے بڑے آدمی سے تم نے خود شادی کی تھی۔ اور یہ سب قباحتیں اس بڑے آدمی کے ساتھ رہیں گی۔ اور تمہیں برداشت کرنا ہوں گی۔

مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ سارا گھر روشنی سے جگمگ کر رہا تھا۔ قہقہے اور چہچہے اسے سنائی دے رہے تھے۔ مگر وہ کمرے کی بتی بجھائے لیٹی تھی۔

پھر ایک دم گھنگھروؤں کی جھنکار کی آواز آئی۔ تو اُسے اُٹھ کر جانا پڑا۔ ڈرائنگ روم میں وہ آسانی جھانک سکتی تھی۔ ــــ خوبصورت عورتیں تھیں اور خیرہ چشم اُن کے لباس تھے۔ رنگ و نور بکھرا پڑا تھا۔

اور درمیان میں ایک عورت گھنگھرو باندھے رقص کر رہی تھی۔ اور گا رہی تھی ــــ شاید یہ بھی کاروبار کا ایک حصہ تھا۔

غصہ، نفرت، بغاوت ــــ ہر منزل سے وہ کھڑے کھڑے گزر گئی۔ اور پھر تسلی سے اک اک کو دیکھنے لگی۔ اتنا حوصلہ تو اس میں تھا۔

شاید شراب کا دور بھی چل رہا تھا۔ سب پی رہے تھے۔ اور گانے والی پر نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔ شاید یہ بھی کاروبار میں شامل ہے۔

منوچہر نے خوب پی رکھی تھی۔

اور اس قدر فضول اور فحش حرکتیں کر رہا تھا کہ اگر وہ محفل میں شریک ہوتی تو اُٹھ کر اس کے مُنہ پر تھپڑ مار دیتی۔

ہاں اسے معلوم تھا، وہ کبھی کبھی پیتا ہے۔ کیوں کہ پہلی رات اس نے خود ہی بتا دیا تھا کہ کاروبار میں کبھی کبھی پینی پڑتی ہے۔ پر معاذ اللہ وہ اس حالت میں بھی ہو سکتا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا، شاید اسی لئے اس نے توسیہ کو دعوت میں آنے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن اگر وہ اجازت دے دیتا تو وہ اس کو بھی سہہ جاتی۔ کیا کچھ نہیں سہنا پڑتا اس دنیا میں۔

جب منوچہر نے لڑکھڑا کر گانے والی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو وہ وہاں رک نہ سکی۔ سب لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ آنکھوں میں آنسو لئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ بچہ ہمیشہ کی طرح بے سدھ پڑا تھا ——— اس کے پاس چہرہ رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ پتہ نہیں آج دل کو کیا ہو گیا تھا۔

رات دو بجے تک محفل جوان رہی۔ اور ایک ماں اپنے بیمار بچے کے سرہانے بیٹھی روتی رہی

"دُنیا میں سب سے زیادہ ضروری شے شاید کاروبار ہوتا ہے۔"

اس نے دل میں سوچا ——— بیوی اور بچہ ثانوی جگہ پر آتے ہیں۔

دوسری صبح بارہ بجے منوچہر اُٹھا ——— مگر اُس کا موڈ بہت اچھا تھا، بار بار اُسے بلا رہا تھا مگر اُس نے کچھ نہیں کہا۔

وہ کہتی تو ایک ہی بات کہتی ———

مگر اُس نے بیمار بچے کی طرف دیکھا۔ چھ مہینے ہو گئے تھے۔ اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ باقاعدہ علاج ہو رہا تھا۔ بہت پیسہ خرچ ہو رہا تھا۔ اور سال بعد اس کا آپریشن ہونا تھا۔ جو بہت ضروری تھا۔ اور بچے کے علاوہ اُسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

اس کے بعد اکثر گھر میں ڈنر پارٹیاں ہونے لگیں۔ مگر وہ ہمیشہ کاروباری ہوتیں کیونکہ توسیہ کو کبھی شرکت کی اجازت نہ ملی۔

دو ایک بار دبے لفظوں میں احتجاج بھی کیا تو منوچہر نے کہا ———

"تم اس قابل نہیں ہو کہ ان پارٹیوں میں شریک ہو سکو۔"

"کیا میں تعلیم یافتہ نہیں۔ خوبصورت نہیں؟ بات کرنے کا سلیقہ نہیں ———؟"

"ذہنی طور پر تم بہت دقیانوس ہو۔"

ٹھیک ہے۔ اگر تم یہ پسند کرتے ہو کہ دوسرے مردوں کے ساتھ ٹھٹھے لگاتے جاؤں۔ اور تمہیں دوسری عورتوں کے ساتھ بیہودگیاں کرتے دیکھ کر میں بُرا نہ مانوں، تو میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

منوچہر شرمندہ ہو گیا۔

"تمہیں معلوم نہیں یہ کاروباری لوگ ہوتے ہیں۔ اور اُن سے کیا بات کرنی پڑتی ہے۔"

"تو میں چپ رہا کروں گی۔"

"لوگ تمہاری خاموشی سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ اور میں بیچ میں اپنی بیوی کو نہیں لانا چاہتا۔"

"تو پھر تم نے مجھے بیوی بنایا ہی کیوں۔ تمہارا تو شادی کئے بغیر بھی گزارہ ہو رہا تھا۔"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں۔ تم ابھی ذہنی طور پر اس قابل نہیں ہوئیں کہ ان محفلوں میں شریک ہو سکو ———"

"تو کب ہو سکوں گی ———"

"ابھی بہت مدت درکار ہے۔"

"اگر تم اپنے پاس رکھ کر مجھے یہ سب نہیں سکھا سکتے تو پھر کون سکھائے گا۔"

"جب وقت آئے گا۔ سکھا دوں گا۔"

"کب وقت آئے گا ———؟"

"اگر تم مجھے تنگ کرو گی تو میں گھر سے باہر جانے لگوں گا۔"

ہاں ایک ہی ڈراوا تھا اس کے پاس ———

وہ سوچتی۔ وہ گھر سے باہر رہے یا گھر میں کیا فرق پڑتا ہے ——— اور کس جنم کی سزا اسے مل رہی ہے۔ بہت سی باتیں۔ عورت شوہر کے گھر میں جا کر سیکھتی ہے۔ یہ جو اتنا بڑا آدمی ہے۔ اتنا پڑھا لکھا اور مہذب ——— اندر سے کتنا تنگ نظر ہے۔

لیکن پھر بھی وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ یہ پہلا آدمی تھا، جس کے آگے اُس کے دل نے سجدہ کیا تھا ———

پہلا سجدہ اور پہلا معبود!

اور محبت میں تو بڑے سخت مقام بھی آتے ہیں۔ پاؤں اُکھڑ جائیں تو کیسی محبت ——— ؟

پھر اُس کا دھیان اپنے بچے کی طرف چلا جاتا ———

اور جیسے دن گن گن کے وہ پورے کر رہی تھی۔ جسمانی طور پر بچہ بالکل ٹھیک تھا۔ اور ماہ بہ ماہ اس کی نشو و نما ویسی ہو رہی تھی۔ لیکن دماغی طور پر اُس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

پھر بھی اُس کو امید تھی کہ ایک نہ ایک دن اس کا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔

"سنو منو۔ میری بات سنو ———" وہ لپکتی ہوئی منوچہر کے پیچھے چلی۔ وہ کسی ضروری کام سے باہر نکل رہا تھا۔ "پلیز ذرا مجھے امّی کے پاس چھوڑ دو ——— میں نے ———"

ابھی اس نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ پلٹ کر غرّایا۔

"میں ایک ضروری میٹنگ پر جا رہا ہوں۔ اس طرح مجھے مت پیچھے سے پکارا کرو۔"

"اور ہاں ——— تمہیں شوہر کو بلانے کی تمیز نہیں ہے۔ جیسے کوئی ملازم کو بلاتا ہے ———"

"میں نے تو کوئی بُری بات نہیں کہی ———" وہ روہانسی ہو گئی۔

"اسی لئے تو تمہیں کبھی فرق محسوس نہیں ہوا۔" اس کی موٹر باہر نکل گئی۔

پلکوں پہ دو قطرے آئے تھے۔ اس کو سمجھانے۔

گئے دنوں کی بات ہے۔ جب وہ اس کے عشق میں مبتلا تھا۔ جب پہلے پہل توسیہ نے اُسے فون کیا۔ تو ڈرتے جھجکتے بولی۔

"آپ ..... آپ منو ———"

اور کہہ کر رک گئی ———

"میرا مطلب ہے جمالی صاحب!"

"توسیہ! تم مجھے آج سے منو کہا کرو۔ تمہارے منہ سے منو کہنا بہت اچھا لگتا ہے اور یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے ——— ساری دنیا مجھے آپ کہتی ہے ——— خدا کے لئے تم نہ کہو ——— "تم" سے بات کرو یا تو کہو۔ دُوری کا احساس مٹ جاتا ہے ———"

توسیہ کو یہ فرمائش بہت پسند آئی تھی۔ منو اُس کی جان بن گیا تھا۔ اور تم درد زبان ——— یکایک

آدمی اتنا بڑا کیسے ہو جاتا ہے کہ اس کو چھوٹی چھوٹی باتیں بری لگنے لگتی ہیں۔ اب اپنی زبان کو دوسرا انداز تخاطب سکھانا مشکل تھا کہ اس میں دوئی کی بُو جو نہیں تھی۔

کافی دن تک وہ سوچتی رہی۔ مگر کہہ نہ سکی۔ پھر اس نے سوچا وہ بیوی ہے اور اپنے حقوق منوا سکتی ہے ——— پھر کبھی بات کرے گی۔

انہی دنوں منوچہر نے آکر بتایا کہ وہ امریکہ جا رہا ہے۔

اُس کے دِل میں ایک آس اُبھری، بولی ———

"مجھے اور بچے کو بھی لے چلو ———"

"کیوں ——— ؟"

"بچے کا وہاں چل کے علاج کرائیں گے۔"

"میرے پاس اتنی فرصت نہ ہو گی۔ میں تو اپنے کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔"

"کیا کام ہے وہاں ———"

"ابا کچھ کام کر آئے تھے۔ اور کچھ چھوڑ آئے تھے۔ اور مجھے کچھ نئی مشینری بھی خریدنا ہے۔ وہاں کچھ کاروباری لوگوں سے ملنا بھی ہے۔"

"میں تمہیں بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ بس کسی ہسپتال میں بندوبست کر دینا۔"

"میں ساتھ تو نہیں لے جا سکتا۔ البتہ وہاں کہیں انتظام کرا آؤں گا۔ بعد میں تم بچے کو لے کر چلی جانا۔"

"اچھا ———" وہ اسی پر راضی ہو گئی۔

"تم اکیلے جا رہے ہو ——— ؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں ——— شاید ... کسی کو لے جانا پڑے۔"

آگے اُسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

جس دن وہ جا رہا تھا۔ اس نے ہولے سے پوچھ ہی لیا۔

"اور بھی کوئی جا رہا ہے ساتھ ———"

ہاں میری سیکرٹری مہ پارہ جا رہی ہے۔"

"وہ کیوں جا رہی ہے ——؟" بے اختیار اُس نے پوچھ لیا۔

اس لئے کہ بہت سے کاروباری نکتے وہ جانتی ہے۔ اور میرے تمام کاغذات وہ ٹائپ کر دیا کرے گی۔ بہت سی باتیں وقت سے پہلے آؤٹ کرنے کی نہیں ہوتیں ——"

"کوئی بات نہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "میں تو پہلے ہی سوچ رہی تھی۔ بڑے بڑے کاروباری ہمیشہ اپنی سیکرٹریوں کے ساتھ سفر کرتے اچھے لگتے ہیں۔"

اُس کا جواب سُنے بغیر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے بعد —— انتظار کی ایک تنہا شام اُس کا مقدر بن گئی۔

ایک مہینہ خدا خدا کر کے بیتا تو اُس کا فون آ گیا کہ ابھی اور رکنا پڑے گا —— ابھی اور —— ابھی اور —— کہتے کہتے تین ماہ بیت گئے۔ اور وہ آ گیا۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ خوب صحت مند اور خوش و خرم لگ رہا تھا۔ قوسیہ کا دل چاہا اُسے اپنے سینے سے لگا لے۔ پھر اُس نے اپنی طرف دیکھا تو وہ خود کو بڑی ہی معمولی شے لگی۔ تب اُس نے ذہن سے یہ خیال جھٹک دیا۔ منوچہر اُس کے لئے بے شمار تحائف لایا تھا مگر بچے کے لئے کچھ نہیں لایا تھا —— اُس نے پوچھا تو وہ ٹال گیا۔

قوسیہ اور آزردہ ہو گئی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ اب وہ کوئی مہربانی بھی کرتا تو اس کے دل کو تکلیف ہوتی تھی۔ دن بہ دن اسے احساسِ کمتری ہوا جاتا تھا —— وہ جو بڑی بہادر تھی، نڈر تھی سڑکوں پر منہ کھلے پھرا کرتی تھی —— اور ہر ایک سے ٹکرا جاتی تھی۔

ایک کونے میں دُبکی پڑی رہتی۔ ہر بات سے ڈر لگتا۔ ہر شے سے ڈر لگتا —— اپنے آپ پر اعتماد نہ رہا تھا۔ جانے کس نے چھین لیا تھا۔ اس کا اعتماد ——؟

ہاں ایک بات کی خوشی ضرور ہوئی تھی ——

منوچہر واپسی پر انگلینڈ ہوتا آیا تھا اور اس نے بچے کی رپورٹیں اور ایکسرے وغیرہ دکھائے تھے۔ جو جاتے وقت قوسیہ نے اُسے دے دیئے تھے اور اس کے داخلے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اگلے مہینے قوسیہ کو بچے کو لے کر وہاں جانا تھا۔ اس ایک بات پر اس نے منوچہر کی ساری

خطائیں بخش دی تھیں۔

جس دن اُسے انگلینڈ جانا تھا وہ بوکھلاتی بوکھلاتی پھر رہی تھی۔ یہ تو صحیح ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اتنی دور کا سفر کر رہی تھی اور وہ بھی تنہا —— تنہائی بھی کچھ ایسی خوفناک نہیں تھی ایک بیمار بچہ بھی گود میں تھا اور اس کے ساتھ —— آس اور یاس بھی دامن گیر تھی۔

کبھی وہ پُرامید ہو جاتی۔ اور کبھی سوچتی جانے کیا ہو گا۔ کیسے واپس آنا ہو گا۔ ہاں وہ اتنی گھبراتی ہوتی اگر منوچہر اس کے ساتھ جا رہا ہوتا۔ اس نے اُسے بہت کہا تھا۔ منت بھی کی تھی۔

مگر وہ بولا ——

"یہ کام کا مہینہ ہے۔ اور میں سارا مہینہ وہاں رہ کر وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا ——" حالانکہ وہ تین ماہ اپنی خوشی سے باہر رہ کر آیا تھا۔

نیا دیس، نئے لوگ —— کچھ بھی تو اُسے خبر نہ تھی۔ البتہ منوچہر نے کئی لوگوں کے پتے دیئے تھے، جو وہاں اس کی مدد کرنے والے تھے —— بہت سے پیسے بھی دیئے تھے اور کہا تھا، پیسوں کا فکر نہ کرنا۔ جتنے دل چاہے اور منگوا لینا۔ وہاں سب سے اچھے ہوٹل میں اس نے اس کا بندوبست کر دیا تھا۔

سارا خاندان ہی اُسے چھوڑنے کے لئے ایرپورٹ پر آیا تھا۔ مگر منوچہر کو ایک ضروری کام تھا اور وہ گھر سے ہی خدا حافظ کہہ کر دفتر چلا گیا تھا۔ اس کا مختصر سامان دیکھ کر ہر کوئی تعجب کر رہا تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا اٹیچی اور ایک بچے کی ٹوکری جس میں اس کی ضرورت کی چیزیں تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ اتنا کچھ لے جانے کا کیا فائدہ۔ چند جوڑوں کی ہی تو ضرورت تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو سب پریشانی کے آنسو سمجھ رہے تھے اور بار بار اسے تسلی دے رہے تھے۔ مگر وہ بار بار باہر مین گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ابھی کوئی آنے والا ہو۔

جہاز اڑ گیا اور کوئی نہ آیا۔

چلنے سے پہلے اماں نے اُس کے ہاتھ میں جوتی کا فون نمبر تھمایا تھا اور کہا تھا۔ "میں نے اُسے اطلاع بھی کر دی ہے۔ جاتے ہی اُسے فون کر کے بلا لینا۔ تمہاری کافی مدد کرے گا۔" اُس نے

بے دلی سے فون نمبر پریس میں رکھ لیا تھا اور سوچا تھا۔ وہ جونی کو کیوں تکلیف دے گی ——؟

مگر جب وہ اجنبی دیس کے ہوائی اڈے پر اتری تو سب سے پہلے اُسے اجنبی لوگوں میں جونی کا چہرہ نظر آیا۔ پھر جب باہر نکلنے سے پہلے اس نے آکر اس کا بکس پکڑا تو اسے خود بخود تسلی ہو گئی۔ بچے کے ساتھ وہ بھلا سامان کیسے اٹھاتی —— جونی تو سبھی جگہوں سے واقف تھا۔ جلدی اسے اُس کے ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں بچے کے بارے میں مفصل گفتگو ہوئی۔ تب اسے قوسیہ کے چہرے پر چھائی زردی اور سیاہ حلقوں کا راز معلوم ہو گیا۔ ورنہ قوسیہ کو پہلی نظر میں دیکھ کر کس قدر دکھ ہوا تھا اُسے ——؟

صبح کو منوچہر کے دوستوں نے ازراہِ مروّت ٹیلیفون کئے۔ کہ کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو؟ مگر اُس نے شکریہ کے ساتھ ان کی مدد لوٹا دی۔ اس کے لئے جونی کافی تھا، جو ابھی تک مخلص تھا اور ہر کام میں پیش پیش تھا۔

بچے کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ دن کو وہ ہسپتال میں ہوتی اور رات کو ہوٹل میں واپس آ جاتی۔ علی الصبح جونی اُسے ہسپتال چھوڑ جاتا اور ڈبے میں بند کر کے کھانے کا سامان بھی دے جاتا اور پھر شام کو دفتر سے سیدھا وہیں آ جاتا اور اسے ہوٹل چھوڑ جاتا۔

ہر دوسری تیسری رات قوسیہ منوچہر کو فون کر کے بچے کا حال بتاتی۔ اور جس طرح جونی اس کی خدمت کر رہا تھا، وہ بھی بتاتی۔

کبھی منوچہر گھر پر ملتا اور کبھی نہیں —— مگر وہ پیغام ضرور دے دیتی۔

بچے کا ایک آپریشن تو جاتے ہی ہوا۔ جو کامیاب ہو گیا۔ تھا۔ اور ایک بیس دن کے بعد ہوا پہلے آپریشن کے بعد وہ کافی پُرامید تھی۔ اس لئے دن بہت اچھی طرح گذر گئے۔ البتہ رات کو جب وہ ہوٹل میں آ جاتی تو اُسے بہت وحشت ہوتی۔ اتنی تنہائی ہوتی کہ دُور تک سناٹے ہی سنائی دیتے۔

تب وہ لیٹی جانے کیا کیا سوچا کرتی۔

زندگی کی تنہائیوں کا گلہ نکھر کر سامنے آ گیا تھا۔

اور اسے سمجھ نہیں آتی تھی —— کیا سوچے اور کیا نہ سوچے۔

پھر وہی ہوا جو قدرت کو منظور تھا۔ دوسرے آپریشن کے بعد بچہ جانبر نہ ہو سکا۔

اور دیارِ غیر میں اس کو روتا بلکتا چھوڑ گیا۔

اس شام اُس نے بلک بلک کر فون پر منوچہر کو پکارا۔ اور اسے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ منوچہر نے اسے تسلی دی اور کہا اسی میں بہتری ہو گی۔

اس نے کہا وہ بچے کو وطن واپس لانا چاہتی ہے۔

اس بات سے منوچہر نے اتفاق نہ کیا۔ اور بولا "اندوہناک یادیں ساتھ نہیں لانی چاہئیں۔ وہیں دفنا دو۔ اور فوراً واپس آ جاؤ"

جونی کی بھی منوچہر سے بات ہوئی۔ اس لئے اس نے وہی کیا جو منوچہر نے کہا تھا۔ لیکن قوسیہ کی حالت اُس سے سنبھالی نہ جا سکی۔ سیٹ بھی تین دن بعد کی ملی۔ جونی نے دو دن کی چھٹی لے لی تھی۔ اور سارا سارا دن اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ وہ اکثر خودکشی کی باتیں کرتی تھی اور وہ اُسے پھر سے پہلے والی قوسیہ بن جانے کی تلقین کرتا تھا۔

آخر جب اس کا جنون بڑھ گیا تو وہ اسے زبردستی اپنے اپارٹمنٹ میں لے آیا۔ اسے ڈر تھا کہیں واقعی اکیلے میں وہ خودکشی نہ کر لے۔ جب قوسیہ یہاں آئی ہے تو خود اسے بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اور کیوں ——؟

اور اب ایک رات آرام کرنے کے بعد۔ اس کا ذہن یوں جاگا تھا۔ جیسے ایک صدی کے بعد نیا جنم لیا ہو۔

ابھی ابھی وہ تازہ دم تھی۔

مگر جانے کیسے سب پرانے زخم کھُل گئے تھے۔ پھر چیخنے چلّانے کو دل چاہ رہا تھا۔

اس نے کلائی پر لگی گھڑی دیکھی —— دوپہر کے دو بج رہے تھے —— اور جونی کو شام چھ بجے آنا تھا —— جبکہ اس کا جہاز پچھلے پہر تین بجے اُڑنے والا تھا۔

اس نے میز پر رکھی نیند کی گولیوں کی شیشی اٹھائی۔ اور ایک گولی پانی سے نگل لی —— چھ بجے تک کس طرح اس زخمی ذہن کے سہارے رہا جائے گا۔ جانے وہ کیا کر بیٹھے۔

وہ سو جانا چاہتی تھی۔
وہ کھو جانا چاہتی تھی۔
اب کچھ بھی یاد نہ کرنا چاہتی تھی۔

جونی کھڑا اُس کے سرہانے چلا رہا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی۔ کچھ دیر پہلے نیند میں اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کنوئیں میں لٹکی ہے۔ اور دور دراز سے آوازیں ڈول کی مانند لٹکتی آ رہی ہیں۔ کروٹ لے کر اُس نے اچھی طرح جاگ جانا چاہا۔ آنکھیں مل کر دیکھا۔ تو واقعی جونی سامنے کھڑا تھا۔ اس کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک لمبی سانس فضا میں چھوڑی

قوسیہ نے غور کیا تو اس نے ہاتھ میں نیند کی گولیوں کی شیشی بھی پکڑی ہوئی تھی۔

"افوہ! میں نے سمجھا تم مر چکی ہو ـــــ اس طرح گھوڑے بیچ کر سوئی تھیں۔ اس وقت سے شیشی میں سے بقایا گولیاں نکال نکال کر گن رہا ہوں کہ خدا جانے تم نے کتنی کھالی ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس میں پہلے سے کتنی تھیں پورا آدھا گھنٹہ ہو گیا جگاتے ہوئے۔"

وہ انگڑائی لے کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

جونی بھی کھڑا ہو گیا۔

"کم بخت کو کچھ احساس ہی نہیں ـــــ اگر کچھ ہو گیا ہوتا ـــــ تو سب لوگ یہی کہتے کہ میں نے بدلہ لینے کی خاطر تمہیں مار دیا ـــــ"

اس بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ اور پھر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"کاش جونی تم مجھے مار سکتے۔ مگر تم میں تو اتنی ہمت بھی نہیں ـــــ"

"چلو تم میں تو ہے۔ تم نے تو مجھے مار دیا ـــــ"

کہنے کو تو جونی یہ کہہ گیا۔ مگر فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا مقصد بالکل نہیں تھا ایسی بات کہنے کا یا یاد دلانے کا۔ خصوصاً ایسے وقت میں اور اُس کو ڈر بھی تھا کہ قوسیہ بُرا مانے گی

باورچی خانے میں جا کر چائے کی کیتلی لگا دی۔ آواز دے کر قوسیہ سے پوچھا ــــ "کیا اس نے دوپہر کو کچھ کھایا بھی ہے؟" مگر وہ بیٹھی جونی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جونی کا یہ کہنا آج اُسے بڑا اچھا لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی جونی کچھ اور بھی کہے ــــ مگر جونی ازل سے بُزدِل تھا۔ بھاگ گیا تھا۔

"ارے میں پوچھ رہا ہوں کچھ کھایا کہ نہیں ــــ"

"ناشتے کے بعد سے سو رہی ہوں۔ اب خود اندازہ لگا لو۔"

اُف خدایا، یہ لڑکیاں کتنی لاپرواہ ہوتی ہیں۔ یہ کیسے گھر بساتی ہیں۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اندر گیا۔ کچھ ڈبے اٹھا لایا۔ ان میں سینڈوچ، پنیر اور کیک تھے۔ "جلدی سے کھاؤ۔ میں چائے بنا کر لاؤں۔"

قوسیہ نے ذرا بھی تکلف نہ کیا، کہ تم تکلیف نہ کرو۔ میں بنا دیتی ہوں وغیرہ وغیرہ۔

یوں خدمت کروانا اُسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چائے کی دو پیالیاں تھام کر وہ بھی اُس کے پاس آ بیٹھا۔

"جونی ــــ" وہ کھاتے کھاتے بولی۔

"تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی ــــ"

"لو شروع ہو گیا فلمی سین۔ اب تم پرانی رفاقت کا واسطہ دے کر کہو گی ــــ میں تم سے ایک آخری بھیک مانگتی ہوں۔ میری جھولی خالی نہ لوٹانا۔ خدا کے واسطے شادی کر لو۔ یہ ہی میری زندگی کی آخری خوشی ہے وغیرہ وغیرہ۔" اس نے زنانہ لہجہ بنا کر اتنی اچھی ایکٹنگ کی کہ غموں سے چور قوسیہ کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔

پھر تھوڑی دیر چُپ رہ کر بولی۔ "میرا یہ کہنے کا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا شادی ہر ایک کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے ــــ"

پھر وہ رُک گئی

شاید اس کے لاشعور میں کوئی ایسی خواہش تھی ــــ یا وہ چاہتی تھی ــــ جونی کچھ کہے ... کوئی ماضی کی بات ــــ حوالہ ــــ اس کی چاہ ــــ مگر پھر اُس نے سوچا یہ کمینگی

ہو گی۔

"ہاں مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اپنی پسند کا آدمی مل گیا ــــ" تھوڑی دیر بعد جونی خود بولا۔

"ہر آدمی کے نصیب تو تم جیسے نہیں ہوتے۔"

چائے پیتے پیتے قوسیہ مُسکرائی۔

"تو پھر تم انگلینڈ کیوں بھاگ آئے تھے؟"

"ایسے ہی ــــ ایک عمر میں لڑکے جذباتی ہوتے ہیں اور عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں یہاں میرا دل نہیں لگتا۔"

"تو واپس چلو ــــ"

"ہمیشہ کے لئے تو نہیں ــــ مگر اب تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"سچ مچ ــــ!" قوسیہ کی پیالی چھلکتی چھلکتی رہ گئی۔

"اسی لئے تو مجھے دیر ہو گئی۔ اپنے لئے ٹکٹ لینے گیا تھا۔ اور سیٹ کا بندوبست کرنے بھی ــــ"

"تو مل گئی سیٹ ــــ؟"

"کیسے نہ ملتی۔ پی۔ آئی۔ اے میں اپنے بہت یار ہیں۔ میں نے سیٹ بھی بالکل تمہارے برابر والی لی ہے ــــ تاکہ ہمسفری کا لطف بھی رہے ــــ"

قوسیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ ذرا سی ہمسفری پر کتنا خوش ہو رہا ہے۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں اور اپنے آنسو چھپانے لگی جونی نے اس کو سنجیدہ دیکھ کر کہا۔

"تمہیں تنہا بھیجنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں۔ اتنا تو کر سکتا ہوں۔ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ آخر کو تمہارا کزن ہوں۔ ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور پھر امّی جان سے بھی مل لوں گا۔ پورے پانچ سال ہو گئے ان سے بچھڑے۔"

"اور صرف ایک ہفتے کے لئے اتنے پیسے خرچ کر رہے ہو؟"

اور پیسے کس لئے ہوتے ہیں۔ دل کی ذرا سی خوشی بھی ان سے نہیں خریدی جا سکتی ــــ میں سمجھتا ہوں پیسہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ انسان اُس سے اپنے لئے یا دوسروں کے لئے

سچی خوشی خرید سکے ـــــ اگر یہ خوشیاں دینے کے کام نہیں آتا تو پھر یہ دشمن بن جاتا ہے"۔

قوسیہ پھر خاموش ہوگئی۔

وہ سوچنے لگی سچی خوشی کیا ہوتی ہے۔

خواب ـــــ

خواب کی تعبیر ـــــ

یا حسرت ـــــ!

اس کو چپ دیکھ کر وہ پھر بولا

"شاپنگ کرنے جاؤ گی"۔

"کس لئے ـــــ؟"

"بھئی جب کوئی پردیس سے جاتا ہے۔ تو پیاروں کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر ہی جاتا ہے۔ یہ تو دستور ہے۔ اور تمہارے پاس ابھی چھ گھنٹے اور ہیں۔ کہو تو بازار لے چلوں ـــــ"

"نہیں مجھے کسی کے لئے کچھ نہیں لینا"

"اور اپنے بالم کے لئے بھی نہیں ـــــ؟"

"اوہ ـــــ اُن کو دینے کے لئے میرے پاس بہت کچھ ہے"۔ یہ کہہ کر وہ لیٹ گئی۔

"جیسی تمہاری مرضی ـــــ"

"پھر مجھے تھوڑی دیر کے لئے اجازت دو۔ کچھ تحفے تحائف لے آؤں ـــــ پھر گھوم گھام کر ائرپورٹ چلیں گے"۔

"ٹھیک ہے ـــــ"

جہاز پر سوار ہونے سے پہلے انہوں نے منوچہر کو اطلاع دی تھی۔ اور باقی سب گھر والوں کو بھی ـــــ چند گھنٹوں کا یہ راستہ جونی کی دلچسپ باتوں میں جلدی کٹ گیا۔ قوسیہ کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ شاید وہ منوچہر کو ایرپورٹ پر دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور چلا چلا کر رونے لگے۔ یہ سوچ کر ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ کہ وہ اُس سے کیسے ملے گی۔

جب وہ کراچی ائرپورٹ پر اُترے تو عزیزوں کا ایک ہجوم تھا۔ جانے اُسے لینے آئے تھے یا جونی کو ـــــ

اماں اور بہنوں کے گلے لگ کر وہ خوب روئی۔ سب نے پیار کیا اور خوب تسلی دی۔ بار بار اُس کی متجسس نگاہیں لاؤنج میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ پھر ذرا فاصلے پر کھڑا باوردی ڈرائیور اسے نظر آگیا۔

اس پر نظر پڑتے ہی اُس نے سلیوٹ مارا ـــــ وہ خود ہی قریب چلی گئی۔

"صاحب نہیں آئے ـــــ؟"

وہ گھر پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔

بہت اچھی لگی اسے منوچہر کی یہ بات ـــــ اس سے جس طرح وہ ملنا چاہتی تھی۔ وہ سب کے سامنے کچھ ممکن نہ تھا۔

اماں نے بہت کہا۔ میرے ساتھ چلو ـــــ مگر وہ کل پر ٹال کر ڈرائیور کے ساتھ باہر نکل آئی۔ وہ

اپنے گھر جانا چاہتی تھی ـــــ اپنے منوچہر کے پاس ـــــ

موٹر سے اُتر کر وہ سیدھی بیڈ روم میں چلی گئی۔

وہاں کوئی نہیں تھا ـــــ غسل خانہ دیکھا ـــــ

پھر ڈریسنگ ٹیبل پر ایک چٹ پڑی ملی ـــــ

"ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں جانا پڑ گیا ہے۔ جلدی آ کر تم سے ملوں گا ـــــ"

منوں برف احساسات پر چھا گئی۔

کاش وہ اماں کے ساتھ چلی گئی ہوتی۔ وقت کاٹنا کتنا دوبھر ہو جائے گا۔ ادھر ادھر گھوم پھر کر وہ سارے گھر کا جائزہ لینے لگی۔ ہر شے اپنی جگہ پر تھی ـــــ بچے کی چیزیں اور کپڑے دیکھ کر ایک بار پھر وہ رونے لگی۔ مگر گھر میں کوئی چپ کرانے والا نہ تھا۔

عجیب وحشت ہو رہی تھی اُسے۔

اپنی الماریاں ٹھیک کرنے لگ گئی کتنے گھنٹے گذر گئے مگر منوچہر نہ آیا ـــــ البتہ ایک فون آیا۔

"کام بڑھ گیا ہے۔ وہ گھبرائے نہیں۔ جلد آجائے گا"

جلد ـــــ؟ صبح سے شام ہو گئی۔ اور آج کے دن بھی وہ کام نہیں چھوڑ سکتا ـــــ جب تک وہ آیا۔ اس کے احساسات شل ہو چکے تھے ـــــ وہ اتنا رو چکی تھی کہ اور رونے کی سکت نہیں تھی۔ اتنا کڑھ چکی تھی کہ اب زبان تک نہ ہلانا چاہتی تھی۔

منوچہر اسے گرمجوشی سے ملا ـــــ روایتی سی تسلی دی۔ جیسے اُس پر سے بچے کا بوجھ اُتر گیا ہو۔

ہجر کی اتنی لمبی رات کے بعد وصل کے چند لمحے ملے ـــــ

مگر وہ کیسی بے حس بنی رہی۔

منوچہر سو بھی گیا تھا۔ اور وہ جاگ رہی تھی۔

یہ سوچ کی کیسی لمبی پرچھائیاں تھیں۔ جو آج اس کے خیالوں کو محیط کئے ہوئے تھیں۔

صبح ہوئی اور وہی چکر ـــــ

منوچہر بن ٹھن کر چلا گیا تھا۔ کار میں جاتے ہوئے اُس نے اُسے بطور خاص دیکھا۔ وہ اتنا ہی خوبصورت اور دلکش تھا۔ موٹر چلاتے ہوئے کوئی شہزادہ لگ رہا تھا۔ شہزادے مڑ کر نہیں دیکھا کرتے اُس کے دل میں درد اٹھا۔ کتنے شاندار آدمی سے اُس نے محبت کی ہے۔ محبت بڑا درد ہے۔

درد دل میں رہے یا کہیں اور بھی ـــــ

"ذرا جلدی آجانا" اُس نے منوچہر سے بطور خاص کہا تھا۔

مگر وہ جلدی نہیں آئے گا۔ اُسے معلوم تھا۔ ٹھیک ہے۔ اُس کا کام بہت پھیلا ہوا تھا اور وہ سکڑ کر نکتہ بن رہی تھی۔

بہت دن ہو گئے تھے۔ اپنے آپ سے لڑتے ہوئے ـــــ زندگی کیسی ادھوری سی ہوئی جا رہی تھی ـــــ اور وہ نہیں چاہتی تھی ذہن دل سب کچھ اس طرح ختم ہو جائے۔

ایک دن اُس نے اپنی موٹر نکالی۔ اور اماں کے گھر آ گئی۔ خیال تھا۔ شام تک آجائے گی اس لئے منوچہر کو فون نہ کیا۔

اماں کے گھر بڑا سکون تھا۔

مگر یہ سکون کتنا اجنبی تھا۔

گولی کھا کر وہ سارا دن اور ساری رات سوتی رہی۔ یاد ہی نہ رہا کہ واپس جانا ہے۔ امی کے پیار نے سب کچھ بھلا دیا۔

صبح دس بجے اس کی آنکھ کھلی۔ تنہا میز پر بیٹھی وہ ناشتہ کر رہی تھی کہ جونی آ گیا۔

"اخاہ! تو امراء کی بیگمات اس وقت ناشتہ کرتی ہیں"

وہ کچھ نہیں بولی۔

ہنستا ہوا اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

جب سے آئی ہو۔ صورت نہیں دکھائی۔ میرا تو خیال تھا۔ مجھے اپنے گھر بلاؤ گی۔ شاندار ڈنر کھلاؤ گی۔ اپنے پریتم سے ملاؤ گی ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ"

"بلاؤں گی ـــــ" اس نے چائے کا گھونٹ ختم کر کے مختصر سا جواب دیا۔

"کب ـــــ؟ پرسوں تو میں جا رہا ہوں۔ امراء تنگ دل ہوتے ہیں۔ غریب رشتے داروں کو

لفٹ نہیں کراتے۔ میں جانتا ہوں۔ تم اپنے شوہر کو یہ نہیں بتانا چاہتیں کہ یہ معمولی سا آدمی تمہارا رشتہ دار ہے۔"

وہ مسکرائی۔

اور اسی لمحے باہر سے ہارن کی آواز آئی۔ یہ منوچہر کی کار کا ہارن تھا۔ وہ اچھی طرح پہچانتی تھی اور پھر یہ سوچ کر اس کا دل دھڑک اٹھا کہ منوچہر اسے لینے آیا ہے ـــــ وہ رات واپس نہیں جا سکی۔ وہ کتنا پریشان ہوگا۔

"میرا خیال ہے۔ تعارف تو تمہارا ابھی ہو جائے گا۔" اس نے پیالی رکھ کر جونی سے کہا۔

"اچھا تو صاحب بہادر آ رہے ہیں۔ واہ۔ مان لیا جی، دل کی باتوں کو ـــــ تم تو اس کا ہارن پہچانتی ہو ـــــ"

قوسیہ کے چہرے پر ایک خوبصورت سا رنگ آ گیا۔ اور دونوں ہنسنے لگے۔

اسی وقت منوچہر انتہائی سنجیدہ شکل بنائے کمرے میں داخل ہوا۔ جونی کھڑا ہو گیا۔

"جنید ـــــ" اس نے آگے ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے ـــــ"

"میں جانتا ہوں۔" جونی نے خوش دلی سے کہا۔ "ابھی کچھ سیکنڈ پہلے قوسیہ کو ٹیلی پیتھی ہوئی تھی آپ کی آمد کی ـــــ"

قوسیہ نے کرسی بڑھائی۔ منوچہر بیٹھ گیا۔ جونی بھی بیٹھ گیا۔

"کیا حال ہے تمہارا ـــــ؟" اس نے قوسیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا طبیعت زیادہ خراب تھی؟"

"ہاں۔ میں نے نیند کی گولی کھا لی اور پھر اٹھ ہی نہ سکی۔"

"محترمہ اب ان گولیوں سے چھٹی کرو۔" جونی نے کہا۔ "ان کا زیادہ استعمال آپ کو ناکارہ کر دے گا۔"

قوسیہ خاموش رہی۔

پھر ایک دم جونی کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔"

منوچہر بھی کھڑا ہو گیا۔

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ آپ نے وہاں قوسیہ کی بہت مدد کی ـــــ"

"اوہ ـــــ کیا یہ شکریہ ادا کرنے والی بات تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا ـــــ اگر میں نہ کرتا تو اور کون کرتا ـــــ؟"

منوچہر نے دوبارہ اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

قوسیہ نے نظر اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ باری باری دیکھا ـــــ

جونی منوچہر کے سامنے واقعی بہت چھوٹا اور معمولی دکھائی دے رہا تھا ـــــ نہ صرف قد و قامت میں بلکہ شخصیت میں بھی۔

چھوٹا سا قد، پکا سانولا رنگ ـــــ عامیانہ سے کپڑے ـــــ ہاتھ میں معمولی سگریٹ ـــــ

منوچہر نے انتہائی قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرہ صحت و توانائی کا اشتہار لگ رہا تھا ہر نقش اپنی جگہ درست۔ بھرے بھرے صحت مند ہاتھ ـــــ گلابی اور چمکیلے چمکیلے ناخن ـــــ ٹائی سے لے کر بوٹ تک ہر چیز امپورٹڈ ـــــ دنیا کے بہترین پرفیوم کی پیٹیں نکل نکل کر آ رہی تھیں۔ بالوں سے اسپرے کی شعاعیں نکل رہی تھیں ـــــ ہاتھ میں دنیا کی بہترین برانڈ کا سگریٹ تھا۔ کش لگانے کا انداز انوکھا تھا ـــــ نیم وا آنکھوں سے دھواں چھوڑنے کی ادا منفرد ـــــ کیسی گمبھیرتا سے بات کرتا تھا۔ جیسے سنانا نہیں چاہتا دل میں اترنا چاہتا ہے ـــــ کہاں کہاں سے ـــــ اور کیسے کیسے اس نے یہ سب سیکھا ہوگا ـــــ

واقعی ـــــ

منوچہر ایک عالیشان آدمی تھا۔

اس میں ہر وہ دلکشی تھی۔ جس پر ایک لڑکی جان تو کیا ایمان بھی لٹا سکتی ہے۔

اور جونی اس کے سامنے کتنا گھٹیا لگ رہا تھا۔

جیسے دیوتا کے سامنے بونا۔

خود اس کا احساس جونی کو بھی ہو رہا تھا۔ اسی لئے اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اور وہ فوراً جانا چاہتا تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے ہوئے تھے غالباً کچھ رسمی سی باتیں انگلینڈ

وغیرہ کی ہو رہی تھیں۔

قوسیہ کو یوں محسوس ہوا ——

منوچہر اور بھی بڑا ہوتا جا رہا ہے —— اتنا بڑا —— اتنا بڑا —— اتنا اونچا کہ اس کا سر کمرے کی چھت پھاڑ کر باہر نکل گیا ہے ——

اور جونی اس کے سامنے چھوٹا دکھائی دینے لگا —— چھوٹا —— اور چھوٹا —— اتنا چھوٹا کہ کمرے کے فرش میں دھنس گیا ہے۔

ایک آدمی اتنا بڑا ——

ایک آدمی اتنا چھوٹا ——

جونی خدا حافظ کہہ کر جا رہا تھا۔

اس نے جاتے جاتے جونی کو دیکھا۔

پھر قریب کھڑے منوچہر کو۔ اور سوچنے لگی۔

دونوں میں اسے کون اچھا ہے۔

وہ بڑا آدمی جس کا سر چھت میں سے باہر نکل گیا ہے یا —— وہ چھوٹا آدمی —— جو زمین میں دھنس گیا ہے۔

منوچہر اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کشمکش کو بھی جو اس کے چہرے پر جاری تھی

"اب اگر کسی فیصلے پر پہنچ چکی ہو تو گھر چلو ——"

قوسیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اور بولی۔

"میں اپنی گاڑی لے کر آئی تھی۔ آپ چلیں۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے آتی ہوں۔"

"میرے ساتھ چلو ——" منوچہر نے رعب سے کہا۔ "ڈرائیور بعد میں آ کر گاڑی لے جائیگا اور تم ڈرائیور کے بغیر گھر سے مت نکلا کرو۔ مجھے عورتوں کا موٹریں چلانا بالکل پسند نہیں۔"

وہ ہنس پڑی۔

"بہت پہلے کی بات ہے۔ جب تم نے کہا تھا، لڑکی موٹر چلاتی ہوئی بڑی اچھی لگتی ہے —— لیکن اب شاید میں لڑکی نہیں ہوں بیوی ہوں۔"

"میں باہر جا رہا ہوں۔ اگر تم کو آنا ہو تو فوراً چلی آؤ ——" اُس نے یہ کہا اور باہر کو لپکا۔ نہ اماں سے ملا۔ نہ سلام نہ دُعا۔

بہر حال وہ جلدی سے اماں کے پاس گئی۔ معذرت کی اور خدا حافظ کہہ کر باہر چلی گئی۔ وہ موٹر اسٹارٹ کر چکا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

موٹر چلنے لگی ——

تھوڑی دور آگے جا کر —— منوچہر بولا ——

"تمہارا عاشق کب واپس جا رہا ہے ——؟"

"کونسا میرا عاشق ——؟"

قوسیہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے ..... وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ مگر خاموش ہو گئی۔

اس نے بھی کوئی جواب نہیں دیا —— قوسیہ نے شادی کے بعد سے جونی کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا اور اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔

"اُس نے انگلینڈ میں اس طرح تمہارا دِل لگایا کہ اب اپنے گھر میں بھی نہیں لگتا۔"

وہ خاموش رہی۔ اُسے انگلینڈ کے صبح و شام اور ساری تلخیاں یاد آ گئیں۔

"اب تمہیں اس بات کی بھی پرواہ نہیں کہ شوہر کو اطلاع دو یا نہ دو —— گھر میں رہو یا گھر سے باہر ....."

ہاں شوہر کو جیسے بہت پرواہ تھی —— بہت پتہ ہے مجھے تمہارے صبح و شام کا۔ کہاں بسر ہوتے ہیں اور کس رنگ میں۔

مگر وہ پھر بھی خاموش رہی۔

"اچھا اب تمہیں اپنے شوہر سے بات کرنا بھی گوارا نہیں۔ اس کے ساتھ تو خوب ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی تھیں ——" جب اس کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ تو وہ بولی۔

"میں سوچ ہی رہی تھی آپ تمام تر الزامات لگا لیں تو پھر ایک ساتھ ہی جواب دوں۔"

"مجھے تو یہی کہنا تھا جو کہہ لیا۔"

"تو آپ نے جو کچھ کہا بالکل ٹھیک کہا۔"

اُس نے حیرت سے مڑ کر قوسیہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ غصّے سے کہہ رہی ہے ـــــ یا طنز سے ـــــ

موٹر چلتی رہی ....

خاموشی چھا گئی .....

بے شمار آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنا چاہتے تھے۔ آگے پیچھے دوڑے آتے تھے۔ اُس کے سینے میں درد سا ہونے لگا ـــــ

جانے کیسے چھنک کر سارے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ سب کیسے ہوتا ہے۔ کوئی شے جیسے پاؤں تلے آجاتی ہے ـــــ ٹوٹ جاتی ہے ـــــ کچل جاتی ہے ـــــ جیسے سب کچھ بکھر جاتا ہے۔

یہ کیا ہوتا ہے ـــــ ؟

شاید دل ہوتا ہے ـــــ ذہن ـــــ یا خواب !

کتنی جلدی زندگی رُخ موڑ لیتی ہے ـــــ

کل اس میں زندگی تھی ـــــ زندہ رہنے کی اُمنگ تھی۔

کتنی بھرپور لڑکی تھی وہ ـــــ

جلدی جلدی ورق کیوں اڑنے لگتے ہیں۔ ہوائیں تیز تیز ورق الٹتی جائیں تو زندگی کی کہانی ٹھیک طرح سے پڑھی نہیں جا سکتی ـــــ

صرف ایک شخص ـــــ

ایک آدمی ـــــ آخر زندہ رہنے کا حق کیوں نہیں دیتا۔ سب کچھ چھین کر بھی مطمئن کیوں نہیں ہوتا۔

میری اس کی کیا لڑائی ہے ـــــ

جنگیں، لڑائیاں تو اقتدار، ہوس، بربریت اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہوتی ہیں۔

محبت خود بخود جھک جاتی ہے۔

میں جھک گئی ہوں۔ میں بار آور ہونا چاہتی تھی۔ مگر بعض اوقات جھکی ہوئی ٹہنی کو بے مصرف سمجھ کر لوگ کاٹ کر لے جاتے ہیں۔ اتنا بھی کیا جھکاؤ کہ آدمی ٹوٹ جائے۔

ٹوٹا ہوا آدمی کب تک جی سکتا ہے ؟

موٹر آہستہ آہستہ چل رہی تھی ـــــ اُس کا ذہن آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا۔

بہت بڑا آدمی ہے ـــــ بہت نفیس آدمی ـــــ بہت عالیشان آدمی ـــــ اپنی ہر بات منوانے والا ـــــ اپنے آگے سجدے کرانے والا ـــــ اندر سے کتنا بودا اور تنگ دل ہو ـــــ ایسے کہ اُف کرنے کی مجال نہ ہو ـــــ پہلے حکم پر کورنش بجا لائے اور دم مارنے کی اجازت نہ ہو ـــــ

اس کا دل ـــــ اس کا جسم ـــــ اس کی خواہش ـــــ ٹکوں کے مول بک سکتی ہیں ـــــ بک جانی چاہئیں ـــــ

زندگی ـــــ

میرے خواب ـــــ

میرا ذہن !

یہی تو میرا سرمایہ تھا۔

میں نے داؤ پر لگا دیا ـــــ

بکنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ اتنی کم قیمت اپنی مت لگاؤ کہ خریدار تمہیں پاؤں تلے روند ڈالے ـــــ آدمی اپنے اوپر لبادے چڑھا لیتا ہے ـــــ وہی تنگ نظر روایتی آدمی ـــــ وہی پرانا الزام ـــــ

مجھ پر ـــــ میرے پاک ذہن پر ـــــ میری دیانتدار سوچ پر ـــــ میرے بیداغ جسم پر ـــــ بس یہی ایک پونجی تھی میری ـــــ یہی کچھ بچا کر رکھا تھا میں نے ـــــ اسی پر غرور کئے ہوتے تھی ـــــ لو سارا گمان بھک سے اُڑ گیا۔

میں نے روایات سے بغاوت کی ـــــ بھول تھی۔

میں وہی روایتی عورت ہوں ـــــ شوہر، بچے، گھر، مستقبل ـــــ

گھر کیا ہوتا ہے۔

جس کے اندر شہنشاہ بھی داخل ہو تو صرف شوہر اور باپ ہو ـــــ جس مرد کی گردن گھر کے اندر داخل ہو کر اکڑی رہتی ہے۔ نہ وہ شوہر بن سکتا ہے، نہ باپ ـــــ بیوی تو سایہ ہوتی ہے۔ سائے کو کیا دھمکانا ـــــ محبت کی زبان بیوی کو پالتو بلی کی طرح قدموں میں لا بٹھاتی ہے۔ اور بچے باپ کا مستقبل ہوتا ہے ـــــ اکڑی ہوتی گردن والے باپ باغی شہزادے تو جنم دے سکتے ہیں۔ صحیح جانشین نہیں۔

ایک عورت مرد میں کیا ڈھونڈتی ہے؟

گھر خواہ معمولی سا ہو ـــــ وہ لکڑی کا سستا اپارٹمنٹ کیوں نہ ہو ـــــ

مرد ـــــ جو تمام تر اس کا ہو ـــــ اپنے تمام تر معمولی پن اور گھٹیا پن کے ساتھ اس کا ہو ـــــ

عورت مرد کی دستِ راست ہے۔

عورت اور مرد گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔

عورت اور مرد شانہ بشانہ زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

مرد باہر کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ تو عورت گھر کی ملکہ ہے۔

جو عورت گھر کے اندر ملکہ نہیں۔ وہ کسی کے دل میں نہیں ـــــ جس عورت کے گھر کھانا پکانے گھر سجانے باہر سے لوگ آئیں ـــــ

جس کو میزبان کے طور پر کوئی نہ دیکھے ـــــ

جس کی چار دیواری میں اس کے وجود کو نہ تسلیم کیا جائے۔

جس کی زمین اس پر تنگ ہو جائے ـــــ؟

اُس کا وہاں رہنے سے مطلب ـــــ؟

اپنی کٹیا، اپنی گلی۔ اپنے مرد سے ہے ـــــ

کہاں گئے وہ شہنشاہ جنہوں نے بھکارنوں کو تختِ دل پیش کیا ـــــ اور پھر سلطنت بھی ـــــ؟

بڑائی دل سے ہے ـــــ دولت اور مرتبے سے نہیں۔

کہاں ہے وہ گداگر جو بیوی کے لئے دل کی دولت لاتا ہے۔

پگلی تو شہزادی بننا چاہتی تھی ـــــ

حقیقت میں تو جوگن ہے ـــــ لات مارانِ محلوں کو۔ دل کا اکتارہ تھام اور سکون پانے جنگلوں میں نکل جا.....

گھر آگیا تھا..... وہ سوچ کی وادیوں میں دُور نکل چکی تھی۔ گھر دیکھ کر چونکی۔ وہ خوشی نہیں جاگی جو گھر کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ منوچہر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے پھولا ہوا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ دروازہ کھول کر اتر گئی۔ ایک دھچکے سے منوچہر نے گاڑی موڑی اور باہر نکال کر لے گیا۔ ایک سیکنڈ وہ دم سادھے کھڑی رہی۔ پتہ نہیں گھر لانے کا کیا مقصد تھا؟ وہ سمجھ رہی تھی۔ آج کھل کر بات ہوگی۔ مگر وہ اسے یہ بتا کر کہ قوسیہ کی کوئی وقعت نہیں، اُس کی نظر سے دور چلا گیا تھا ـــــ

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔ کمرے ٹھنڈے اور بے سکون تھے۔ وہ اپنی بے ترتیب چیزوں کو ٹھیک کرنے لگی..... ہاں ـــــ اس کو بہت کام کرنا تھا آج شام تک اور شکر ہے۔ اسے وقت مل گیا۔ شام تک وہ فارغ ہوگئی۔ اُس نے جونی کو فون کر کے معذرت کی کہ وہ اُسے کھانے پر نہیں بلا سکتی۔ اس کے جانے کا وقت بھی معلوم کر لیا۔

پھر کتاب لے کر لیٹ گئی۔

شام کو منوچہر ذرا جلدی آگیا۔ مگر اسی طرح تنا تنا سا۔ دونوں نے کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔ وہ چاہتا تھا صلح ہو جائے۔ مگر ہمیشہ کی طرح غیر مشروط طور پر..... مگر وہ اب اس بات کے لئے آمادہ نہیں تھی۔

منہ موڑ کر سو گئی۔ تو وہ بھی اپنی انا کی بکل مار کر سو گیا۔

صبح وہ حسبِ معمول ناشتہ کر کے دفتر چلا گیا۔ قوسیہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر قوسیہ نے اسے موقع ہی نہیں دیا ـــــ

اِدھر اُدھر ہی مصروف رہی ——

گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ بینک گئی۔ اور بہت سے کام کئے —— پرانی ہوشیاری جاگ اُٹھی تھی۔

جلد جلد سارے کام نمٹائے —— امی کو ملنے گئی۔ پھر گھر آ کر اپنا سامان اٹھایا اور ایئرپورٹ پہنچ گئی ——

جونی اُسے دیکھ کر کھل اُٹھا۔

"آہا! سواری بادِ بہاری آ گئی ——؟"

"جونی! میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔"

"مگر کیوں ——؟" جونی حیرت کے مارے کھڑا رہ گیا۔

"کیوں سے کیا مراد ہے تمہاری ——؟ کیا نہ جاؤں؟"

"نہیں... دراصل ——" وہ بوکھلا گیا۔ "آخر اس طرح تمہارے جانے کی وجہ کیا ہے؟"

"تمہارے جانے کی کیا وجہ تھی ——؟"

"میں تو بزدل تھا۔ زندگی کی ناکامی کا سامنا نہ کر سکتا تھا ——"

"میں بہادر ہوں۔ اور زندگی کی بہت بڑی ناکامی کا سامنے کرنے وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

"خدا کے لئے قوس! اب تم ذمہ دار عورت ہو۔ ہمیشہ والا بچگانہ رویہ چھوڑ دو۔"

"زندگی میں پہلی بار میں نے بالغانہ رویہ اختیار کیا ہے۔"

"تمہارا گھر ہے —— شوہر ہے۔ پھر کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"یہ بتانے کا اب وقت نہیں۔ جہاز کے اڑنے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ وہاں جا کر سب بتاؤں گی۔"

وہ جلدی سے اپنا سامان اور ٹکٹ لیکر اندر چلی گئی۔ سامان چیک اِن کروا کے واپس آئی تو ابھی تک وہ تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا۔

"میں صرف ایک مہینہ تم پر بار رہوں گی۔ جاب اور گھر تلاش کرنے کے بعد الگ ہو جاؤں گی"

"تم نے خالہ جان سے پوچھ لیا ——— منوچہر سے اجازت لی ———"

"میں اب خود مختار ہوں۔ اماں سے اجازت کی ضرورت نہیں۔ رہے منوچہر ———"

ابھی فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ سامنے نظر پڑی۔ مین گیٹ سے منوچہر اندر آ رہا تھا۔ بہت لمبا خاکہ سا ———

وہ خاموش ہو گئی۔

مگر جونی کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ اس لئے وہ بولے جا رہا تھا۔

"تم نے مجھے لندن میں بتایا تھا کہ تم بہت خوش ہو۔ تمہیں تمہارا آئیڈیل مِل گیا ہے۔ اور منوچہر کو پانے کے بعد تمہیں کوئی آرزو نہیں رہی"

یہ فقرے تیز تیز آتے ہوئے منوچہر نے بھی سُنے ——— مگر قوسیہ کے چہرے پر ذرا بھی تغیر نہیں آیا۔ بولی

"ہاں تب میرا یہی خیال تھا اور کیا آئیڈیل چکنا چور نہیں ہوتے ——— شیشے میں بال نہیں آتا ———؟"

منوچہر قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

جونی اسے دیکھ کر چونک گیا۔ بلکہ ڈر گیا۔

مگر قوسیہ نے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا۔ نہ منوچہر کو کچھ کہنے کا موقع دیا۔ جلدی جلدی بولنے لگی۔

"شکر ہے اللہ کا مجھے عقل آ گئی جونی ——— ! خدا کی قسم، ایسے آدمی کے ساتھ زندگی نہیں گذر سکتی جو ہر آن اپنے آپ کو تم سے بڑا کر کے پیش کرے۔ جس کی باتیں بڑی ہوں۔ جس کے کاروبار بڑے ہوں۔ جس کو انا اور غرور کا اتنا کلف لگا ہو کہ ہمیشہ اکڑا رہے۔ اتنا شاندار آدمی جو بات کرنے سے میلا ہو۔ اور سب کچھ ہو سکتا ہے۔ شوہر نہیں ہو سکتا۔ اصل میں مجھے ایک معمولی آدمی کی ضرورت تھی۔ مگر مجھے اس وقت سمجھ نہ آ سکی۔ ایک ایسا آدمی جس کے ساتھ میں برابر کی سطح پر بات کر سکوں

وہ بات جو دنیا میں میں کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ اس سے کہہ سکوں۔ اس سے لڑ سکوں۔ اونچی آواز میں بول سکوں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے غم اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹ سکوں۔ جس کے پاس میری معمولی سے معمولی بات سننے کا بھی وقت ہو ——— دل کی داستانیں کہنے کے لئے مجھے ساری زندگی اس کے موڈ کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

اُسے بچّا اپنے پیشے سے زیادہ پیارا ہو ——— اور بیوی سے کیا ہوا وعدہ میٹنگ میں جانے سے زیادہ یاد ہو جس کی دعوتوں میں جانے کی کوئی بندش نہ ہو اور پارٹیاں بیوی کے لئے ممنوع نہ ہوں ———

خدا کی قسم ——— جونی! مجھے تمہارے اس لکڑی کے اپارٹمنٹ میں کتنا سکون ملے گا۔ جب مجھے احساس ہو گا۔ تمہاری زندگی میں میرے سوا کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کھینچیں گے۔ مگر ایک دوسرے کو بھرپور رفاقت دیں گے۔ اس سے بڑا حُسن اور کیا ہے زندگی میں ———"

مائیکروفون پر مسافروں کو اندر جانے کے لئے بار بار کہا جا رہا تھا۔

جونی بالکل سٹپٹایا کھڑا تھا۔ جلدی سے بولا۔

"قوس ——— قوس ——— تم شاید پاگل ہو گئی ہو"

"اچھا ———" قوسیہ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ "صاف کیوں نہیں کہتے کہ تین سال ایک آدمی کی بیوی بن کر رہنے کے بعد میری ساری دلکشی اور تمہارا عشق فنا ہو گیا ہے۔ غم نہ کرو۔ میں زبردستی تمہارے گلے کا ہار نہ بنوں گی"

"قوسیہ ———" منوچہر جلدی سے آگے آ گیا۔

"کیا تم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ ایک بار اور سوچ لو ———"

"جمالی صاحب! ایسے فیصلے لمحاتی نہیں ہوتے۔ آپ نے مجھے تین سال دیئے یہ فیصلہ کرنے کے لئے ——— اور مجھے معلوم ہے بڑے آدمی سے طلاق لینا مشکل نہیں ہوتا۔ اُسے اپنی کلف لگی عزّت کا بڑا خوف ہوتا ہے اور میں اس طرح اس لئے جا رہی تھی کہ آپ اپنا وہ الزام سچ کر

دکھائیں جو آپ نے کل مجھ پر لگایا تھا ـــــ اور پھر طلاق دینے میں آسانی ہو جاتے ـــــ"
جہاز اُڑنے والا تھا ـــــ جونی کچھ کہے بغیر ادھر کو لپکا ـــــ اُس نے دوڑ کر جاتے ہوئے
جونی کا بازو پکڑ لیا ـــــ اپنی تمام تر بڑائی، عظمت اور غرور کے باوجود منوچہر کو ایسے محسوس ہوا
جیسے وہ دُنیا کا گھٹیا ترین آدمی ہے۔

یہ دل کی تھالی ہے لاابالی،
نہ اس کو اتنا اچھال بابا،
سنبھال بابا ـــــ
تمام دَردوں کا ایک مخزن،
یہ دِل تو اُس کا جمال بابا،
سنبھال بابا ـــــ!!

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

"پے انگ گیسٹ"

جونہی جہاز کے پہیوں نے پاکستان کی سرزمین کو چھوا اس کا دل ایک عجیب سے احساس سے دھڑک اٹھا۔ وہ اس سرزمین پہ نووارد تھا۔ اجنبی تھا ـــــ پہلی مرتبہ عظیم مقصد لے کر آیا تھا۔ مگر اس سرزمین کے خواب اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھے۔ اس نے اپنے والد سے بہت سی باتیں سُن رکھی تھیں۔ تصوّر کی آنکھ سے بہت کچھ دیکھ رکھا تھا۔ اس لئے اس ملک میں آنے کی اس کو چاہ تھی، لگن تھی۔

بالآخر وہ روزِ سعید آپہنچا۔

اور آج سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جوش سے، مسرت سے خوف سے۔ سامان سے لدا پھندا وہ سراسیمہ سا چاروں طرف دیکھ بھی رہا تھا۔ اور سہج سہج ایک ایک سیڑھی نیچے بھی اتر رہا تھا۔

کراچی کے ہوائی اڈے نے نور کا گھونگھٹ کاڑھا ہوا تھا۔ اس وسیع و عریض عمارت میں بے شمار شکلیں نظر آرہی تھیں۔ کارگو کا عملہ رواں دواں تھا۔ ماحول پہ ایک منظم سکوت طاری تھا۔ ایسا سکوت جس کے پیچھے ہلچل مچ رہی تھی۔

اس کے بھی تو میزبان آئے ہوں گے۔ کسی کو اس کا بھی تو انتظار ہوگا۔ اس دنیا میں ہر ایک کو کسی نہ کسی کا انتظار ہوتا ہے، خواہ کوئی کسی کے لئے نووارد ہو، اجنبی ہو، ناشناسا ہو یا بیگانہ محسن۔

وہ لوگ کیسے ہوں گے ؟ ان سے کس طرح ملا جائے گا ـــــ تپاک کا کون سا ڈھنگ اس ملک میں پسندیدہ ہوگا۔ وقار کے پردے میں چھپا کر خلوص برتا جائے۔ یا برطانویوں کی طرح دل میں تاریکیاں چھپا کر روشن روشن مسکراہٹیں نچھاور کی جائیں۔

چینیوں جیسی سادگی اختیار کی جائے یا روسیوں والی روایتی رعونت برتی جائے۔

کیا کیا جائے۔

لیکن صرف اس کا اظہار کیوں نہ کیا جائے جو انسان کے اندر ہو۔

ملمع سازی اور چرب طرازی کیوں ؟

سیڑھیاں ختم ہوگئی تھیں اور پیاری سرزمین پر، جو اس کے آباؤ اجداد کی دلاری تھی۔ اس نے پہلا قدم رکھا تھا۔

پہلا اور مضبوط قدم۔

خوشی سے وہ سرشار ہوگیا۔

کسٹم کے چکر اور سامان کے محاسبے میں کافی دیر لگ گئی۔

جب وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو تھوڑا سا گھبرا گیا۔ کون جانے اسے کوئی لینے بھی آیا ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ نہ آئے ہوں۔ کون سا ان سے اس کا خون کا رشتہ ہے۔

مذہب اور معاشرت کا رشتہ تو ہے۔

اور پھر سب سے بڑا انسانیت کا رشتہ ہے۔

یہ لوگ مسلمان ہیں، اسلامی ملک میں رہتے ہیں، مہمان نواز ہوں گے اور ایسے رشتوں کے قائل بھی۔

ابھی دونوں ہاتھوں میں تھیلے لٹکائے وہ سراسیمہ نظروں سے ہال کے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے بائیں ہاتھ پر ایک باریک سی ہیلو سنائی دی۔

وہ جلدی سے پلٹا۔ ایک دس سالہ لڑکا پتہ نہیں کس وقت اس کی بغل سے نمودار ہوگیا تھا۔

"آپ..... آپ..... افریقہ سے آئے ہیں... میرا مطلب ہے نیروبی

سے...؟" اُس نے آنکھوں میں معصوم سا تمسخر بھر کر اس کی کالی رنگت کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کا نام زین العابدین ہے۔"

نام اس نے اس طرح لیا جیسے ہجے کر رہا ہو۔

"ہاں ہاں ـــــ میں ہی ـــــ" نووارد نے اس طرح ٹھوک بجا کر نکلا۔ جیسے اس کی بہت بڑی مشکل حل ہوگئی ہو۔ وہ آپ ہی آپ، سارے کا سارا اس خضر راہ کی طرف مڑ گیا۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ پری رُخوں کا ایک ہجوم اس کی سمت مسکراتا ہوا بڑھ رہا ہے۔

دونوں ہاتھوں کا سامان نیچے فرش پر رکھ کے اس نے اپنا ہیٹ احتراماً اتار کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور ذرا سا سر کو خم دیا۔

خوش آمدید۔

ایک بھاری بھرکم خاتون نے قریب آکر نہایت شستہ انگریزی لب و لہجے میں کہا۔

نوازش بے حد ـــــ نوجوان نے اور زیادہ جھک کر انگریزی میں جواب دیا۔

آپ غالباً مسز معروف ہیں۔

جی ہاں ـــــ آپ نے ٹھیک جانا۔ میں ہی مسز معروف ہوں اور مجھے آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

شکریہ بے حد ـــــ وہ دوبارہ انکساری سے بولا۔

یہ چاروں میری لڑکیاں ہیں۔ اس نے ان مہ وشوں کی طرف اشارہ کیا۔ جو اتنی خوبصورت ہرگز نہ تھیں، جتنی کہ نظر آرہی تھیں۔ تاہم رات کے وقت ان اجلی اور طلسمی روشنیوں میں وہ کوہ قاف سے اُتری ہوئی پریاں لگ رہی تھیں۔

یہ ہے میری بڑی لڑکی لبنیٰ معروف، انگلش ادبیات میں ایم اے کرکے ایک امریکی اسکول میں محض شوقیہ پڑھاتی ہے۔

مسز معروف نے باقاعدہ تعارف کرانا شروع کیا۔

یہ ہے مبینہ معروف بی، ایس سی آنرز کر رہی ہے۔ یہ ہے فارینا۔ جو بڑی شرمائی کھڑی ہے۔ آگے آؤ بیٹی ـــــ تمہارا بچپنا کہیں نہیں جاتا۔ اجنبی نے محسوس کیا وہ ذرا شرمائی نہیں کھڑی تھی۔ بلکہ اپنے کپڑوں میں بغیر دوپٹے کے تنی کھڑی تھی۔

یہ آج کل ایک آرٹ کالج میں فنِ مصوری کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

اور یہ ہے میری ننھی بچی عنیزہ۔ ہم اسے پیار سے ٹوٹو کہتے ہیں۔" انہوں نے اپنی چوتھی بیٹی کو بڑے پیار سے بغل میں دباتے ہوئے کہا۔ جیسے واقعی وہ بڑی معصوم ہو۔ مگر اپنی جسامت کے لحاظ سے وہ ان تینوں سے گداز اور وزنی لگ رہی تھی ——

اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ اس لئے اس نے ابھی میٹرک کا امتحان نہیں دیا ——"

مجھے آپ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ٹیلینٹڈ لڑکیوں سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے" زین نے پھر اپنے سر کو ذرا سا جھکا کر بڑے خلوص سے کہا۔

اور ممی آپ نے میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔!

وہی دس سالہ لڑکا مچل کر سامنے آ گیا۔ جس نے اس ہجوم میں اجنبی کو دریافت کیا تھا۔

ہاں بھئی یہ تو آپ کے منّے سے دوست ہیں اور جنہوں نے آج شرط بد کر آپ کو اس ہجوم میں سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ مسٹر ٹونی ہیں۔ یعنی ہمارا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو" ٹونی نے بڑی گرمجوشی سے اجنبی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نووارد نے اسی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اسی لمحے وہ دونوں پکے دوست بن گئے

"گھر چلیں باقی باتیں گھر پہ ہوں گی"

"بہت بہتر"

سب باہر کی طرف لپکے۔ اجنبی کا سامان باہر آ گیا تھا۔

یہ سب لوگ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے ملنسار، وسیع النظر۔ اور موجودہ آزادروی کے قائل ہیں۔ سنا تھا پاکستان میں بڑے دقیانوس اور روایت پسند لوگ رہتے ہیں مجھے خوف تھا کہ اگر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑ گیا تو کیا ہو گا۔

لڑکیاں بھی بڑی مہذب معلوم ہوتی ہیں۔

مگر باہر نکل کر دیکھنے کو اور بھی بہت سی چیزیں تھیں۔ آج پہلا دن تھا۔ اور پہلے ہی دن وہ بہت سی چیزیں دیکھ لینے کا متمنی تھا۔ گاہے اِدھر اُدھر دیکھتا گاہے اپنے میزبانوں کا جائزہ لیتا۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ بالآخر وہ اپنی کار کے پاس آ کر رُک گئے۔

سفید رنگ کی کار کا دروازہ لڑکی نے بڑی ادا کے ساتھ کھولا۔ اور آگے اسٹیئرنگ پکڑ کر بیٹھ گئی۔

زین نے ڈگی کھول کر ٹونی کی مدد سے سارا سامان گاڑی میں رکھا۔ اور جب بیٹھنے کے لئے اس طرف آیا تو تینوں لڑکیاں ماں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ مسز معروف نے زین کو آگے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے آگے بیٹھ کر ٹونی کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

اور کار کراچی کی خوشنما سڑکوں پر رینگنے لگی۔ ماں بیٹیاں آپس میں دھیمی دھیمی گفتگو کرنے لگیں۔ زین اپنی سوچوں میں مگن تھا۔ لبنیٰ کار بہت اچھی چلا رہی تھی۔ اس کے مشاق ہاتھوں کو دیکھ کر زین کو امریکہ میں کام کرنے والی لڑکیاں یاد آ گئیں۔ تو پاکستان بھی اس ترقی کی دوڑ میں آگے نکل رہا ہے۔

ماں بیٹیاں شاید اس مسئلے کو حل کر رہی تھیں۔ زین کو اردو سمجھ میں آتی ہے۔ یا نہیں۔

اگر نہیں آتی ہے تو بہتر ہے۔ ایک لڑکی کہہ رہی تھی۔ اس سے بہت بڑا فائدہ رہے گا۔

زین کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ نادانستہ طور پر اس نے یہ فقرہ سُن لیا تھا۔

وہ دِل ہی دل میں ہنسا۔ غالباً خواتین اسے افریقی نژاد سمجھ رہی تھیں۔ وہ کیا جانتی تھیں کہ وہ بھی اسی شجر کا شاخسانہ ہے۔

تیس سال پہلے اس کا باپ عبدالغفور ہندوستان سے ہجرت کرکے افریقہ چلا گیا تھا اس کے دادا بہت بڑے مبلّغ تھے۔ شہر شہر اور ملک ملک گھوم پھر کے اسلام کی تبلیغ کرنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ عبدالغفور اور عبدالرزاق انہوں نے اپنے بیٹوں کی تربیت بھی اسی نہج پر کی تھی۔ ان کو قرآن و حدیث، فقہ اور سنت کی مکمّل تعلیم دی تھی، اور چاہتے تھے کہ ان کے جوان خون میں بھی تبلیغ اسلام کی حرارت بھر دیں۔ وہ بھی اسلام کا چراغ ہاتھ میں لے کر دنیا کی اندھیری گلیوں اور تاریک گوشوں کو منوّر کرتے پھریں۔ ان دنوں ہندوستان میں مذہب کی بنا پر تقسیم کے جھگڑے چل رہے تھے۔ حالات بڑی تیزی سے کروٹ لے رہے تھے۔ کہ عبداللہ دس نے اپنے دونوں بیٹوں عبدالغفور اور عبدالرزاق کو جہاد کے لئے ملک سے باہر روانہ کر دیا ان کا خیال تھا۔ جب تک ملکی حالات کوئی صحیح صورت اختیار کرتے ہیں۔ ان کے بیٹے باہر جاکر تبلیغ کریں۔

عبدالغفور باپ کی طرح جذبے کا دھنی تھا۔ قسمت اسے افریقہ میں لے گئی اور وہیں اس نے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ اور بالآخر نیروبی کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا وہیں پہ اسے پاکستان کے قیام اور اپنے والد کے شہید ہونے کی اطلاع ملی۔ اپنے چھوٹے بھائی عبدالرزاق کے متعلق وہ کچھ نہ جان سکا۔ آیا وہ ہندوستان میں ہے یا پاکستان میں۔ یا دونوں ملکوں سے باہر۔ پھر اس نے اپنی زندگی تبلیغ کے لئے وقف کر دی۔

اور نیروبی کے ایک مسلمان قبیلہ کی لڑکی زارو سے شادی کرکے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یوں وہ اپنے مشن کی خاطر افریقہ کے دوسرے ملکوں کے دورے بھی کرتا رہتا تھا۔

چونکہ سچا مسلمان تھا، اس لئے پاکستان کے نام سے ہی محبت کرتا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ "زین العابدین"

اسے بھی اس نے ایک سچے اور صحیح مسلمان کی تربیت دی۔ گھر پہ قرآن پاک، اُردو، اور فارسی پڑھایا کرتا۔ اور پاکستان کا ذکر اتنی محبت اور عقیدت سے کرتا کہ بچہ اپنی عمر کے ساتھ ساتھ اس سرزمین کی محبت اپنے جی میں اتار کر جوان ہوتا رہا۔

گھر میں یہ لوگ اُردو ہی بولتے تھے۔ ویسے زین نے امریکہ کی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ اب اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے پاکستان میں جاکر رہے، وہاں کی معاشرت کا مطالعہ کرے۔ اور پاکستان کی کسی یونیورسٹی سے اسلامیات کی ڈگری لے کر آئے۔

اور اب جو حالات پیدا ہو گئے تھے، ان کے پیش نظر۔ اس کے والد کو یہی صورت نظر آئی کہ زین العابدین کو فوراً پاکستان بھیج دے۔

مگر مسئلہ یہ درپیش تھا، کہ پاکستان میں ان دنوں اس کا کوئی عزیز نہیں تھا۔ زین کسی ہوٹل یا ہوسٹل میں بھی رہ سکتا تھا۔ مگر ان جگہوں پہ رہ کر وہ پاکستانی مزاج اور اسلامی معاشرت سے بے بہرہ ہی رہتا۔

عبدالغفور چاہتا تھا کہ زین پاکستان کے کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے میں رہے! ان کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو۔ انہی کے توسط سے سوسائٹی کے اور لوگوں سے بھی ملے اور ہر قسم کا مشاہدہ کرے۔

اس مقصد کے لئے اس نے پاکستانی اخبارات میں اشتہار دلائے تھے۔ آیا کوئی اچھی فیملی اسے اپنے ہاں "پے انگ گیسٹ" کے طور پہ رکھ سکتی ہے یا نہیں دو تین جگہ سے پیش کش آگئی تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے مسز معروف کی آفر کو قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ اس نے خط میں لکھا تھا کہ گھرانہ مثالی گھرانہ ہے۔ چنانچہ اچھی طرح

تسلی کر لینے کے بعد عبدالغفور نے زین کو پاکستان بھیج دیا تھا۔

اور آج زین اجنبی مگر خوبصورت میزبانوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ وہ آج بے حد خوش تھا۔ اور دِل ہی دل میں مضمون باندھ رہا تھا کہ آج رات ہی اپنے باپ کو خط لکھے گا۔ اور اس میں ہر بات تفصیل سے لکھے گا۔

کار مختلف سڑکوں سے گھومتی ہوئی سوسائٹی کی طرف مڑ گئی تھی۔ اور ایک خوشنما کوٹھی کے پورچ میں آکر رُک گئی۔

لبنیٰ نے ہارن دیا۔ اور ایک ادائے بے نیازی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ ہارن دینے سے کوئی ملازم باہر نہیں آیا۔ بلکہ کافی دیر بعد راہداری کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیر عمر آدمی، جس نے سفید کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ باہر نکل کر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ زین اور ٹونی ڈگی میں سے سامان نکالنے لگے۔ "آ گیا تمہارا مہمان ——؟" اُس نے جیسے سرگوشی کی۔

"ہاں آ گیا ہے۔" مسز معروف نے ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے بڑی رعونت سے کہا۔

اتنے میں زین تھیلے اٹھائے قریب آ گیا تھا۔

"یہ ہیں مسٹر معروف۔" مسز معروف نے بازو نچا کر بڑی بیزاری سے کہا۔

"السلام علیکم۔" زین نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

"وعلیکم السلام، مزاج تو اچھے ہیں۔" مسٹر معروف نے پوچھا۔

"جی بالکل۔ آپ کی نوازش ہے۔"

زین کے مُنہ سے اُردو کا صحیح فقرہ سُن کر ماں بیٹیوں کی تقریباً چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ہائے وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ اجنبی کو اردو بالکل نہیں آتی ہوگی۔ اور وہ اپنی انگریزی کا رعب جما جما کر اس کو خوب اُلو بنائیں گی۔ اور پھر وہ شرمندہ بھی تھیں کہ کس طرح وہ کار میں اس کے متعلق آزادی سے تبصرہ کرتی آئی ہیں۔ ضرور اُس نے وہ ساری باتیں سمجھ لی ہوں گی۔

زین ان کی پریشانی کو بھانپ گیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"ہم لوگ گھر میں اُردو ہی بولتے ہیں۔ میں بھی اردو بولنے میں اتنی ہی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ جتنی کہ آپ۔"

"یہ تو بڑے فخر کی بات ہے۔" مسز معروف نے خفت مٹاتے ہوئے کہا۔ "پھر تو آپ

یہاں بالکل اجنبیت محسوس نہیں کریں گے۔"

"چلئے اندر چلیں۔" اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

جب سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ چکے تو مسز معروف نے چھوٹی بیٹی کو مخاطب کر کے کہا۔

"ٹوٹو زینی سے بولو چائے بنا کر لے آئے۔ ڈنر سے پہلے ہم لوگ ایک ایک کپ چائے پئیں گے۔ کافی تھکان ہو گئی ہے۔ کیوں مسٹر زین!"

"جی ضرور۔" زین نے ان کی تائید کر دی۔

ڈنر پر بھی اچھی خاصی گفتگو رہی۔ زین نے انہیں اپنے والدین کے متعلق مفصل بتایا۔ اور یہ بھی بتایا کہ وہ پاکستانی کھانے بہت خوش ہو کر کھاتا ہے۔ کیونکہ افریقہ میں جو بھی پاکستانی فیملی آیا کرتی تھی۔ اس کے والد اسے ان کے ساتھ ملاتے تھے۔ یوں وہ لوگ کچھ دِن گھل مِل کر رہتے۔ اور ان سے پاکستانی کھانے پکانے بھی سیکھتے۔ نہ صرف اس کی ماں بلکہ زین بھی کئی پاکستانی کھانے پکا سکتا ہے۔

"ویسے آپ لوگوں کو یقین نہ ہو تو آپ میرا امتحان لے سکتے ہیں۔" آخر میں زین نے کہا۔

اس پر ڈائننگ ہال میں خوب قہقہے اڑے۔ "آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔" مسز معروف نے ادا سے کہا۔ "مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے آپ آج ہی سے ہمارے خاندان کا ایک فرد بن گئے ہیں۔"

"شکریہ!" زین نے خوش ہو کر کہا۔

"ممی! آپ تو ہر مہمان سے یہی فقرہ کہتی ہیں۔"

چپ بیٹھے بیٹھے ٹونی نے سخت بیزار کن لہجے میں ماتھے پر شکن ڈال کر کہا۔

مسز معروف شرمندہ سی ہو گئیں۔

مگر بات کو بدلتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے، آج تم کچھ کھا نہیں رہے ہو ٹونی۔ تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟"

"ممی مجھے نیند آ رہی ہے۔" ٹونی نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! واقعی بہت دیر ہوگئی ہے۔" زین نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب مجھے اجازت دیجئے۔"

سب لوگ کھڑے ہوگئے۔

"لُولُو ــــ!" مسز معروف نے اپنی بڑی بیٹی کو مخاطب کیا۔ کیونکہ اس کو پیار سے سب اسی نام سے پکارتے تھے۔ جاؤ تم زین کو اس کا کمرہ دکھادو۔ پہلے زینی سے پوچھو کہ اس نے سامان کمرے میں لگادیا ہے۔"

لُولُو ــــ اٹھلاتی ہوئی زین کے آگے آگے چلی ــــ اور زین مسکراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے۔

جب وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اوپر سے تیز تیز نیچے آتی ہوئی ایک لڑکی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

"سامان لگادیا گیا ہے زینی؟"

لُولُو نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

"جی ــــ"

"پینے کے لئے پانی بھی رکھ دیا ہے؟"

"جی ــــ!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اور منہ پھیر کر جلدی سے نیچے اُتر گئی۔ زین اس کی شکل اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔

"کون تھی یہ؟"

"یہ ہماری ملازمہ زینی ہے۔"

"اچھا"

وہ ایک تابعدار بچے کی طرح اس کے پیچھے ایک ایک سیڑھی اوپر چڑھنے لگا۔ وہ بھی تو خوب لپک لپک کر ادا کے ساتھ چڑھ رہی تھی۔ اس نے بڑا مدہوش کن سینٹ لگا رکھا تھا اور سیڑھیاں چڑھنے کا یہ عالم۔ ہلکی روشنی میں زین کو بڑا رومانٹک لگنے لگا۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے زین سے کہا۔

"یہ آپ کا بیڈ روم ہے۔ اس کے ساتھ ڈریسنگ رُوم ہے۔ اور غسل خانہ

ہے۔ ضرورت کی ہر شے آپ کو ملے گی۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجادیں۔ یہ ملازمہ کے کمرے میں بجتی ہے۔ وہ ضرورت کے وقت آپ کی مدد کرسکتی ہے۔"

"کوئی بٹن ایسا بھی ہے یہاں، جس کی گھنٹی آپ کے کمرے میں بجتی ہو؟"

لولو نے حیرت سے زین کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر۔ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بہت شریر ہیں آپ ــــ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا کمرہ بالکل آپ کے کمرے کے نیچے سیڑھیوں کے ساتھ ہے۔ کوئی تکلیف ہو تو بلا جھجک کہہ سکتے ہیں۔ ہم اپنے مہمانوں کو بہت آرام اور محبت سے رکھتے ہیں۔"

"نوازش ــــ" وہ مسکرایا۔ "واقعی مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔" اس کے بعد چند رسمی باتیں کرکے لولو کھڑی ہوگئی۔

"شب بخیر ــــ" اس نے ادا سے کہا۔

زین اسے سیڑھیوں تک چھوڑنے آیا۔ ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ نیچے اُتر گئی۔ اور وہ وہیں ریلنگ پر کھڑا رہا۔

کراچی کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ رات کے گیارہ کا عالم ہوگا۔ مگر کراچی شہر پر شباب اُمنڈ کر آرہا تھا۔ چاروں طرف جگمگاتی ہوئی خوبصورت روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ رات کے وقت یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس شہر کو روشنیوں اور نور سے گوندھ کر بنایا گیا ہے۔ جانے صبح کے وقت یہ شہر کیسا لگتا ہوگا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔ اور سوچتے سوچتے بہت دُور نکل گیا۔ ابّا کو خط لکھ دینا چاہیئے۔ اماں اس کے لئے اداس ہونگی۔ ایک نئے سفر کی ابتدا ہوئی ہے۔

مکان ان کا بہت خوبصورت ہے، اس نے مڑکر سارے گھر پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔

بڑی ساری جہاز نما کوٹھی۔ دور سے دیکھو تو کسی بحری جہاز کا عرشہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کوٹھی میں دو ایک جیسے پورشن بنے ہوئے تھے۔

چار بیڈ روم نیچے تھے اور چار بیڈ روم اوپر۔ بالکل ایک جیسے اور اس طرح بنائے گئے تھے کہ دونوں حصے ایک دوسرے سے بالکل الگ رہتے تھے۔ اگر اوپر کے لوگ اپنی آزادانہ آمد و رفت رکھنا چاہتے تو بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا۔

نیچے ایک بہت بڑی بیسمنٹ بنی ہوئی تھی۔ جسے مسز معروف نے اپنا ڈرائنگ ہال بنایا ہوا تھا۔ وہیں پر اکثر سپیچر ڈے نائٹ کوکاک ٹیل پارٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ رقص ہوتا تھا اور بہت ہلہ گلہ بھی۔

جو ڈرائنگ ہال درمیانے حصے میں تھا۔ عام طور پر مہمانوں کے لئے وہی استعمال ہوتا تھا۔

اوپر والے چاروں کمرے جو بہت بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ تھے۔ ہر سال مسز معروف کرائے پر اٹھا دیتی تھی۔ وہ عام طور پر غیر ملکی لڑکوں کو پے انگ گیسٹ کے طور پر رکھا کرتی تھیں۔ اُنکے خیال میں ملکی مہمان بہت زیادہ شور و غل مچاتے ہیں۔ اور بدپیانت بھی ہوتے ہیں زین کے آنے سے پہلے انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ مگر اب اس کا مزاج

انہیں اتنا بھایا تھا کہ اسے رکھنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔

اُن کی کوٹھی کے باہر ایک خوبصورت بورڈ لگا تھا۔

"معروف گیسٹ ہاؤس"

"معروف گیسٹ ہاؤس" سے زیادہ۔ سوسائٹی میں آنٹی معروف جانی پہچانی اور ہر دلعزیز شخصیت تھیں۔

نو دولتیئے اور جدید رجحانات رکھنے والے لوگوں سے زیادہ تر ان کے مراسم تھے لڑکے اور لڑکیاں بے تکلف ان کے ہاں چلے آتے۔ پارٹیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ بچے بچیوں کے مسئلے وہ چٹکی میں حل کر دیا کرتی تھیں۔

اس لئے چھوٹے بڑے آنٹی آنٹی کرتے رہتے۔ ان کا ذریعہ آمدنی کیا ہے۔ اگرچہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ مگر انہیں اپنے گیسٹ ہاؤس سے سال میں اتنا غیر ملکی زرمبادلہ مل جاتا تھا جو سال بھر کے لئے کافی ہو جاتا تھا۔

مسز معروف بہت مدھم طبیعت کے ہر دم بیمار رہنے والے آدمی تھے، زیادہ تر اپنے کمرے میں لیٹے رہتے۔ انہیں گھر کے ماحول۔ یا اس میں ہونے والے ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

گھر میں ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اونچی آواز میں بولتے نہیں تھے۔ کبھی مخاطب سے نظر ملا کر بات نہ کرتے تھے۔ بلکہ باتیں کرتے وقت نظریں نیچی رکھتے۔ اور گھبرا گھبرا کر ہر سوال کا جواب دیتے۔

انہیں اپنی بیوی اور بچیوں پر کوئی اختیار نہ تھا۔ مسز معروف اپنے غیر ملکی مہمانوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اور انہیں کی خاطر ہفتے کی شام کو کاک ٹیل پارٹی دیتیں۔ یوں وہ کرسمس کا تہوار بھی اسی شان و شوکت سے مناتی تھیں۔ جس طرح عید کا۔

نئے سال کی رات کو بھی ان کے ہاں رت جگا ہوتا تھا —— بچیاں ذرا سی آزاد تھیں، ویسے مہمانوں کو واقعی انہوں نے کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دی تھی۔

زین پڑلیس کے جنگلے پر جھکا جھکا تھک گیا تھا۔ اور اس کے ذہن میں ایک تانا بانا سا

بن رہا تھا۔ الجھ رہا تھا۔ اور پھر یکایک اس کا ذہن بجلی کے اس بٹن کی طرف گھوم گیا جس کی گھنٹی نوکرانی کے کمرے میں بجتی تھی۔

واہ ـــــ زین نے اپنا سر جھٹک دیا۔

اور پھر بھاری قدموں سے اپنے کمرے کی طرف مڑا۔ تاکہ ابا کو خط لکھنے کے بعد سو جائے۔

صبح حسب معمول وہ اپنے وقت پر ہی اُٹھ گیا۔ ناشتہ سب لوگوں کے ساتھ ہی کیا۔ مگر آنٹی معروف نے اسے سمجھا دیا کہ یہاں پابندیٔ وقت کی کوئی قید نہیں ہے وہ جب اور جس وقت چاہے۔ ناشتہ، کھانا یا شام کی چائے مانگ سکتا ہے، اور اگر چاروں وقت کمرے میں کھانا چاہے تو روم سروس کا بھی بندوبست ہے۔

زین کا دل تو بہت چاہا کہ روم سروس کے لئے کہہ دے مگر فی الحال اُسے یہ مناسب نہ لگا۔ اس لئے اس نے کہہ دیا کہ ابھی اسے سب کے ساتھ کھانے میں عذر نہیں ہے۔ ہاں جب کبھی اس نے ضرورت محسوس کی۔ انہیں کہہ دے گا البتہ سونے سے پہلے اسے کافی پینے کی عادت ہے۔ اگر اس کا بندوبست ہو جائے تو وہ مشکور رہے گا۔

ناشتے کے بعد زین نے آنٹی معروف سے تھوڑا سا وقت مانگا۔ وہ لوگ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ زین نے انہیں بتایا کہ وہ اپنے ساتھ جو رقم لایا ہے۔ وہ بینک میں رکھنا چاہتا ہے۔ اور یونیورسٹی میں داخلے کے لئے بھی جانا ہے۔ اگر دو چار دن ان میں سے کوئی اس کی رہنمائی کرے تو وہ اور بھی ممنون ہوگا۔

لڑکیوں کو یہ سُن کر بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ اسلامک سٹڈیز میں داخلہ لینا چاہتا ہے۔ وہ سخت بور ہوئیں۔ مگر جب انہیں علم ہوا کہ وہ کتنی بڑی رقم ساتھ لے کر آیا ہے تو حیرت سے اُن کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس نے سب کچھ ایمانداری سے آنٹی کو بتا دیا۔ یہی نہیں بلکہ پورے سال کا خرچہ آنٹی معروف کو ایڈوانس ہی دے دیا۔ ایسا آج تک کسی مہمان نے نہیں کیا تھا۔ انہیں زین کی سادگی اور کم علمی میں اپنا فائدہ ہی نظر آیا۔ اور

بھی شفیق اور بھی میٹھی بن گئیں۔

جھٹ انہوں نے لولو کو حکم دیا۔

"بیٹی تم ذرا آج اسکول سے چھٹی کر لو! مسٹر زین کو اپنے بینک منیجر سے ملوا دو۔ گاڑی تم لے جانا۔ اور بھی انہیں جو جو کام ہوں کروا دینا۔"

لولو نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت ساڑھی پہنے، قرینے سے میک اَپ کئے، اپنا پرس جھلاتی آگئی۔

زین بھی تیار ہو گیا تھا۔

دونوں مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔

واقعی اگر لولو ساتھ نہ ہوتی تو اس اجنبی شہر میں اسے بڑی دقت ہوتی۔ بینک سے نکل کر وہ لوگ یونیورسٹی کیمپس کو روانہ ہو گئے۔ وہاں بھی لولو کی شناسائی کام کر گئی۔ پورا کیمپس دکھانے کا تو وقت نہیں تھا۔ اس نے اسے چند ضروری جگہیں دکھائیں۔ اور چند اچھے لوگوں سے ملایا۔ پھر واپس شہر کو پلٹے۔

آتے آتے لنچ ٹائم ہو گیا تھا۔

زین نے خود ہی دعوت دے ڈالی۔ لولو کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے چائنیز ریستوران میں کھانا کھایا۔ زین نے تھوڑی سی ضرورت کی اشیاء خریدیں۔ اور واپس گھر آگئے۔

یونیورسٹی کیمپس ان کے گھر سے کافی دور تھا۔ اور ابھی زین کو ادھر بس سروس کی کج ادائیوں اور بے پرواہیوں کا کوئی تجربہ نہ تھا اور اتنی دور روزانہ ٹیکسی میں جانا بھی سوند نہ تھا۔ اس لئے لولو نے یہ ذمہ داری لے لی۔ اور بولی۔

"جب تک آپ راستوں سے واقف نہیں ہو جاتے۔ میں آپ کو کیمپس چھوڑ آیا کروں گی۔ واپسی کا مسئلہ ابھی تک حل طلب تھا۔ کبھی زین بے چارہ کسی سے لفٹ لیتا کبھی بسوں میں دھکے کھاتا۔ وقت بے وقت گھر پہنچ جاتا۔

پھر اس نے ایک دن آنٹی کی شفقت کا سہارا لیا اور ان سے کہا۔ وہ ایک اسکوٹر

خریدنا چاہتا ہے۔ تاکہ آنے جانے میں آسانی ہو جائے۔ یوں وہ چاہتا تو ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی خرید سکتا تھا۔ مگر فی الحال اُس نے اسکوٹر پر ہی اکتفا کی۔

سب کے سب گاڑی میں بیٹھ کے اس کے ساتھ گئے۔ اور اسے اسکوٹر خریدوا دیا۔ شرط یہ ٹھہری کہ کل شام وہ سب لڑکیوں کو باری باری سوسائٹی کے چکر لگوائے گا۔

زین نے اپنی ہر بات سے انہیں یہ تاثر دیا کہ وہ انہیں بالکل اپنے افراد خانہ کی مانند سمجھتا ہے۔ اس لئے کوئی بات کہنے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔

لولو سے تو اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ کئی فلمیں دیکھ لی تھیں۔

باقی لڑکیاں صورتِ حال کو سمجھ کر خود ہی الگ تھلگ ہو گئی تھیں۔

لولو بڑی دلچسپ لڑکی تھی۔ زین نے محسوس کیا۔ صرف وہ مذہب کے نام سے بھڑکتی تھی۔ مذہب کے بارے میں نہ کچھ سننے کو تیار تھی نہ ماننے کو۔

زندگی کو وقت کے پیمانے میں ناپنے پر یقین رکھتی تھی۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ آج زندہ اور بے مثال تھا۔ کل پر وہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی اور آج سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی قائل تھی۔

یوں اس کی محبت قہقہوں اور خوشبوؤں سے گندھی ہوئی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹوں، گھونگھریالے بالوں۔ کالی رنگت اور سرخ سرخ متوالی آنکھوں والا حبشی، زین اس کے ساتھ گھومنے پھرنے میں بہت فخر محسوس کرتا، اور وہ کالے آدمی کے ساتھ کیسے فخر سے اکڑ اکڑ کر چلتی۔ اپنی گوری رنگت پر اُسے ناز بھی تھا۔ اور زین کی مسکراتی آنکھوں کا احساس بھی تھا۔

اور زین اکثر سوچا کرتا۔ پاکستانی لڑکیاں واقعی حسین ہوتی ہیں۔ سیاہ آنکھوں اور گوری رنگت کا صحیح امتزاج یہیں پر ملتا ہے۔ بھرے بھرے صحت مند جسم اور زندگی سے بھرپور لڑکیاں۔

انہیں لوگوں کے توسط سے اسے اور بھی بیشمار لڑکیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا

تھا۔ سبھی لڑکیاں اس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتیں۔ اسے ایک لمحے کو بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اجنبی دیس میں ہے یا اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سب کے ساتھ ـــــ سب کے لئے وہ برابر تھا۔ البتہ ایک بات اُس نے محسوس کی تھی، یہاں کوئی بھی مذہب پر بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہر شخص کا نظریہ جُداگانہ تھا۔

خصوصاً نئی پود تو بالکل ہی باغی تھی۔

تین مہینے کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ وہ سب گھر والوں سے اچھی طرح گھل مل گیا تھا اُن کی عادتوں اور ناموں وغیرہ سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا۔ بلکہ انہیں بھی ان کے پیار کے ناموں سے بُلانے لگ گیا تھا۔ یعنی سب لوگ گھر میں لبنیٰ کو لُولُو کہتے۔ مبینہ کو بونی، فارینا کو فینی اور عنبرینہ کا گھریلو نام ٹوٹو تھا۔

زین ان کے ساتھ خوب ہنسی مذاق کرتا۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ وہ بڑا بزلہ سنج ہے اس لئے اُس کی بات کا کوئی بُرا نہیں مانتا تھا۔ ٹونی اس کا خاص طور سے دوست بن گیا تھا۔ شام کو اسے اسکوٹر پر بٹھا کر سیر کو لے جاتا۔ اور اکثر اس کی پسند کی کوئی شے لے کر دے دیتا۔

——اور تو اور—— کبھی کبھی وہ گھر کی نوکرانی زینی سے بھی ہنسی مذاق کر لیتا۔ حالانکہ اس گھر میں آج تک کسی نے زینی کو لفٹ تو کیا—— اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں کیا تھا وہ چھوٹے سے قد کی دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ اس کا سانولا رنگ زردیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہر وقت جھکی رہتیں، وہ ہمیشہ ملگجے کپڑے پہنے مستعدی سے اپنے کام میں جُتی رہتی، اس کی عمر ہی کوئی بیس اکیس برس ہوگی۔

وہ ہر قسم کے مُلکی و غیر ملکی کھانے پکا لیتی تھی۔ اتنے لوگوں کے مختلف کھانے اس نے پکانے ہوتے تھے، اس لئے وہ ہمہ وقت باورچی خانے میں مصروف رہتی اس کی مدد کے لئے ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا بھی تھا۔ وہ برتن وغیرہ دھویا کرتا تھا۔ اور

اوپر کا سارا کام بھی کرتا رہتا۔ رات کو ملازم لڑکا گھر چلا جاتا تھا۔ اور زینی وہیں کوارٹر میں پڑ رہتی۔

"آپ لوگ باقاعدہ خانساماں کیوں نہیں رکھتے"۔ ایک دن زین نے باتوں باتوں میں لُولُو سے پُوچھ لیا۔ "اس بچاری کو بہت کام کرنا پڑتا ہوگا"۔

"او زین تم یہاں کے لوگوں کو نہیں جانتے"۔ لولو نے بُرا سا منہ بنایا۔ جوان لڑکی ہے۔ ایک دو بار ہم نے یہ تجربہ بھی کیا مگر اچھا نہیں رہا۔ اِس لئے چھوٹا لڑکا رکھ لیتے ہیں۔ ویسے یہ بہت ہمّت والی لڑکی ہے۔ اپنے کام سے تھکتی نہیں"۔

"ہاں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں"۔

کبھی کبھار زینی کھانا کھلانے یا کوئی چیز دینے ڈرائینگ روم میں بھی آجاتی تھی۔ تو زین اسے کن انکھیوں سے دیکھ کر اس کا جائزہ لیتا رہتا۔ عجیب و غریب لگتی اسے یہ لڑکی۔

وہ کھانے کی تعریف بھی انوکھے انداز میں کرتا۔

"آج کھانا تم میں سے کس نے پکایا ہے"۔ وہ لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہتا۔

لڑکیاں معنی خیز انداز میں مسکرا کر خاموش ہو جاتیں۔ تو وہ کہتا۔

"اگر تم میں سے کوئی بھی مان جاتا۔ تو جھوٹی موٹی قسمیں میں خوب تعریف کرتا۔ اب ملازم کے پکے ہوئے کھانے کی کیا تعریف کروں"۔

زینی کا رنگ اور بھی زرد ہو جاتا! اس کے بعد اس کے چہرے پر کرب کا سایہ اُبھرتا۔ اور اور پھر اس کی آنکھوں میں ڈوب جاتا۔

وہ باورچی خانے میں چلی جاتی۔ اور جی ہی جی میں اس کالے حبشی کو خوب خوب گالیاں دیتی۔ جو اس قدر احساسِ کمتری میں مبتلا تھا کہ ہمیشہ ان چٹی چمڑی والوں کی خوشامد کرتا رہتا تھا۔

ایک دِن بہت ہی عجیب بات ہوگئی۔

اس روز اتوار تھا۔ دوپہر کے کھانے پر خوب شاندار چیزیں پکی تھیں۔ کیونکہ آجکل اتفاق سے "معروف گیسٹ ہاؤس" میں صرف زین ہی سکونت پذیر تھا۔ باقی دو لڑکے ایک ہسپانیہ کا اور دوسرا جرمنی کا، اپنی چھٹیاں گزارنے اور پاکستان کی سیاحت کرنے

گئے ہوئے تھے، اور چیکوسلواکیہ کا ایک لڑکا واپس جا چکا تھا۔

اس لئے سب ماں بیٹیوں کی مہربانیاں زین کے لئے وقف ہو گئی تھیں۔

بہت دنوں بعد اس روز زینی ڈائننگ روم میں کھانا کھلانے لگی تھی۔ سب لوگ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

اچانک کھانا کھاتے کھاتے۔ زین بولا۔

"یہ زینی کون ہے؟"

سب لوگ کھانا کھاتے کھاتے اس طرح چونکے جیسے دُور اچانک خطرے کا سائرن بج گیا ہو۔

مسٹر معروف کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور ان کے ہاتھ سے نوالہ ان کی پلیٹ میں گر گیا۔ جسے سب نے دیکھا اور محسوس کیا۔

نہ جانے زین کے اس معمولی سے سوال میں کیا بات تھی، یا اس کے لہجے میں ایسی خود اعتمادی یا خود سری تھی کہ چند ثانئے کو ہر شخص دہل گیا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ کوئی بھی جواب دیا جا سکتا تھا۔

زینی اپنی جگہ خاموش کھڑی تھی۔

بالآخر لولو نے اپنا گلا صاف کیا ـــــ اور اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا کر بولی۔

"یہ ایک لاوارث لڑکی ہے۔ جسے پپا..... پپا...." آگے وہ کیا کہے۔

"سمندر میں ایک بار طوفان آیا تھا۔ وہاں سے پپا نکال لائے تھے۔" فینی نے لولو کو سہارا دینے کی کوشش کی۔ آنٹی معروف سخت برہم نظر آ رہی تھیں۔

زین نے دیکھا۔ زینی کی کالی آنکھوں میں ایک آبدار موتی تھرتھرایا ـــــ اُبھرا ـــــ پھر اس کے آنچل میں ڈوب گیا۔

"خیر..... خیر... میں تو محض اس لئے پوچھ رہا تھا۔ اس گھرانے میں یہ کچھ مس فٹ لگتی ہے۔"

پھر ایک دم زینی کی طرف مُنہ کر کے بولا۔

"زینی تمہیں میرے آنے سے تو بڑی خوشی ہوئی ہو گی۔"

زینی بوکھلا گئی۔

"کمینہ ـــــ" اُس نے دِل ہی دِل میں دانت پیسے ـــ زخم کریدتا ہے۔ اُوپر نمک چھڑکتا ہے۔ باقی سب لوگ بھی گھبرا گئے تھے، کہ آج یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔

"بھئی دیکھو نا۔ یہاں اس گھر میں سب لوگ کتنے خوب صورت ہیں اور گورے چٹے اُجلے اُجلے ہیں۔ ایک تم ہی ان میں کالی کلوٹی ہو۔ اب جو تم نے مجھے یہاں دیکھا تو خوب خوش ہوئی ہو گی۔ کہ چلو کوئی تو تم سے زیادہ کالا اس گھر میں آیا۔"

اس پر جو قہقہوں کا طوفان اُٹھا تو کسی سے روکے نہ رکا۔ وہ جو ذرا سہمے ہوئے تھے۔ دل کھول کر ہنس رہے تھے، سب کے ذہن کا بوجھ اتر گیا تھا۔

"بھئی واہ۔ کتنا مزے دار اور دلچسپ آدمی ہے۔" اسے خوب داد ملنے لگی۔

اور زینی دوڑ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

یہاں جو بھی آتا ہے بدتمیز ہی آتا ہے۔ نیچ کمینہ۔ دنیا سے انسانوں کی پہچان ختم ہو گئی ہے۔

اُس نے اپنے سانولے ہاتھوں کو دیکھا۔ برتن مانجھ مانجھ کر جو اور بھی سیاہ ہو گئے تھے۔ اور پھر اپنے ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر آنسو بہانے لگی۔

اس روز ماہِ صیام کا چاند نظر آیا تھا۔ زین یونہی کراچی کی سڑکوں پر آوارہ پھر رہا تھا۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ پاکستان میں رمضان کے چاند کا استقبال نہایت تزک و احتشام سے اور شادیانے بجا کر کیا جاتا ہے۔ لوگ چاند دیکھ کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ بغلگیر ہوتے ہیں اور صدقِ دل سے اس نیک اور مقدس مہینے کی برکتیں اور رحمتیں سمیٹنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں۔ مگر اس نے ہر جگہ گھوم پھر کر دیکھا، ایسی کوئی بات نہ تھی۔ روشنی تو اس شہر میں یوں بھی زیادہ ہوتی ہے..... مگر وہ شادمانی، جوش و خروش۔ معانقہ و مصافحہ اسے تو کچھ بھی نظر نہ آیا البتہ دوکانوں پر ذرا رش زیادہ ضرور تھا۔ اور اشیائے خوردنی کی دوکانوں پر نرخ آپ ہی آپ بڑھ گئے تھے۔

اس نے مسجدوں میں معمول سے زیادہ رونق دیکھی۔ جہاں جہاں بھی وہ مسجدوں کے آگے سے گزرا معمول سے زیادہ نمازی وہاں جاتے یا نماز پڑھتے پائے گئے۔

وہ جلدی جلدی گھر پہنچا۔

سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھ چکے تھے۔

"ہیلو۔ ایوری بوڈی"

کہہ کر وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

کسی نے بھی روزوں کی بابت کوئی بات نہ کی۔ تو وہ خود ہی بولا۔

"بھئی کل روزہ کون کون رکھے گا۔؟"

"جی ——"

سب لوگ چونک گئے۔

"اے رمضان پھر شروع ہو گیا" ٹوٹو بولی۔ "توبہ کیا بوریت ہے۔ کتنی جلدی رمضان آجاتا ہے"

"جناب میں نے عرض کیا تھا۔ کون کون روزہ رکھے گا——؟"

آنٹی معروف نے مریضوں والی شکل بنا کر کہا۔

"مجھے تو اکثر گرڈے کے درد کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر نے عرصہ ہوا مجھے روزے رکھنے سے منع کر دیا تھا؛ معروف بے چارے دل کے مریض ہیں انہیں تو یوں بھی معاف ہیں۔ لڑکیوں کی مرضی"

زین نے لولو کی طرف دیکھا۔

اس نے جھٹ اپنے نوکدار ناخنوں والے لمبے لمبے ہاتھ اپنے کانوں کو لگائے اور بولی۔

"میں روزہ رکھ لوں تاکہ سارا دن کلاس میں معصوم بچوں کو مارتی رہوں۔ نانا بابا ہم سے یہ گناہ نہیں ہوتا"

زین نے بونی کی طرف دیکھا۔

وہ جلدی سے بولی۔

"سارا دن تو بسوں کے دھکے کھانے کو ملتے ہیں۔ صبح سات بجے جاؤ۔ شام کو چھ بجے آؤ۔ اس پر روزہ رکھ لو۔ تاکہ سڑک پر ہی بیہوش ہو کر گر جاؤ۔ ہم یہ رسک نہیں لے سکتے"

زین نے علی الترتیب پاس بیٹھی فینی کی طرف دیکھا۔

وہ آم کے اچار کی گٹھلی چٹخارے لے لے کر چباتے ہوئے بولی:

"دیکھیں گے دیکھیں گے۔ ابھی کون سا سارا مہینہ گزر گیا ہے۔ جب موڈ آیا روزہ چکھ لیں گے۔"

اَب ٹوٹو کی باری تھی۔

جب زین نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بیزاری سے بولی:

"میں نے تو آج تک کبھی روزہ رکھا ہی نہیں۔ ممی کہتی ہیں تم ابھی چھوٹی ہو، پھر میری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ ایسا نہ ہو روزہ رکھنے سے اور کمزور ہو جاؤں۔ ہوں۔"

زین نے ایک طویل سانس چھوڑی۔

اور پھر ٹونی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"دوست! اس لحاظ سے تم پر تو روزہ فرض ہی نہیں ہوا ہوگا!؟"

"سو ہمارا ساتھ کوئی نہ دے سکے گا۔"

"ارے آپ روزہ رکھیں گے۔" لولو نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ـــ کیا میں مسلمان نہیں ہوں۔ ہمارے گھر تو سبھی لوگ پورے تیس روزے رکھتے ہیں۔"

"اونہہ ـــ ساری مسلمانی۔ جیسے روزوں میں ہی پڑی ہوئی ہے۔" فینی بل کھا کے میز سے اُٹھ گئی۔

"بھئی آپ کا ساتھ زینی دے سکتی ہے۔" ٹوٹو ایک دم بولی۔ "وہ تو ہر سال پورے روزے رکھتی ہے اس لئے اتنی زرد اور کمزور ہے۔"

"ہاں ـــ" آنٹی معروف کچھ یاد کرتے ہوئے بولیں۔

"زینی پورے روزے رکھتی ہے۔ ہمارے گیٹ پر جو پٹھان چوکیدار ہے وہ بھی پورے روزے رکھتا ہے اوپر کے کام کا لڑکا جان محمد یہ کبھی کبھی روزے رکھتا ہے تم اگر روزے رکھنا چاہو تو زینی تمہاری افطاری اور سحری کا پورا پورا خیال رکھے گی۔

"اور زینی تو بڑے پرانے خیالات کی ہے۔ یہ پتہ ہے صبح صبح وہ بھی کچھ پڑھتی ہے۔ وہ قلات .... قلات۔" بونی نے چڑ کر ٹوٹو کو گھورا۔ "قلات تو ایک شہر کا نام ہے بے وقوف۔"

"بھئی وہ جو صبح صبح اُٹھ کر پڑھتی ہے۔" ٹوٹو سر کھجاتے ہوئے بولی۔

"ہاں تم شاید تلاوت کا کہہ رہی ہو؛ قرآن مجید کی تلاوت۔" ٹوٹو نے اس کی تصحیح کی۔

"ہاں ہاں .... ہے تو تلاوت۔ مگر وہ جو قلات ہوتی ہے۔ وہ ٹی وی پر قاری صاحب بھی کرتے ہیں۔"

"ٹوٹو تم بہت بونگی ہوگئی ہو، اب اتنی چھوٹی بھی نہیں ہو کہ تم قرأت نہیں کہہ سکتیں۔"

"مجھے تمہاری انہی حرکتوں پر غصہ آتا ہے۔ کسی کو دیکھ کے خوب بننے لگتی ہو۔" بونی نے اسے ڈانٹا۔

"دیکھئے ممی۔" ٹوٹو نے ماں کا سہارا مانگا۔ "یہ ہمیشہ سب کے سامنے میری کچی کر دیتی ہے۔"

"جاؤ لڑکیو! تم اب جا کر سو جاؤ۔" آنٹی معروف نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

اور پھر بڑے پیار سے زین سے مخاطب ہو کر بولیں:

"بیٹا! تم بتا دو ناکہ تم سحری کے وقت کیا کھانے کے عادی ہو، اور افطار میں کیا پینا پسند کرو گے۔ گو میں بیمار ہوں، روزہ نہیں رکھ سکتی مگر افطاری کے وقت ضرور تمہارا ساتھ دے دیا کروں گی۔"

"شکریہ آنٹی!" زین نے سنجیدگی سے کہا۔

"سحری کے وقت مجھے اگر دو ٹوسٹ ایک فرائی انڈہ۔ اور ایک دودھ کا گلاس میرے کمرے میں مل جایا کرے تو آپ کی نوازش ہوگی۔ افطاری میں گھر پہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرے بہت سے دوست مل کر ایک جگہ افطاری کرنا چاہتے ہیں۔ سو

آپ تکلیف نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی زینی کو سمجھائے دیتی ہوں۔ اب تمہیں دوبارہ کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔"

سب لوگ اپنے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

زین نے اپنی ٹوپی نکالی، اور مسجد میں تراویح پڑھنے چلا گیا۔

جاتے جاتے اس نے دیکھا۔ باورچی خانے کے فرش پر چٹائی بچھائے زینی نماز پڑھ رہی تھی۔ اسی لمحے اس کے دل میں زینی کے لئے درد جاگا۔

زینی تو اس گھر میں تھی ہی مشین۔ بس ایک بار حکم کردو۔ پھر روبوٹ کی مانند اس کی تعمیل کرنا۔ اس کی عادت بن چکی تھی۔

سو وہ ہر صبح تڑے میں سحری کا سامان رکھے زین کے کمرے میں جاتی۔ گو دروازہ کھلا ہوتا مگر وہ ہلکی سی دستک دیتی اور پھر اندر چلی جاتی۔ کبھی زین غسلخانے میں ہوتا اور کبھی مصلے پر بیٹھا، پچھلی رات کے نفل پڑھ رہا ہوتا۔ وہ خاموشی سے اس کا ناشتہ تپائی پر لگاتی اور چپ چاپ چلی آتی۔

نہ کبھی وہ وہاں ٹھہری۔ نہ کبھی زین کو کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ایک روز اس سے بھول ہوگئی۔ صرف دودھ کا گلاس اوپر لے گئی اور ٹوسٹ نیچے ہی پڑے رہ گئے۔ جلدی سے انہیں رومال میں لپیٹا اور بھاگی بھاگی اوپر گئی۔

زین بستر میں بیٹھا ہولے ہولے گرم دودھ پی رہا تھا۔

"معاف کیجئے! میں یہ ٹوسٹ نیچے بھول آئی تھی۔" زینی نے کانپتی آواز میں کہہ کر پلیٹ اس کے آگے کردی۔ اس نے سر ہلایا اور بڑی رعونت سے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

پھر اپنی لال لال ڈوروں والی آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر، یکلخت فلمی ہیرو والے انداز میں بولا۔

"تمہارا اصلی نام زینب ہے۔"

"جی۔۔۔"

"تمہاری ماں کا نام زرینہ تھا۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔۔"

"تمہارے بھائی کا نام ذوالفقار علی تھا۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ جی۔۔۔"

"اور تم مشرقی پاکستان سے آئی ہو۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔۔"

لیکن پھر نہ جانے کہاں سے اتنے سارے ڈھیر سارے آنسو اس کی سیاہ آنکھوں میں گھس آئے کہ وہ سسکتی ہوئی نیچے دوڑ گئی۔!!

پاپی۔۔۔۔

اس نے دل میں سوچا۔ نرا پاپی۔

جانے اسے زخم کریدنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ کیا سیاہ چمڑی والوں کا دل بھی اندر سے سیاہ ہوتا ہے۔ اور خون سفید۔

بھلا اسے اس بھرے گھر میں ستانے کو میں ہی ملی ہوں۔

میں، بے کس و بے آسرا۔ جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ـــــ کوئی آسرا نہیں۔ کوئی آشیانہ نہیں۔ کوئی سلسلہ نہیں، میرا ہر سلسلہ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر چکا ہے۔ اس دنیا کے وسیع فرش پر۔ دانہ دانہ بکھر گیا ہے۔ کہاں۔ کس طرف۔ کون جانے۔ کہ یادوں کا خالی دھاگہ ہاتھ میں پکڑے فرش پر گرد آلود سی بیٹھی ہوں۔

کس کی ہوں۔

میں کون ہوں۔

کیا ہوں۔؟

میں تو زینی ہوں۔

گھر کی پالتو ملازمہ ـــــ ہر آئے گئے کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ وہ زینب خاتون کہاں ہے۔

وہ زرینہ بیگم کی بیٹی تھی ـــــ اور ذوالفقار علی کی چہیتی بہن تھی۔

یہ اجنبی بکواس کرتا ہے۔ انہی لڑکیوں میں سے کسی نے اسے کچھ بتا دیا ہے۔

اب کچوکے لگا کے میرے ذہن کو لہولہان کرنا چاہتا ہے۔

اور میں کس خلوص سے اس کی خدمت کر رہی ہوں۔ اس کو بھی ایک نیکی سمجھ کے۔ کہ پردیسی ہے۔ مسلمان ہے۔ والدین سے دور ہے۔ رمضان میں اس کی خدمت کرنے کا دوہرا ثواب ملے گا۔

اُونہہ!

تن کے کالے من کے کالے۔

پھر عید آ گئی۔ گو "معروف گیسٹ ہاؤس" میں کسی نے بھی روزہ نہیں رکھا تھا۔ مگر عید کی تیاریوں میں یہ لوگ پیش پیش تھے۔ کپڑے ڈیزائن کئے جا رہے تھے۔ نئے سٹائل وضع کئے جا رہے تھے۔ ہیئر اسٹائلز کے بارے میں فیشن میگزین سامنے رکھ رکھ کے تبصرہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ عید کی رات آنٹی معروف ایک گرینڈ گالا کاک ٹیل پارٹی دینے والی تھیں، اور اس پارٹی میں ہر لڑکی سو بٹر کی شہزادی بن کر جانا چاہتی تھی۔

زینی کو اپنے باورچی خانے سے فرصت نہ تھی، اور زین اس دن کے بعد سے کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ پھر کبھی زینی سے بات کرنے کی اس نے کوشش نہ کی۔ اور نہ زینی نے کبھی اس کے سامنے آنے کی غلطی کی۔

عید سے ایک شب پہلے زین گھر والوں کے لئے بیش قیمت تحائف خرید لایا تھا۔ اور سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کسی کو بھی یہ امید نہ تھی، کہ وہ ان کے لئے اتنے خوبصورت اور قیمتی تحائف لائے گا۔ اور نہ کبھی آج تک کوئی اور غیر ملکی مہمان ایسی چیزیں لایا تھا۔ بس معمولی معمولی سی ننھی منی چیزوں پہ یہ لوگ ایک دوسرے کو ٹرخا دیا کرتے تھے۔

آنٹی معروف نے بھاری سنہری بارڈر والی ساڑھی دیکھی تو حیرت سے زین کا منہ تکنے لگی۔ بلاشبہ انہوں نے آج تک اتنی بیش قیمت ساڑھی اپنے پیسوں سے نہ

خریدی تھی۔

اور لولو کی میکسی تو غضب ڈھا رہی تھی۔ چائنیز نیک والی آتشی گلابی میکسی جس کے گلے اور کمر پر تلے کا خوبصورت کام چمک رہا تھا۔ بونی کا امیٹیشن جیولری کا سیٹ اصلی سونے کو ماند کر رہا تھا اور فینی اپنی گوگو واچ کو بار بار اپنی کلائی پر لگا کر دیکھ رہی تھی۔ جبکہ ٹوٹو اپنے فیروزی رنگ کے فلیپر سوٹ کا آئینہ کے آگے کھڑی ہو کر جائزہ لے رہی تھی، ٹونی کو زین نے اسکی فرمائش پر ایک چھوٹی سائیکل لے دی تھی۔ اور انکل معروف کے لئے وہ پارکر پین لایا تھا۔ سارا گھرانہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ آج انہیں یقین آ گیا کہ زین واقعی انہیں اپنے گھر کے لوگ سمجھتا ہے۔ ٹوٹو اپنی میکسی کی تعریف کرتے: تھکی جاتی تھی۔

"بھئی تب جانوں گا اگر تم کل کی پارٹی میں یہی میکسی پہنو۔"

"ضرور۔ ضرور۔" لولو جھوم کر بولی۔ "میرا تو ہر لباس اس کے آگے ماند ہے۔ زین کل میں تمہاری یہ فرمائش ضرور پوری کروں گی۔"

"اور تم ساری پارٹی میں کل قیامت لگو گی۔" زین نے ایک آنکھ بند کر کے کہا۔

لولو نے مست اداؤں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اور ہنس کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ "شکریہ زین۔"

زین کے ہاتھ میں کچھ اور بھی پیکٹ تھے۔

"یہ کیا ہے؟۔ یہ کیا ہے؟" ٹوٹو حسب عادت کریدنے لگی۔

"بھئی یہ کچھ میری ضرورت کی چیزیں ہیں۔"

زین نے انہیں اُٹھایا اور بولا۔ "میں یہ چیزیں اپنے کمرے میں رکھ کر آتا ہوں۔ آپ لوگ کھانا لگوائیں۔ کیا آج رات کو بھی روزہ رکھوانا ہے۔"

"ہاں! ہاں لڑکیو! جلدی کرو۔ زین بیٹے کو بھوک لگی ہو گی۔" مگر لڑکیاں کھانا لگوانے کے بجائے اپنے اپنے تحفے اٹھا کر اپنے اپنے کمرے کو چلیں۔ زین نے موقع غنیمت جانا، اور دوڑ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔

زینی کھانے کی دیگچیاں دوبارہ گرم کرکے رکھ رہی تھی۔ زین نے ایک پیکٹ اس کے آگے رکھ دیا۔

وہ اتنی زیادہ حیران ہوئی کہ دیگچی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

"یہ..... یہ..... کیا ہے؟"

"یہ تمہارا تحفہ ہے۔" کہہ کر زین باہر کو بھاگا۔ کیونکہ کسی کے باورچی خانے میں آنے کی آواز آرہی تھی۔

زینی نے گھبرا کر ایک خالی دیگچی اس پیکٹ پر اوندھا دی! اور اس طرح اپنے کام میں مگن ہوگئی۔

آنٹی معروف باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔ اور کھانا نکلوانے کے متعلق ہدایات دینے لگیں۔

جلد جلد کام کرتے ہوئے زینی کا دھیان بار بار اس اوندھی دیگچی کی طرف چلا جاتا۔ اگر کسی وجہ سے آنٹی معروف نے دیگچی اٹھالی تو کیا ہوگا؟

وہ کیا جواب دے پائے گی۔ اس کا تو یہاں کوئی بھی نہیں۔ کون اسے عید کا تحفہ دے سکتا ہے۔

اور پھر اس غریب کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس پیکٹ میں کیا ہے؟

اس اجنبی کے دل میں کیا ہے؟

وہ کچھ نہ جانتے ہوئے۔ معصوم ہوتے ہوئے بھی سزا کی حقدار ٹھہر جائے گی! اس کا ننھا سا دل دھڑکتا رہا۔ اسے اجنبی پر غصہ بھی آرہا تھا۔ اور شوق اس کی ہمت افزائی بھی کر رہا تھا۔

جب سب لوگ کھانے پر بیٹھ گئے تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ دوڑ کر گئی اور وہ پیکٹ اپنے کوارٹر میں رکھ آئی۔ پھر اس نے حسب معمول باورچی خانے کے سارے کام ختم کئے اور کہیں رات بارہ بجے فارغ ہو کر اپنے کوارٹر میں آئی، اور اندھیرے کنڈی لگائی اور ایک انوکھے تجسس کے تحت پیکٹ کو ہاتھ میں پکڑا۔ گھما پھرا کر

ہر طرف سے دیکھا اور پھر اندازے لگانے لگی اس میں کیا ہوگا۔"

"کیا ہوگا اس میں۔؟"

اور وہ بھی میرے لئے۔

بھلا میرے لئے بھی دنیا میں کوئی شے ہے؟

زیادہ دیر تک وہ اندازوں کے سہارے نہ رہ سکی۔

آہستہ آہستہ وہ بڑی آسانی اور سلیقے سے پیکٹ کا کاغذ کھولنے لگی۔ جیسے کہ اس نے انہیں پھر اسی طرح بند کرنا ہے۔

جب سب کاغذ اتر گئے تو اس کے ہاتھ میں ایک بہت ہی خوبصورت سنہری فریم اور جڑاؤ ہینڈل والا آئینہ تھا۔ ایسے آئینے عام طور پر دلہن کے لئے خریدے جاتے ہیں۔ اس نے کئی بار الٹ پلٹ کر اسے آگے پیچھے سے دیکھا۔ چمک دمک ایسی تھی کہ سونے کا معلوم دے رہا تھا۔

واقعی بہت خوب صورت، بہت دیدہ زیب آئینہ تھا۔

مگر میرے لئے کیوں؟

چیز تو واقعی دلکش ہے۔

مگر مجھے اس کی کیا ضرورت ہے۔

پہلی بار اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔

صاف شفاف۔ نیا شیشہ۔ اس کا صاف ستھرا عکس دکھا رہا تھا۔ کتنے عرصے بعد اس نے یوں قریب سے آئینہ دیکھا تھا۔ ہائے وہ کیسی ہوگئی ہے۔

کیا وہ ایسی تھی؟

بجھی بجھی۔ خاموش۔ زرد۔ اور ویران۔ آنکھیں۔ سیاہ گہری آنکھیں۔ لمبی لمبی گھنی پلکیں۔ جو کبھی ساغر کے بھرے پیالے تھے۔

یہی آنکھیں۔ تو اس کا سرمایہ تھیں۔ اس کی نشانی تھیں۔ یہ آنکھیں اسے ماں سے ملی تھیں۔

پیاری ماں ـــــ کہاں ہو گی بھلا۔
اُلجھے اُلجھے بکھرے بکھرے بال۔
کتنا پیار تھا اسے ان بالوں سے، بکھر جاتے۔ تو اُس کے اپنے دل میں حشر برپا ہو جاتا۔ اور اب کئی کئی دن اسے چٹیا بنانے کا خیال نہ آتا۔ اور آگے سے نکل کر جو بال چہرے پر بکھر جاتے تو۔ وہ بھی کئی بار آٹے میں اَٹے ہوتے۔
اس کا سانولا سلونا رنگ یاس کی زردیوں میں ڈوب گیا تھا۔ گہرے عُنابی ہونٹ۔ جن سے اس کی کوئل ایسی آواز گھونگھرو بجاتی نکلا کرتی تھی۔ اپنے سکول میں سب سے اچھی اس کی آواز تھی۔
اس کے بال۔ اس کی آنکھیں اُس کی آواز۔ ان تینوں چیزوں پر سارا سکول فِدا تھا۔
اور یہ تینوں تحفے اسے سنہرے دیس سے ملے تھے۔ کتنی نازاں تھی تب وہ... مگر اب۔
یہ آئینہ۔ اس آئینے نے تو اسے اپنا ماضی یاد دلا دیا۔ یہ آئینہ کس مصرف کا۔ جسے دیکھ دیکھ کر وہ ہمیشہ روتی رہے گی۔ کڑھتی رہے گی۔
آنکھوں کی مے تو رو رو کر بہہ گئی۔ بالوں کی گھٹائیں، جدائی کی کڑی دھوپ نے نگل لیں۔ آواز۔ آواز کہاں گئی۔ مستقبل کے اندیشوں نے اُسے ڈس لیا۔
اور اب زینی ایک خاکہ ہے۔ جس کا کوئی رنگ نہیں۔ ایک بجھا ہوا خاکہ۔ مٹا ہوا پیکر۔ جس کے لئے یہ اجنبی ایک نیا اور خوبصورت آئینہ خرید کر لے آیا۔
مگر کیوں۔؟
سوچتے سوچتے زینی ایک دم چونک گئی۔ پھر جیسے اس کے من میں ایک ہزار کانٹے چُبھ گئے۔
اجنبی۔
تن اور من کا کالا۔

کئی بار تو اس کی صورت کا مذاق اڑا چکا تھا۔ کئی بار اس پر پھبتیاں کس چکا تھا۔ اس کی بے بسی کا تمسخر اڑا چکا تھا۔
اور اب اسے ایک آئینہ لا دیا ہے۔
تاکہ اسے اپنی اوقات اچھی طرح معلوم ہو جائے۔ وہ خوب جی بھر کر دیکھ لے اپنی بگڑی ہوئی صورت ان خوب صورت لوگوں میں وہ کیسی بیگانی۔ کیسی اجنبی لگتی ہے۔
افوہ!
اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس نے اسی طرح شیشے کو پیکٹ میں بند کرنا شروع کر دیا۔
اجنبی!
تم اگر مجھے یہ آئینہ نہ بھی دکھاتے۔ تو بھی مجھے اپنی اوقات کا اچھی طرح علم تھا۔
میں ان شیشے اور کانچ کی سجی سجائی گڑیوں میں ایک سیاہ فام بھکارن کا روپ ہوں۔ میرا کوئی خریدار نہیں۔
اور مجھے شکوہ بھی نہیں۔ نہ میں نے اپنی قیمت لگائی ہے۔ اور نہ اونچے خواب دیکھے ہیں۔ تم نے میرے من کو کرچی کرچی کرنے کی زحمت ہی کیوں کی۔
میرا من تو ہیرا ہے۔ جو پھول کی پتی سے بھی کٹ سکتا تھا۔ اس کے لئے اتنا بیش قیمت شیشہ لانے کی کیا ضرورت تھی۔
اس نے اپنے بہتے آنسو صاف کئے اور پیکٹ کو احتیاط سے اپنے بکس میں رکھ دیا۔ تاکہ کسی وقت مناسب موقع دیکھ کر واپس کر دے۔
صبح ہوئی تو عید کے ہنگامے جاگے۔
ہر کوئی خوش خوش مگن رہا۔ دوست آتے رہے جاتے رہے، تواضع ہوتی رہی ملبوسات جگمگاتے رہے۔ مبارک سلامت کے رسمی فقرے بھی گونجتے رہے۔ مگر زینی آج ہمیشہ سے زیادہ اداس اور مضمحل تھی۔ اس نے کپڑے تک بدلنے کی زحمت نہیں کی۔ بس باورچی خانے میں لگی رہی۔ پھر رات کی پارٹی کا سارا انتظام بھی اس کے

ذمے تھا۔

زین جب عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو اُس نے باورچی خانے کے دروازے میں کھڑے ہو کر منہ سے ایک سیٹی بجائی۔

مگر زینی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے دوسری سیٹی بجائی۔ پھر تیسری۔

مگر زینی نفرت سے مُنہ موڑے ہنڈیا پکانے میں مگن رہی۔

"بھئی اس گھر میں کوئی کسی کو عید مبارک ہی نہیں کہتا۔" اس نے شوخی سے کہا۔

جانے کہاں سے اٹھلاتی ہوئی ٹوٹو نکل آئی۔

اور جلدی سے زین کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"لیجئے ہم عید مل لیتے ہیں۔"

زینی نے ایک جھلک اس نظارے کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

زین بھاری بھاری قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

پھر وہ دوپہر کے کھانے پر بھی نہیں آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا جب پارٹی شروع ہو چکی تھی۔

وہ تیار ہو کر نیچے آیا۔ اور پارٹی میں شامل ہو گیا۔

نیچے کیا شور و غل اور ہلّہ گلّہ ہو رہا ہے۔ زینی کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا یہاں ایسی پارٹیاں آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ اور ان پارٹیوں میں جس قسم کی ہیوڈگیرں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ بھی ہوتی تھیں۔ زینی اتفاقاً کبھی اندر جھانک لے تو جھانک لے ورنہ اس کا خود بخود اندر جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ لیکن آج نجانے کیوں۔ جب پارٹی اپنے عروج پر پہنچی تو اس کا دل چاہا چپکے سے نیچے اُتر جائے اور دیکھے۔ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اور ..... اور زین کیا کر رہا ہے۔ اس پارٹی میں اس کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ جو اپنے آپ کو ایک صحیح مسلمان ظاہر کرتا ہے۔

یونہی چپکے سے ایک محفوظ مقام سے جھانکا۔

میوزک کا شور۔ شراب کی بو۔ سگریٹ کا دھواں۔ اور قہقہے، چھپے بلبوسات

مکروہات۔ مشروبات۔ زندگی جوان تھی۔

وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر زین کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ لمبا تڑنگا۔ کڑیل مگر سیاہ فام نوجوان وہ اس ہجوم میں کہاں گم تھا۔؟

اوہ۔ وہ اسے نظر ہی آ گیا۔

وہ تو ـــــ وہ تو ـــــ ٹوٹو کے ساتھ ناچ رہا تھا۔

زینی الٹے پاؤں لوٹ آئی۔

یونہی اسے بکس میں پڑا ہوا آئینہ دل میں چبھنے لگا۔ اس نے سوچا وہ یہ آئینہ آج ہی لوٹا دے گی۔

جانے کب کس وقت پارٹی کا زور ٹوٹا۔ لوگ ہا ہو کرتے واپس گئے۔ اس کی ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ چونکی تو اسے چھت پر باتوں کی آواز آئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا اس نے بکس میں سے آئینہ نکالا۔ اور آہستہ آہستہ قدم دھرتی چھت پر چلی۔

رات بڑی سنہری اور خوب صورت تھی۔ زین ایک دم تھک کر پارٹی سے اُٹھ آیا تھا، اور وہ بیٹرس پر جھکا کھڑا تھا۔ کہ اس نے دیکھا۔ خوشبوؤں میں سرسراتا ہوا ایک پیکر اس کی طرف آ رہا ہے۔ کون ہے یہ۔ اس نے اپنی تھکی تھکی آنکھوں سے مڑ کر دیکھا۔

اوہ ـــــ یہ تو لولو تھی۔

وہ اس کے قریب آ گئی۔

"تم پارٹی سے اُٹھ کر کیوں آ گئے زین ؟" وہ محبت بھری آواز میں بولی۔

"یونہی میں تھک گیا تھا۔!"

"تھک گیا تھا۔" وہ ذرا ڈگمگائی اور پھر ہنسی۔ ..... "کوئی حسینوں کی سنگت میں بھی تھکتا ہے۔"

زین نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ حالانکہ اس کا بھی چاہ رہا تھا، کہ وہ اس سے باتیں کرے۔

پیار کی باتیں۔
وقت اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔
اتنے میں اس نے سیڑھیوں پر اچانک' بالکل اچانک ایک سایہ سا ابھرتے دیکھا
اور وہ اوپر آکر ٹھٹک گیا۔ زین کی نظر اس پر پڑی۔

"کون ہے یہ۔ ؟
کون ہے یہ۔ ؟
کون ہے یہ۔ ؟"

اور
جو کچھ وہ کہنے والا تھا نہ کہہ سکا۔
جو کچھ حالات اور وقت کا تقاضا تھا، وہ نہ ہو سکا۔ اور لولو غصّے میں بھری ہوئی
نیچے چلی گئی۔

اگلے دو چار دن وہ زینی سے نظر ملانے کی ہمت نہ کر سکا۔ زیادہ تر باہر ہی رہا...
اور لولو اس سے سخت برہم رہی۔ اگر وہ نظر بھی آجاتا تو آنکھیں پھیر لیتی۔ اس نے
لولو کے چہرے پر اپنے لئے نفرت کے گہرے سائے دیکھ لئے تھے۔ وہ حق بجانب
تھی۔ زین نے اس کے پندار کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کو دھتکارا تھا۔
وہ نیند سے ایک دم جاگ اٹھا تھا۔ وہ اپنا فرض بھول چلا تھا۔ فرض کی برچھی
اس وقت اس کے پہلو میں آکے لگی تھی۔ جب وہ جوانی کو کیف آور جام پیش
کرنے والا تھا۔
اس نے ضرورت سے زیادہ لفٹ لولو کو واقعی دی تھی ـــــ اس سے بار ہا
محبت کا اظہار کیا تھا۔ ان چھ مہینوں میں بے شمار تحفے اسے لے کر دیئے تھے۔ مگر
ایک مقصد کے تحت وہ اس کا پورا پورا اعتماد حاصل کر لینا چاہتا تھا اور اس کے بعد
کچھ راز اس سے اگلوانا چاہتا تھا۔
لیکن افسوس۔ اس رات اس نے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ وہ نشے میں بدمست
تھی، اگر زین بھی ہوش میں رہتا تو ذرا سی لگاوٹ کام کر جاتی۔ اور وہ سب کچھ بتا دیتی۔
افسوس۔ زین اپنے آپ پر نفرین بھیجنے لگا۔ اتنے دنوں کی محنت اکارت گئی۔
اب تو لولو کسی بپھری ہوئی ناگن کی طرح اسے ملتی تھی۔ وہ اب اس کے بہکاوے میں نہ

آسکتی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ آجکل ایک نیا لڑکا نظر آتا تھا۔ جس کا مطلب تھا وہ اچھی طرح زین کو جلانے کا بندوبست کر رہی ہے۔

زین کو پھر سے ساری منصوبہ بندی کرنی تھی۔

ادھر زینی بالکل گُپ چُپ تھی۔

زینی جس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جانے رات کے ان خوبصورت لمحوں میں وہ کیوں آئی تھی۔ آج کئی دنوں کے بعد زین کا دل چاہا کہ وہ زینی سے ملے اور اس کا ردِعمل دیکھے۔

آج اتوار تھا۔ اور اتوار کو سارے گھر والے صبح گیارہ بجے تک پڑے سو رہے تھے۔

وہ اپنے ٹھیک وقت پر تیار ہو کر نیچے گیا۔ اور ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔

وہاں برتن لگے تھے، مگر ابھی کسی کے ناشتہ کرنے کے آثار نہ تھے۔ اُس نے حسبِ عادت میز کو ہاتھ سے بجایا۔

آواز سنتے ہی زینی چراغ کے جن کی طرح نمودار ہوئی۔

"ناشتہ مل سکتا ہے؟"

زین نے ایک کھسیانی مسکراہٹ سے کہا۔

وہ سر کی جنبش سے ہاں کہہ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اتنے میں کھٹ کھٹ کی آواز آئی، زین نے مڑ کر دیکھا۔ لولو خوب بنی سنوری اس طرف آرہی تھی۔

"الٰہی خیر۔"

"گڈ مارننگ"۔ جب وہ قریب آئی، تو زین نے خندہ پیشانی سے کہا۔

"گڈ مارننگ" اس نے سوکھا سا جواب دیا۔

اور پھر اس کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے فریج کھول کر دیکھنے لگی۔ "بیٹھئے ناشتہ کیجئے"۔ زین نے اسی انداز میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گی۔ آج ناشتے پر میں ایک فرینڈ کے ہاں انوائیٹڈ ہوں۔ میں تو صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینے آئی ہوں۔" اُس نے

زین کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اتنے میں باہر کار کے ہارن کی آواز آئی۔ جسے سُن کر لولو بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ شاید اس کا بوائے فرینڈ اسے لینے آیا تھا۔

وہ چلی گئی تو زین نے اطمینان کا سانس لیا۔

زینی نے اس کا ناشتہ قرینے سے لگا دیا۔ جب وہ جانے لگی تو زین نے اُسے بڑی محبت سے پکارا۔

"زینی!"

جاتی جاتی زینی کے قدم رُک گئے۔ پھر اس نے مڑ کر زین کی طرف دیکھا۔ آج اُس کے چہرے پر بڑی نرمی اور مٹھاس تھی۔

"کیا تم مجھ سے خفا ہو؟" اس نے خجل سے لہجے میں کہا۔

"کیوں۔؟" زینی وہیں سے بولی۔

"کیوں؟" زین بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اب کیا جواب دے۔

"تم... تم عید کی رات میرے پاس آئی تھیں؟" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"ہاں۔" زینی چلتی ہوئی میز کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے افسوس ہے یہ غلطی مجھ سے دانستہ سرزد نہیں ہوئی۔ میں اگر یہ جانتی کہ آپ"۔

"بس چُپ ہو جاؤ زینی۔" زین نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ "آگے کچھ نہ کہو"۔

"میں پہلے ہی بہت شرمسار ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارا شکر گزار بھی۔ ایسے لمحے میں نمودار ہو کر تم نے مجھے ذلت کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا۔ اور نہ جانے کس کس مصیبت سے بچا لیا"۔

زینی طنزیہ انداز میں ہنسنے لگی۔

"ہنسو نہیں زینی۔ میں اتنا بُرا آدمی نہیں ہوں۔ جتنا تم مجھے سمجھ رہی ہو۔ مَیں نے لولو کو اس قدر قریب کیوں آنے دیا۔؟ کاش میں تمہیں بتا سکتا۔ مگر ابھی نہیں... ابھی نہیں"۔

"خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے"۔ زینی بیگانگی سے بولی۔ اور پھر اس گھر میں یہ کون سی

نئی بات ہے، ایسے تماشے تو میں صبح و شام دیکھا کرتی ہوں۔ البتہ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے ضرور تعجب ہوتا۔"

"زینی ایک وقت آئے گا۔ جب تمہیں میری بات کی صداقت پر یقین آئے گا۔ اب جو تمہارے دل میں آئے کہہ لو۔"

"بھئی میرا آپ کا کیا واسطہ ہے۔ کیا ناطہ ہے۔ کیا رشتہ ہے۔ جو آپ خواہ مخواہ بات کو طول دے رہے ہیں۔ اور تاویلیں پیش کر رہے ہیں۔ میں تو محض ایک نوکرانی ہوں اور آپ کو مجھ پر ترس کھانے کا حق نہیں پہنچتا۔ کیا میرے ملک کے لوگ کافی نہیں مجھ پر ترس کھانے کے لئے ــــ؟"

اسی لئے تو میں اس رات آپ کا عطا کردہ تحفہ واپس کرنے گئی تھی۔

"کیا کہا۔ ؟" زین نے حیرت سے پوچھا۔

"اوّل تو یہ کہ آپ نے مجھے تحفہ کیوں دیا۔ ؟ نوکروں کو یہاں تحفہ دینے کا رواج نہیں ہے، دوسرے آئینہ دینے سے مطلب ــــ؟ کیا میں ویسے نہیں جانتی کہ میری شکل کیسی ہے۔ ؟"

"اوہ زینی۔!" زین نے لاچار ہو کر گردن ڈال دی۔ "کس قدر کم فہم ہو تم، ذرا سی بات کا تنکا پہاڑ بنا لیا۔"

"میں نے تمہیں آئینہ طنز کے طور پر بالکل نہیں دیا تھا۔ خدا کی قسم نہیں۔ مجھے تو سارے بازار میں وہی ایک شے تمہارے قابل نظر آئی تھی۔ جیسے تم صاف، سچی، کھری اور بیداغ ہو۔ ویسا ہی وہ شیشہ تھا۔"

زینی بولی۔

"آپ کا تحفہ میرے پاس امانت پڑا ہے، جب بھی موقع ملا آپ کے کمرے میں پہنچا دوں گی۔ کسی اور کو دے دیجئے گا۔ ..... زین صاحب! مجھے تو ویسے بھی آئینہ دیکھنے کی ہفتوں فرصت نہیں ملتی۔"

"میں نے تمہیں وہ آئینہ اپنی صورت دیکھنے کے لئے نہیں دیا۔"

"اور کس لئے دیا ہے۔ ؟"

"تاکہ تم اس میں میری صورت اچھی طرح دیکھ سکو۔"

"آپ کی صورت۔ کیوں۔ ؟ کیا مجھے آپ ویسے نظر نہیں آتے۔"

"نہیں۔" زین نے ہنس کر کہا۔ "تم نے ابھی تک مجھے دیکھا ہی نہیں۔ دیکھا ہوتا تو پہچانا بھی ہوتا۔"

"جی ــــ؟" زینی ایک دم کرسی پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"آپ نے کیا کہا ہے ؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

زین ناشتہ کرنے لگا۔

اس نے جب نظر اٹھائی تو زینی اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب زینی کی نظر زین کی نظر سے ٹکرائی تو اس کا سر زور زور سے چکرانے لگا۔ کیسی ہیں یہ آنکھیں زرد اور سرخ ڈوروں والی گہری گہری۔ گھنی پلکیں۔ روشن روشن دائرے ..... جوں جوں وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی گئی اس کا سر چکراتا گیا۔!! یوں کوئی اُلجھن سی اس کے لاشعور میں گڈمڈ ہونے لگی۔

کہاں دیکھیں تھیں یہ آنکھیں۔ کب دیکھی تھیں۔

وہ چکرا گئی۔ اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

"کیوں ؟ کچھ سراغ ملا۔ ؟" زین مسکرایا۔

"نہیں ــــ" زینی نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو آئینہ دیکھو۔ آئینے میں مجھے ڈھونڈو۔"

"آئینے میں تو صرف اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔"

"مگر میں تو جس کی چاہوں۔ اس کی صورت دیکھ لیتا ہوں۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً یہ کہ میں جب بھی آئینہ دیکھوں، مجھے اس میں تمہاری صورت نظر آتی ہے۔"

"میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"کاش میرے سچ کا بھی تمہیں اعتبار ہوتا۔"

"جناب! آپ اپنی یہ لچھے دار باتیں تو ان لڑکیوں کے لئے رکھیں۔ اور مجھے میرے باورچی خانے میں رہنے دیں۔"

ابھی زین کوئی جواب نہیں دینے پایا تھا کہ آنٹی معروف اپنے ڈریسنگ گاؤن کی رسیاں کستے ہوئے آن پہنچیں۔

زین نے کہا:

"آنٹی در اصل میں اسے افریقی کھانوں کی ترکیبیں سمجھا رہا تھا اور یہ اتنی کند ذہن ہے اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بس بحث کئے جا رہی تھی۔"

آنٹی معروف اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ہاں اگر اس میں ذرا بھی عقل ہوتی تو قسمت کی دھنی ہوتی۔" انہوں نے پیالی میں قہوہ انڈیلتے ہوئے کہا۔

زین نے پھر نئے سرے سے اپنی مہم شروع کی۔ اور اس مرتبہ کمند دونوں بہنوں یعنی بونی اور فینی پر پھینکی۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو شیشے میں اتارنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا۔ دونوں کو خبر نہ ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور کس مقصد کے تحت ہو رہا ہے۔

بونی کافی بے وقوف لڑکی تھی۔ زین کو چند دنوں میں ہی احساس ہو گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے زین کے کسی بھی سوال کا جواب اس کی توقع کے مطابق نہیں دیا۔ البتہ زین کو اپنی جان چھڑانا مشکل ہو گئی تھی۔

پھر اس نے اپنا سارا زورِ بیان فینی پر لگا دیا۔ فینی کچھ اور ٹائپ کی لڑکی تھی۔

ادھر زینی بھی اس سے برہم تھی۔ زینی کو تو سمجھ ہی نہ آتی تھی کہ یہ زین اس گھر میں کیا کرتا رہتا ہے۔ اس کا پاکستان آنے کا مقصد کیا ہے۔ اس دن کی گفتگو کے بعد وہ اس کے متعلق سوچنے ضرور لگ گئی تھی اور جس قدر سوچتی، اتنا ہی الجھتی جاتی۔ خصوصاً جب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی یا تصور میں اس کی آنکھیں لاتی تو اس کا سر زور زور سے چکرانے لگتا۔ اور جی گھبرانے لگتا۔ عجیب بے کلی سائے وجود پر چھا جاتی۔

یہ آنکھیں کہاں دیکھی تھیں؟ وہ تو سوچ سوچ کر تھک گئی تھی۔ پھر سوچتی شاید میرا وہم

ہے۔ بھلا یہاں ایسی آنکھیں کس کی ہوسکتی ہیں۔ اب عام طور پر زین رات کو بھی دیر سے آنے لگا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا کر سو جاتے۔ تب وہ آتا اور اس بے چاری کو اسے کھانا کھلانا پڑتا۔ وہ بھلا کس بات سے انکار کر سکتی تھی؟

یوں بھی اس گھر میں کسی کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ دن ہو یا رات جب کوئی آئے، جب کوئی کھائے۔ ایک صرف وہی کولہو کا بیل تھی۔ نہ کسی کو اس کا احساس تھا اور نہ وہ یہ احساس دلانا چاہتی تھی۔ کئی بار اس کا دل چاہا، وہ زین سے کہہ ہی دے کہ ایک کسر رہ گئی تھی۔ تم اب رات کو سب سے لیٹ آنے لگے ہو۔ صبح مجھے پانچ بجے اٹھنا ہوتا ہے، میں بھی انسان ہوں۔

اس رات جب وہ دیر سے آیا تو اس نے زینی کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھے، یوں تو وہ کھانا میز پر رکھ کر چلی جایا کرتی تھی۔ آج منہ بنائے کھڑی رہی۔

"یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔"

"کیوں؟"

"ہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔" زین نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "اور میرے نوالے گنتی جاؤ۔"

"کمینہ۔" اس نے دل ہی دل میں گالی دی، مگر بیٹھ گئی۔

وہ بڑے بڑے نوالے کھانے لگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی لال لال آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔

کالا سیاہ رنگ، موٹے موٹے ہونٹ، گھونگھریالے بال، سُرخ گہری گہری آنکھیں لیکن پھر بھی اس میں ایک کشش تھی، جس کا احساس پہلی بار زینی کو ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس گھر میں سب سے زیادہ کالی تھی۔ مگر اس کے سامنے واقعی گوری لگ رہی تھی۔

"میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟" وہ اچانک مُسکرا کر بولا۔

"کالا حبشی اور کیا ——؟"

"یہ تو سب ہی کہتے ہیں۔" وہ پھر ہنسا۔ "ویسے میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔؟"

"مجھے —— کیا مطلب؟"

"بھئی تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟"

"ظاہر ہے چچا کا بیٹا تو نہیں سمجھتی۔ بس ایک انسان سمجھتی ہوں اور ایک پردیسی بھی اسی لئے آپ کے سارے کام ہمدردی سے کرتی ہوں۔ ورنہ جس قسم کا آپ کا رویہ ہے آپ سے تو بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"اوہو۔ تو ہمدردی ہوگئی ہے تمہیں مجھ سے، اس کا مطلب ہے معاملہ شروعات میں داخل ہو چکا ہے۔"

"کیسی شروعات؟" وہ حیرت سے بولی۔

"بھئی پہلے تم مجھے یہ بتاؤ، تمہیں میرے رویے سے کیا شکایت ہے؟"

"بس کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔ اب یہی دیکھئے آپ نے رات کو دیر سے آنا شروع کر دیا ہے اور صبح پانچ بجے بیڈ ٹی لیتے ہیں۔ آخر میں بھی انسان ہوں اور آپ جانتے ہیں، گھر کا سارا کام میرے ذمے ہے، اب آپ میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے؟"

"اوہو، یہ بات ہے۔" زین واقعی شرمندہ ہوگیا۔

"دراصل زینی اس گھر میں مجھے تمہارے ساتھ باتیں کرنے کا تو وقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے جان بوجھ کر دیر سے آنا شروع کر دیا۔ تاکہ تم سے کچھ باتیں کر سکوں، مگر واقعی یہ تم پر زیادتی ہے۔ کل سے میں جلدی آجایا کروں گا۔"

"بھئی آخر مجھ سے باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے آپ کو ——؟ آپ جانتے ہیں، اس دن بھی آپ کے جانے کے بعد آنٹی معروف نے میری خوب خبر لی تھی اور کہا تھا کہ میں مہمانوں سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کروں، اپنے جامے میں رہوں، اب

آپ مجھے اس گھر سے نکلوانا چاہتے ہیں ؟"

"میرے ہوتے ہوئے تمہیں اس گھر سے کوئی نہیں نکال سکتا، ذہن نشین کر لو، اور کچھ دنوں تک تمہیں علم ہو جائے گا کہ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے، سمجھیں۔" اس نے اس انداز سے زینی کی آنکھوں میں دیکھا کہ اس کا سر زور زور سے چکرانے لگا۔ مگر وہ اسے محو حیرت چھوڑ کر جلد جلد سیڑھیاں چڑھ گیا۔

ایک دن وہ باہر بیٹھی اپنے انتہائی لمبے بالوں کو سلجھا رہی تھی کہ وہ وہیں آ گیا، اس کے قریب آ کر بولا:

"میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔"

اس کے ہاتھوں میں کنگھا رک گیا۔

زین نے جیب سے ایک بڑا خوب صورت اور بیش قیمت کلپ نکال کر ہتھیلی پر رکھا "تمہارے بالوں کے لئے، جو اتنے خوبصورت ہیں کہ جب کھل کر بکھر جاتے ہیں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

وہ دوبارہ کنگھی کرنے لگی۔

"پسند نہیں یہ بھی، بہت معمولی شے ہے اس لئے۔"

"نہیں۔" اس نے اپنی آنکھوں کو ہلا کر جواب دیا۔

"پھر ——؟"

"کیوں آخر بھلا ؟"

"ان کو سمیٹ کر رکھا کرو نا اس کلپ سے —— یہ بالوں کے ساتھ ساتھ رہے گا۔

تو میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اندر سے آنٹی معروف آتی دکھائی دیں۔ زینی نے جلدی سے زین کی ہتھیلی پر پڑا ہوا کلپ اٹھایا اور اپنی مٹھی میں چھپا لیا، زین اندر کو لپکا۔

"ہیلو آنٹی ـــــ آنٹی گرم گرم چائے پلوائیں نا!"

"زینی سے کہا ہوتا!"

"ان محترمہ سے اپنی گھٹائیں نہیں سنبھالی جا رہیں، چائے کب بنائیں گی!"

"اسی لئے اس کم بخت سے کہتی ہوں۔ یہ نامراد بال کٹوائے، کسی دن اس کے ساتھ زبردستی کرنی پڑے گی!"

زینی کا رنگ زرد ہو گیا، اس کا دل چاہا زین کا منہ نوچ لے، مگر وہ ہنس ہنس کر آنٹی کے فکر کی تعریف کر رہا تھا۔

جب آنٹی ذرا ادھر ادھر ہوئیں تو دوڑ کر کچن میں آیا اور چپکے سے اس کے کان کے قریب ہونٹ لا کر بولا۔

"بال ہرگز نہ کٹوانا، آنٹی کو میں سمجھا لوں گا۔ پلیز!"

اور پھر باہر بھاگ گیا۔

"افوہ، کس قدر بے باک ہوتے ہیں یہ جنگلی!" پہلی بار زینی کا دل ایک عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ اور لب مسکرانے لگے۔

اس دن کے بعد سے زین واقعی جلدی گھر آنے لگ گیا تھا۔ سب کے ساتھ مل کر کھانا کھا لیتا، کبھی کھانا باہر سے کھا کر آتا۔ اب تو اس کے بہت سے دوست بھی بن گئے تھے۔ جن کے ساتھ اس کی شامیں گھر سے باہر گزرنے لگی تھیں۔ ایک مشہور و معروف وکیل صاحب سے تو اس کی اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ وہ اکثر اسے ڈھونڈتے ہوئے گھر پر بھی چلے آتے۔

جس سے زینی نے اندازہ لگا لیا کہ زین کا دل پاکستان میں خوب لگ گیا ہے۔

نہ جانے کیوں اس رات کے بعد سے زینی، زین کے متعلق کچھ زیادہ ہی سوچنے لگی تھی

اب اس کا دل چاہتا کہ زین رات کو دیر سے آیا کرے، اسے چھیڑے، اسے ستائے۔ وہ زندگی کے اس جمود، یاسیت سے تھک گئی تھی۔ کبھی کبھی تنہائی میں ماضی کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے اسے یوں محسوس ہوتا، جیسے کالا کلوٹا زین ایک چراغ کی صورت میں جگمگانے لگا ہے۔

ایسا چراغ جس کی روشنی میں وہ دور تک دیکھ سکتی ہے اور کبھی اسے یہ سب ایک ناٹک لگتا ـــــ کھیل یا تماشا ـــــ پر اب اس کا دل بھی اس تماشے کو مچلنے لگا تھا۔ قید تنہائی سے وہ عاجز آ گئی تھی، اور جہاں اسے جادو گر بڑھیا نے بند کر رکھا تھا۔ وہاں تو باہر کی دنیا کو دیکھنے کے لئے کوئی روزن ہی نہ تھا۔

اس لئے اب وہ زین کی چاپ کی منتظر رہتی۔ چاہتی کہ وہ خواہ مخواہ اس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈے۔

ان دنوں عجیب اتفاق ہوا تھا۔ کہ "معروف گیسٹ ہاؤس" میں صرف زین ہی اکیلا مہمان تھا۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوتا تھا، بلکہ بعض اوقات تو کئی کئی مہینے "معروف گیسٹ ہاؤس" بالکل خالی پڑا رہتا تھا۔ زینی خوش تھی۔ اسے صرف زین کا کمرہ صاف کرنا پڑتا تھا۔

وہ اس کی اک اک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتی اور بار بار الٹ پلٹ کر دیکھتی۔ مگر اس کے کمرے سے اسے کبھی کوئی انوکھی نرالی شے نہ ملی۔ نہ لڑکیوں کی تصویریں، نہ خوشبودار خطوط بس یوں زاہد خشک سا سیدھا سا والڑکا لگتا تھا وہ۔

پھر پتہ نہیں یہ لولو، بوفی اور فینی اس پر کیوں مرنے لگی تھیں۔ اسے اپنے دل میں ایک حسد سا محسوس ہوتا۔

اب اس حسد نے جلن کی شکل اختیار کر لی۔ جب ایک دن اس نے محسوس کیا کہ اسجکل ٹوٹو صاحبہ زین کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہیں۔

بس اس کی کسر باقی تھی اور زین کو دیکھو یہ بھی کس قدر کمینہ ہے۔ جانے کیوں جب وہ دونوں کو ہنستے کھیلتے دیکھتی تو کھولنے لگتی۔ زین بھی یہ سب محسوس کر رہا تھا۔ مگر یہ اس

کے ترکش میں آخری تیر تھا۔ ایک دن اسے خیال آیا کہ ٹوٹو کو لڑائی کرنا چاہیئے۔

ٹوٹو ایک صحت مند اور بے وقوف درجہ اوّل قسم کی لڑکی تھی اور زین کا دھیان آج تک اس کی طرف نہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس لئے سب اس کو یہی تاثر دیتے کہ تم بچی ہو ـــــ لیکن وہ بچی بالکل نہیں تھی۔ اپنی جسامت کے لحاظ سے اپنی تینوں بہنوں کو پیچھے چھوڑ جاتی تھی، البتہ اس کی حرکتوں میں طفلانہ حماقتیں شامل ہوتیں۔ اسے ہمیشہ یہی شکوہ رہتا کہ بچی سمجھ کر کوئی اسے لفٹ نہیں دیتا ویسے وہ اب اپنی عمر کے انیسویں سال میں تھی۔ اور اسے بچی کہنا اس پر ظلم ہی تو تھا۔

زین نے اس کی کمزوری بھانپ لی اور اس کو اس توجہ سے سرفراز کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وہ تمنائی تھی۔ اس بات سے ٹوٹو بہت خوش ہوئی کہ آخر کسی نے تو اسے "سیانی" جانا۔

زین نے تو اسے چند دنوں میں ہی باور کرا دیا کہ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے ـــــ اور ٹوٹو نے اپنے دل کی خفیہ خواہشوں کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن بولی۔

"زین، مجھے سچ سچ بتاؤ، تم مجھ سے شادی کرو گے یا یونہی مجھے فلرٹ کر رہے ہو؟"

"فلرٹ، میں تو فلرٹ کرنے کا قائل ہی نہیں ہوں۔"

"پھر تم مجھ سے شادی کرو گے؟"

"اگر تمہاری ممی اجازت دیں گی تو ضرور کروں گا۔ کیونکہ میرے ابا نے کہا تھا، اگر پاکستان میں تمہیں کوئی لڑکی پسند آجائے تو اس سے شادی کر لینا۔"

"ہائے سچ" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ پھر بڑا سا منہ بنا کر بولی۔

"میری ممی تو کبھی اجازت نہیں دیں گی۔ وہ کہتی ہیں شادی کے لئے ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ کیا میں چھوٹی ہوں زین ـــــ کیا میں شادی کے قابل نہیں ہوں؟"

"میرے خیال میں تو شادی کے لئے یہی عمر موزوں ہے۔"

"مگر تمہیں پتہ ہے، ہمارے گھر میں کوئی بھی شادی کو اچھا نہیں سمجھتا۔ میری بڑی بہنیں بھی شادی کے حق میں نہیں ہیں، وہ کہتی ہیں، تیس سال کے بعد شادی کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔ مگر ـــــ مجھے تو شادی بڑی اچھی لگتی ہے۔ اپنا گھر، اپنا شوہر۔"

"مجھے تمہاری باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی ہے ٹوٹو، تم تو واقعی اپنی تینوں بہنوں سے مختلف ہو۔ میرا خیال ہے، میں کچھ عرصہ اور یہاں رہا تو تمہاری ممی کو قائل کر لوں گا۔"

"ہاؤ سویٹ آف یو زین۔" ٹوٹو نے اپنے مخصوص انداز میں زین کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"ہاں مگر تمہیں ہر معاملے میں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ اور مجھے اپنے دل کی ہر بات بتا دینی چاہیئے۔" زین نے کہا۔

"سچی ـــــ زین میرا تو خود دل نہیں چاہتا کہ تم سے کچھ بھی چھپاؤں۔ خدا کی قسم تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو، اور مجھے تم پر بڑا بھروسا ہے۔"

"آزمالوں گا کسی دن۔"

"چاہے آج آزما لو۔" وہ ادا سے بولی۔

"اچھا ـــــ جو باتیں ہم میں ہوتی ہیں، وہ تم گھر میں کسی کو مت بتایا کرو۔"

کبھی بھی نہیں۔ میری بہنیں تو چڑیلیں ہیں، پہلے ہی مجھ سے جلتی ہیں، مجھے پتہ ہے وہ اس بات سے خوش نہ ہوں گی۔"

"اور دیکھو، زینی کو بھی پتہ نہ چلے۔"

"زینی ـــــ اے ـــــ وہ تو بے چاری ہے ـــــ اس کا کیا ہے ـــــ اگر وہ کوئی غلط حرکت کرے نا، تو ممی اس کو جان سے مار دیں۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

"چلو پھر کسی دن پکنک منانے چلیں۔" زین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟"

"کہیں، ذرا شہر کے ہنگاموں سے دور!"

"اُف کس قدر مزہ آئے گا۔" وہ مدہوش ہوتے ہوئے بولی۔ "لیکن صرف ہم دونوں ہی چلیں گے، شرط یہ ہے۔"

زین بھی تو یہی چاہتا تھا۔ بولا

"ٹھیک ہے، مانے لیتے ہیں۔"

"تو پھر اس سنڈے کو۔"

"نہیں پرسوں۔"

"ہاں ـــــ طے ہو گیا۔"

دونوں گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر اُٹھ گئے۔

اس روز جانے کیوں زینی خلی بھنی بیٹھی تھی کہ زین اچانک کچن میں آ گیا۔ بولا۔

"ایک پیالی گرم گرم چائے کی ملے گی؟"

"بیٹھ جایئے مَیں بنا دیتی ہوں۔"

"فٹافٹ۔"

"کیوں، کہیں بھاگنے کا ارادہ ہے؟" وہ بولی۔

"اچھا زینی، مجھے سچ سچ بتاؤ، تمہارا یہاں سے بھاگ جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے

اب رہائی ملے گی تو مَر جائیں گے"

"یہ تو بہت مایوس کن بات ہے۔"

"بھاگ کر کہاں جاؤں گی، یہ میرا گھر ہے، کم از کم تسکین کے لئے یہ خیال ہی کافی ہے۔ ورنہ اس گھر سے بھی بے دخل کر دی جاؤں گی۔"

"لیکن یہ تو مسز معروف کا گھر ہے۔"

"اوہ ـــــ ہاں ـــــ" وہ بوکھلا گئی ـــــ "میرا مطلب ہے، ٹھکانہ تو ہے،

ورنہ کل کو کسی نے دو چار دن رکھ کر نکال باہر کیا تو مَیں کیا کروں گی۔ ان لوگوں کے مجھ پر بہت احسان ہیں۔ پھر اتنے بے مروّت بھی نہیں کہ مجھے نکال باہر کریں۔"

"یہ لوگ تو خیر جتنے بے مروّت ہیں، مَیں خوب جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس گھر سے تمہیں بیدخل نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ تمہارا گھر ہے۔"

"جی ـــ جی ـــ" چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں چھلکنے لگی۔

"میں تو غریب اور لاوارث لڑکی ہوں، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس نے خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"غریب اور لاوارث لڑکی ہوش میں آؤ ـــ" وہ اپنے مخصوص انداز میں، آواز دھیمی کر کے گرجا۔

"مگر آپ ـــ آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟"

"پہلے رشتوں کی پہچان کرو۔ انسانوں پر اعتماد کرنا سیکھو، خلوص کو پرکھو، مَیں کون ہوں، کیا ہوں، تمہیں کیوں بتاؤں؟ اپنے خفتہ جذبوں کو بیدار کر کے میرا کھوج لگاؤ۔ جس دن تمہیں میرے خلوص پر یقین آ گیا، تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چائے پیئے بنا ہی باہر نکل گیا۔ پیالی میں گرم گرم چائے اس کے وجود کی طرح لرزتی رہ گئی اور پیالی کو تھامے تھامے وہ کئی منٹ تک گم صُم کھڑی رہی۔

اتوار کی صبح، زین نے خاص طور پر زینی سے کہہ دیا کہ وہ اور ٹوٹو پکنک منانے شہر سے دُور جا رہے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے کھانے کی چیزیں نو بجے تک تیار مل جانی چاہئیں۔

ٹوٹو بھی صبح سے اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ کبھی کپڑوں کا انتخاب کرتی، کبھی زینی کے سر ہو جاتی کہ وہ کیا کچھ پکا کر ساتھ دے رہی ہے، کبھی آئینے کے آگے کھڑی ہو جاتی اور اپنے ہیئر اسٹائل کے بارے میں سوچتی ـــ زین البتہ اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ اور زینی کو اس قدر غصہ آ رہا تھا کہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ آج کچھ بھی تیار نہ کرے۔ ساری چھپکلیاں اور مینڈک اکٹھے کر کے ان کے ہاٹ کیس میں بند کر دے ـــ چائے کی جگہ زہر ڈال دے فلاسک میں۔

یہ موٹی بھینس ٹوٹو ـــ اس میں بھلا کیا بات ہے۔ بات کرنے تک کا سلیقہ نہیں ـــ اور چلے ہیں زین صاحب اسے لے کر ایک دن شہر کے شور و غل سے دُور۔

اونہہ ـــ!

ٹھیک وقت پر زین نیچے اُترا۔ اس نے کالی عینک لگا رکھی تھی۔ بالکل آج کل کے لڑکوں کی طرح شوخ اور متضاد رنگوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایک ہاتھ میں کیمرہ تھا، دوسرے میں اس کا ٹیپ ریکارڈر لٹک رہا تھا۔

یعنی وہ تو جی جان سے تیار ہو کر آیا تھا۔

"زینی۔ ہماری چیزیں تیار ہیں ——" اس نے باورچی خانے میں جھانک کر کہا۔

"جی ——" زینی ہاٹ کیس بند کرتے ہوئے رُوکھے پھیکے انداز میں بولی۔

زین دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔

"اتنا غصّہ کیوں چڑھا ہوا ہے تمہیں؟"

"مجھے کیوں چڑھنے لگا غصّہ؟"

"ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھو، میں نے تمہارے ماتھے پر اتنے بل کبھی نہیں دیکھے۔"

"نہیں دیکھے ہوں گے؟" وہ اسی رُوکھائی سے بولی۔

"بھئی اگر تمہیں بُرا لگتا ہے تو میں ٹوٹو کے ساتھ نہیں جاتا۔" وہ ہونٹوں میں ہنسی دبا کر بولا۔

"مجھے کیوں بُرا لگے۔" وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولی —— "میں کون ہوتی ہوں بُرا ماننے والی، میرا آپ کا کیا ناطہ ہے؟"

"بھئی اصل ناطے تو دِل کے ہوتے ہیں۔"

زینی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ باسکٹ میں پلیٹیں اور نیپکن رکھتی رہی۔

"اَب یہی دیکھو نا؟" زین پھر گویا ہوا —— "کچھ لوگ ہماری جھوٹی باتوں کا یقین کر کے زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں —— اور کچھ لوگ ہماری سچی محبت اور کھرے خلوص کو نہیں مانتے —— بس اپنی اکڑ دکھاتے چلے جاتے ہیں۔"

زینی اب بھی کچھ نہ بولی۔ اس کے مُنہ لگنا فضول تھا، اور واقعی وہ بھلا اس پر اپنے غصّے کا اظہار کیوں کر رہی تھی۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا زینی؟" وہ اس کے بے حد قریب آ کر بولا۔

"آپ کی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ مَیں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جب ٹوٹو سے آپ کا دِل بھر جائے گا تو پھر آپ کیا کریں گے؟ آپ کو تو لڑکیاں بدلنے کی عادت ہے۔"

زین نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، جیسے اسے اس بات کا بہت لطف آیا ہو۔

"پھر —— پھر اس گھر میں ایک اور لڑکی بھی ہے —— سڑی مریچ جیسی، بدمزاج، کالی کلوٹی، بنگال کا جادو ——"

پیشتر اس کے کہ زینی اسے پلٹ کر کوئی سخت جواب دیتی، ٹوٹو زین کا قہقہہ سُن کر اسی طرف آ گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی باورچی خانہ سستی قسم کی خوشبوؤں سے بھر گیا زینی نے ایک نظر اسے سر سے پاؤں تلک دیکھا۔

"اونہہ، جوکر لگ رہی ہے اس فضول لباس میں ——" اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

"آہا —— آج تو ہماری ٹوٹو بہت ہی سمارٹ اور خوبصورت لگ رہی ہے۔" زین نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے کھانے کا سامان اٹھایا، کچھ چیزیں ٹوٹو نے پکڑ لیں۔ دونوں باہر کو چلے۔

"آج چولہے میں آنچ تیز ہے، ذرا ہلکی کر لینا۔" جاتے جاتے زین نے معنی خیز انداز میں زینی سے کہا۔

اور اتنا بڑا پھندا اس کے گلے میں پھنس کر رہ گیا۔

آج رات زینی بہت اُداس تھی —— ہمیشہ سے زیادہ —— یوں اُداس رہنا اُجڑی اُجڑی پھرنا تو اس کی فطرت بن چکی تھی۔ اب اس کے پاس تھا ہی کیا، جس کے آسرے پر وہ زندگی کو جیے جانے کا فریب دیتی —— پر آج کی رات تو اُداسیاں اور مایوسیاں گھٹا باندھ کر آئی تھیں۔ پھر سے پُرانے زخم کھُل گئے تھے۔ اور اس کی آنکھیاں مون سون کے لدے اور بھرے ہوئے بادل بن گئی تھیں کہ جل تھل کرنے پر آمادہ تھیں۔

یوں بھی ایک عرصے کے بعد کراچی شہر پر کالے کالے بادل اُمنڈ گھمنڈ کر آئے تھے ورنہ یہ شہر —— اپنے مکینوں کی طرح بالکل خشک مزاج تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، برسات سے بے پرواہ، سفید سفید، اُجلا اُجلا شہر، کاروباری لوگ، اُجلی اُجلی سڑکیں، خوبصورت موٹریں، ہنگامہ، ہاؤ ہُو —— مگر ایک دوسرے سے اجنبیت —— بیگانگی —— وہ کراچی کے آسمان پر اُودی گھٹائیں دیکھ کر ملک پڑی تھی۔ اسے اپنا دیس یاد آ گیا تھا۔ دیس کے گیت، دریا اور فضائیں یاد آ گئی تھیں۔ اماں اور ابا یاد آ گئے تھے ——

اپنا بچپن یاد آگیا تھا۔ اسکول کا زمانہ اور بچپن کی سہیلیاں یاد آگئی تھیں۔ جب وہ تین چار سہیلیوں کے ہمراہ اپنی کشتی خود کھے کر دوسرے گھاٹ پر اترا کرتی تھی اور پھر وہاں سے اسکول جاتی تھی۔ اسکول کی گھنٹی میں کتنا رس تھا، وہ زبان کتنی پیاری تھی جس میں صبح صبح وہ اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتی تھیں۔ اس کے گلے کے سُر صبح ہی صبح کس سوز سے بج اُٹھتے تھے کہ ہیڈ مسٹریس سمیت سب ہی جھومنے لگتے تھے۔

زندگی کتنی خوبصورت تھی۔ ارمان کتنے معصوم تھے، مستقبل کے اندیشے نہ تھے اپنا ایک دیش تھا، ایک وطن تھا۔

پھر کیسی ہوا چلی؟ افوہ، وہ لرز گئی ـــــ پھر کیسی خونی ہوا چلی ـــــ کہ لہو کا رنگ ہی بدل گیا۔ لہو کا رنگ بدل جائے، تو کون کس کو پہچانتا ہے۔ اپنے پرائے ہو جاتے ہیں۔ اور زمین تنگ ہو جاتی ہے۔ جہاں وہ فخر سے اچھل کود کرتی تھی، جس دھرتی کو وہ اپنی ماں کہتی تھی، جس کی ہواؤں سے گلے لپٹ لپٹ کر وہ جوان ہوئی تھی۔ اسی دھرتی کو اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔

اماں ابا کا خیال تھا، کچھ دنوں میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو وہ سب پھر واپس آجائیں گے۔ انہوں نے زینی کو پہلے کراچی بھیج دیا۔

اور جب خود آنے کا سوچ رہے تھے تو ـــــ تو ـــــ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ خبر تو یہاں کچھ ایسی ہی آئی تھی۔ پر اب تک اس کا یقین کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔

وہ پیاری پیاری، جھکی جھکی خوب صورت آنکھوں والی اماں، بھاری بھرکم، اونچے لمبے، خوش گفتار ابا ـــــ اور بھیا ـــــ بھیا خوبصورت جیالے، سانولی رنگت اور بھاری جسم والے بھیا۔

آنسوؤں کا ایک ریلا آیا اور اس کی کمزور سی ہستی کو ہلا گیا۔ وہ پھر آج جی بھر کر رو رہی تھی یادوں کے سینے کھرچ رہی تھی۔ جانے رات کا کونسا پہر جا رہا تھا، اداس سا چاند ٹیلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ دھندلی دھندلی روشنی ہر طرف پھیلی تھی۔ اس کے چاروں اور اندھیرے تھے، اور وہ اندھیروں میں روشنی کی کرن ڈھونڈ رہی تھی۔

"پتہ نہیں کیوں وہ اتنی دکھی ہو رہی تھی۔ جب وہ سو بار گزری باتوں کا ماتم کر چکی ہے" اس نے دل میں سوچا۔ جانے زین اور ٹوٹو کب پکنک سے واپس آئے تھے گھر میں سارا دن کیا ہوتا رہا تھا۔ اس نے تو طوعاً و کرہاً تمام فرائض پورے کئے تھے اور اپنے کوارٹر میں آگئی تھی۔ اس کی کھاٹ کمرے کے باہر ہی پڑی تھی، وہیں وہ لیٹ گئی۔ اور اپنی الجھی سوچوں کو اور الجھانے لگی۔

اور پھر ٹھنڈی آہوں کی دکھن کو کلیجے میں بھینچتے بھینچتے اس کے ہونٹ آپ ہی آپ وا ہو گئے۔ اور ایک درد بھرا نغمہ فضا میں بکھرنے لگا۔ اس کی پُرسوز معصوم اور سریلی آواز کا نغمہ۔

لکڑی جل کر کوئلہ بھئی، کوئلہ جل کر راکھ
میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر وہ یونہی دیوانوں کی طرح درد بھرے گیت گا گا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتی تھی ـــــ اوندھی لیٹی جانے وہ کس عالم میں گائے چلی جا رہی تھی۔ کہ کوئی شے اس کی کمر کو آ کر لگی۔ پہلے تو اس نے کوئی کیڑا پتنگا جانا ـــــ یونہی ہاتھ سے کمر سہلا کر لیٹ رہی۔ پھر دوبارہ ویسی ہی کوئی شے آ کر لگی ـــــ جب سہ بارہ وہی شے آ کر اس کی کمر لگی ـــــ تو وہ ڈر کر اُٹھ بیٹھی۔

مڑ کر دیکھا، تو اپنی کھاٹ پر کاغذ کی ننھی ننھی تین گولیاں پڑی تھیں۔ یہ کون مار رہا ہے بھئی۔ وہ ادھر ادھر حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس طرف تو کوئی آ بھی نہیں سکتا۔ یہ گھر کا پچھواڑہ تھا۔ تھوڑا سا حیران ہو کر وہ سیدھی لیٹ گئی۔ اور سر کے نیچے بازو رکھ لیا۔

اب کے جو کاغذ کی گولی آئی، وہ اوپر کی طرف سے آئی تھی۔ اس نے حیران ہو کر چھت پر دیکھا۔

کوئی جنگلے کے اُوپر جھکا ہوا اسے گولیاں مار رہا تھا۔ زین ـــــ؟ ایک دم اس کے ذہن میں خیال آیا اور ساتھ ہی اس کا دل دھڑکنے لگا۔

لیکن پھر اسے یاد آگیا کہ صبح زین اسے کتنی بے مروتی سے کچوکے لگا کر گیا تھا۔
اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ اور سوتی بن گئی ـــــ دو چار کاغذ کی گولیاں اور گریں
اور پھر زین نے اسے بڑے نرم لہجے میں بڑے پیار سے پکارا۔

"زینو ـــــ"

"زینو ـــــ"

ہائے زینو ـــــ یہ پکار سن کر تو اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اماں اور ابا
ایسے پکارا کرتے تھے۔

اسی نرم اور میٹھے لہجے میں۔

اور آج اتنے عرصے بعد یہ پکار پھر سنائی دی ـــــ یہ ظالم کونسا روپ دھار رہا
ہے، کیوں اس کے زخموں کو کھرچ رہا تھا۔

اس نے بے بس ہو کر اوپر کی طرف دیکھا۔

زین اسے اوپر بلا رہا تھا۔ زین کے سر کے اوپر چاند چمک رہا تھا۔ اور چاند کے
ارد گرد اودے بادلوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے مختلف شکلوں میں تیر رہے تھے۔
اور کہیں سے رات کی رانی کی خوشبو آرہی تھی۔

اور اس کا دل ابھی تک زینو ـــــ زینو ـــــ کہے جا رہا تھا۔

کتنی عجیب بات ہے یہ۔ اس نے دل میں سوچا۔ خوبصورت بھی اور خوفناک بھی۔

یہ زین کون ہے؟ اور خواہ مخواہ میری زندگی پر کیوں مسلط ہوا جاتا ہے۔

چاند ـــــ زین اور وہ ـــــ ایک دوسرے سے فاصلوں پر کھڑے تھے، تین
مختلف سمتیں بن کر، مگر ان کا رُخ اچانک ایک درجے کی جانب ہو گیا تھا۔ کیا زین
نے گردش بدل لی تھی۔ یا وہ گردش میں آگئے تھے۔

کاش، اس رات کی سحر نہ ہو، جو ہو تو ـــــ تو بالکل نئی ہو۔ ہمیشہ سے مختلف
اس نے دل میں تمنا کی۔

"زینو، تھوڑی دیر کے لئے اوپر آؤ۔ پلیز ـــــ میں نے تم سے ایک ضروری

بات کہنی ہے۔"

"ضروری بات" ـــــ جسے سننے کے لئے وہ سخت بیتاب تھی۔

پر اجنبی پر بھروسہ کیسا؟

لیکن جب اس نے زینو کہا تو وہ اپنے دل کو روک ہی نہ سکی۔ یہ تو محبت کی زبان
کا انداز تھا۔ اس نے یوں پکارا کہ وہ ایک دم کھنچتی چلی گئی۔ اور پہنچ کر دم لیا۔

"آؤ اندر کمرے میں چل کر کچھ باتیں کرتے ہیں۔"

وہ ڈری سہمی اس کے پیچھے چلی، مگر دروازے میں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"اندر آجاؤ، ڈرو نہیں۔" زین اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا۔

"آج میں بہت بے چین تھا، تم سے بہت سی باتیں کرنی چاہتا تھا۔ میں نے جانا
کہ تم سو گئی ہو، مجھے نیند نہیں آرہی تھی، مگر جب تمہارے گانے کی آواز سنی تو اٹھ
کر چلا آیا۔ سوچا ـــــ میں اکیلا ہی کیوں جاگوں۔" وہ مسکرایا۔

"تمہاری آواز واقعی بہت مدھ بھری ہے اور پُرسوز ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی۔

"میں تمہیں کچھ افریقی نغمے سناؤں، میری ٹیپ میں ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں
دیکھتا ہوا بولا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پہلے تم بیٹھ جاؤ۔"

زینی نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔

"جہاں چاہو بیٹھ جاؤ۔"

زینی دروازے کے پاس ہی قالین کے کونے پر بیٹھ گئی۔

زین نے ٹیپ چلا دیا، گیت بجنے لگے، اجنبی زبان ـــــ اجنبی ساز، اجنبی انداز
اس کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، مگر زین کی خاطر وہ آنکھیں موندے نغمے سنتی رہی۔ یکایک
نغمے بند ہو گئے اور باتوں کی آواز آنے لگی۔

کچھ دیر تو اسے پتہ ہی نہ چلا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے، مگر جب اپنا نام سُنا تو وہ چونک گئی۔ ٹیپ چل رہی تھی اور زین اور ٹوٹو محوِ گفتگو تھے۔

"ٹوٹو ڈارلنگ، مجھے ایک بات بتاؤ گی؟"

"ضرور بتاؤں گی، مگر پہلے تم مجھے بتاؤ، تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟"

"یہ جو سمندر تمہارے سامنے پھیلا ہوا ہے نا، اس سے زیادہ ——"

"ہاؤ سویٹ ——" ٹوٹو نے خوشی سے چیخ ماری۔

"اچھا، یہ بتاؤ سویٹ ہارٹ، یہ جو تمہاری نوکرانی ہے نازینی، یہ مجھے عجیب پراسرار سی لگتی ہے، یہ کون ہے؟"

"بھلا تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں ممی نے سختی سے منع کیا ہے کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا، اسی لئے تو وہ نہ اسے کہیں باہر جانے دیتی ہیں اور نہ کسی سے ملنے دیتی ہیں۔"

"مگر تمہاری ممی نے مجھے تو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"اچھا!" وہ حیرت سے بولی۔

"یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ مشرقی پاکستان سے آئی ہے، اس کے ابا بہت بڑے بزنس مین تھے اور . . . . ہاں ہاں مجھے تو انہوں نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ جس گھر میں تم لوگ رہتے ہو، یہ بھی زینی کے ابا کا ہے۔"

"اللہ —— کیا سچ؟"

"جاؤ میں تم سے نہیں بولتا۔ تم بہت بے وفا ہو، دیکھا مجھ سے سب کچھ چھپا رہی تھیں۔ اور ابھی کہہ رہی تھیں، میں تم پر بہت بھروسہ کرتی ہوں۔"

"خدا کی قسم مَیں تم پر بہت بھروسہ کرتی ہوں زین!" ٹوٹو نے لبسورتے ہوئے کہا۔

"اگر تم بھروسہ کرتی ہوتیں، تو ساری بات شروع سے آخر تک مجھے بتا دیتیں اگر تم اپنے راز الگ رکھو گی، تو میرا تمہارا نباہ کیسے ہوگا؟"

زین روٹھ گیا۔

"اللہ زین، پلیز روٹھو نہیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ سب کچھ، پھر چاہے ممی مجھے پھانسی پر کیوں نہ چڑھا دیں۔"

زین خاموش رہا۔

"تمہیں معلوم ہے، ہم لوگ کافی عرصہ چٹاگانگ میں رہے ہیں۔ میرے ڈیڈی سیٹھ عبدالرزاق کے مُلازم تھے۔ ان کی ایک جیوٹ مل تھی۔ اور ایک قالین بنانے کی فیکٹری ہمارے ڈیڈی قالین بنانے کی فیکٹری میں جنرل مینجر لگے ہوئے تھے۔ خوب مزے سے گزر رہی تھی ہماری۔ سیٹھ صاحب کے ہاں بھی آنا جانا تھا۔ ان کی بیوی بہت اچھی تھیں اور زینی بھی ہمارے ساتھ سہیلیوں کی طرح پیش آتی تھی۔ پھر جب وہاں کے حالات خراب ہوئے تو سیٹھ صاحب نے اپنے ملازموں کو وہاں سے نکالنا شروع کیا۔ ایک دن انہوں نے ڈیڈی کو بُلا کر کہا کہ وہ جب کراچی جانے لگیں تو اپنی فیملی کے ساتھ زینی اور اس کی امّی کو بھی یہاں لے آئیں، کیونکہ یہاں بھی ان کا کافی سرمایہ تھا اور یہ کوٹھی انہوں نے زینی کے نام سے بنوائی ہوئی تھی۔"

"زینی کی امی نے تو آنے سے انکار کر دیا۔ وہ بولی۔ ہم سب ایک ساتھ جائیں گے مگر زینی کے ابّا ذوالفقار نے مجبوراً زینی کو ہمارے ساتھ بھیج دیا۔ اس کے ساتھ جائیداد کے تمام کاغذات اور بہت سا روپیہ بھی تھا۔ اور سیٹھ صاحب کو ڈیڈی پر بڑا بھروسہ تھا۔ کیونکہ ڈیڈی نے ان کے ہاں دس سال تک ملازمت کی تھی۔

ہم لوگ زینی کو لیکر کراچی آ گئے۔

ایک ماہ بعد ہی پتہ چلا کہ مکتی باہنی والوں نے سیٹھ صاحب اور ان کے خاندان کو بیدردی سے قتل کر دیا ہے۔

پھر جنگ شروع ہو گئی اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ ہم نے ہر طرح سے پتہ کرایا، مگر زینی کے والدین کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ ہر جگہ سے یہی خبر آئی کہ ان کو شہید کر دیا گیا ہے۔"

"زینی بے چاری رو دھو کر چپ ہو گئی۔"

"پھر آگے کیا ہوا؟" زین بولا۔

"آگے کیا ہونا تھا، تم دیکھ نہیں رہے؟"

"میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگوں نے اسے نوکرانی بنا کر رکھا ہوا ہے، اور اس کی دولت پر خود عیش کر رہے ہو۔"

"ہمیں کیا پتہ بھئی، کہ یہ کیا چکر ہے۔"

"ممی اور ڈیڈی کی اس بات پر بہت دفعہ لڑائی ہوئی ہے۔ مگر جب سے ڈیڈی کو ہارٹ ٹربل ہوئی ہے نا، تو وہ تو بس چپ کر گئے ہیں۔ ہمارا سوسائٹی میں ایک چھوٹا سا گھر ہے، ممی نے وہ کرائے پر اٹھا دیا ہے اور ہم اس گھر میں آ گئے ہیں یہاں آنے سے ہمارا سٹیٹس بھی بدل گیا ہے۔"

"اور پتہ ہے اگر زینی پر کنٹرول نہ کریں نا تو یہ ضرور کسی کے ساتھ بھاگ جائے اور ہمارے اوپر مقدمہ کر دے۔"

"ہوں ـــــ تو تم لوگ کب تک اس کو اس طرح قید کر کے رکھ سکو گے۔"

"ممی کہتی ہیں جب تک ہو سکا۔"

"اچھا ٹو ٹو ڈارلنگ، چھوڑو اس فضول قصے کو ـــــ کوئی اور اچھی سی بات بتاؤ۔"

اور پھر ایک دم ٹیپ بند ہو گئی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ زین، زینی کی سسکیاں بڑی اچھی طرح سن سکتا تھا ـــــ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

کیا یہ سب سنوانے کو زین نے اسے اوپر بلایا تھا۔ زین تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر اسے بازو سے پکڑ کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور بولا۔

"مجھے افسوس ہے زینی، میں نے سب کچھ تمہیں سنوا کر اتنی تکلیف پہنچائی، میں ایسا کبھی نہ کرتا، اگر تم مجھ پر اعتماد کرتیں۔ اور اپنے منہ سے سب کچھ بتا دیتیں۔"

"مگر کیسے ـــــ آپ ـــــ آپ سے میرا کیا ناطہ تھا؟" وہ روتے ہوئے بولی

"سچ سچ بتاؤ، کیا تم میرے متعلق کچھ بھی محسوس نہیں کرتیں؟"

"آپ کون ہیں، میں تو یہی سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی ہوں۔"

"میں جو بھی ہوں۔ تم بتاؤ، تمہیں کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔ "مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے، جب آپ سے میرا کوئی ناطہ نہیں، اور آپ مجھے اتنا تنگ کرتے ہیں، تو دل آپ کی طرف کیوں کھنچتا ہے ایک کشش سی کیوں محسوس ہوتی ہے؟"

"اچھا، اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، تو تم کیا جواب دو گی؟"

"شادی۔؟" زینی ایک دم پیچھے ہٹ گئی ـــــ "بھلا مجھ سے ـــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے یا نہیں، یہ تم مجھ پر چھوڑو ـــــ مگر ہاں یا نہ میں جواب دو۔"

زینی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر بولی۔

"اس شرط پر کہ آپ مجھے لے کر فوراً نیروبی چلے جائیں گے۔ میں شادی کروں گی۔"

"شاباش ـــــ" زین نے بچوں کی طرح اس کا سر تھپتھپایا اور بولا۔ "یہ جواب بہت درست ہے۔"

"اب جگر تھام کے بیٹھو، میں تمہیں ایک خوش خبری سنانے والا ہوں۔"

وہ اٹھ کر اپنی مقفل دراز میں سے ایک چھوٹا سا بکس اٹھا لایا۔ اسے کھول کر اس نے ایک پرانی طرز کی انگوٹھی نکالی اور بولا۔

"پہلے ہاتھ ادھر لاؤ، میں تمہیں انگوٹھی پہنا دوں ـــــ پھر بعد میں تم کہیں مکر نہ جاؤ۔"

زینی سچ مچ شرما گئی مگر اس نے ہاتھ آگے کر دیا۔ زین نے اس کے سیدھے ہاتھ کی تیسری انگلی میں انگوٹھی پہنا دی، اور پھر اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا۔

زینی کی آنکھوں میں پھر آنسو مچلنے لگے۔

زین نے لفافے میں سے ایک گروپ فوٹو نکالا اور زینی کے ہاتھ میں دے کر بولا۔

"ان لوگوں کو پہچانتی ہو؟"

زینی نے اس فوٹو کو بار بار دیکھا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا ـــــ کبھی زین کی صورت دیکھنے لگتی۔ اور کبھی تصویر کو ـــــ کچھ چہرے جنہیں وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ پہچان گئی تھی اور کچھ چہرے شناسائی کے باوجود بیگانہ بیگانہ سے تھے۔

اماں ابا کی تصویر تو اس کے ذہن پر نقش تھی، وہ انہیں کیسے بھول سکتی تھی۔ گو یہ ان کی جوانی کی تصویر تھی۔ ان کے ساتھ ایک باریش بزرگ بیٹھے تھے پیچھے دو لڑکے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کی عمر بارہ سال ہوگی اور ایک دس سال کا تھا۔ دس سال کا لڑکا وہ پہچانتی تھی، غالباً وہ ذوالفقار بھیا تھے۔ ان کے بچپن کی تصویریں پہلے بھی اس نے دیکھی تھیں۔

آگے ایک چار پانچ سال کی ننھی بچی ہاتھ میں اپنی گڑیا لئے دو لمبی لمبی چوٹیاں آگے ڈالے کھڑی تھی۔ زینی کو اپنا بچپن پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ پھر اس نے باریش بزرگ اور بارہ سالہ لڑکے پر انگلی رکھ کر کہا۔

"ان دونوں کو نہیں پہچانا؟"

"اس کا مجھے یقین تھا۔ مجھے معلوم تھا تم انہیں نہیں پہچانو گی۔"

"اچھا مجھے یہ بتاؤ، تمہارے کوئی تایا تھے، جو کبھی افریقہ میں رہتے تھے؟"

"ہاں ہاں ـــــ" زینی ایک دم یاد کرتے ہوئے بولی "میرے تایا عبدالغفور افریقہ میں رہتے تھے۔ ابا میاں ان کے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ وہ وہاں تبلیغ کرتے ہیں۔"

"کیا ان کے کوئی بچے بھی تھے؟"

"جی ہاں ـــــ غالباً ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اسے سب ہمارے گھر میں گگو کہا کرتے تھے۔"

"اور کیا وہ کبھی تم لوگوں سے ملنے مشرقی پاکستان گئے تھے۔"

"مجھے تو کچھ یاد نہیں، اماں بتاتی تھیں۔ جب میں بہت چھوٹی تھی تو وہ ایک بار اپنے بیٹے کو لے کر آئے تھے۔"

"تو محترمہ، یہ بزرگ تمہارے وہی تایا ہیں، جو تمہارے بچپن میں تمہارے ہاں آئے

تھے۔ اور یہ لڑکا گگو ہے، ان کا بیٹا۔"

"اور یہ اسی زمانے کی یادگار تصویر ہے، پہچانا انہیں اب؟"

وہ پھر تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔

"مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں آرہا۔ مگر یہ تصویر ضرور اسی زمانے کی ہے۔"

"مگر ـــــ یہ آپ کے پاس کیسے آگئی؟"

اس نے زین کی جانب جب نظریں اٹھا کر دیکھا، تو وہ گہری گہری نظروں سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ جب ان سرخ سرخ گہری آنکھوں سے ٹکرائی تو اسے پھر چکر سے آنے لگے۔ یوں لگا۔ جیسے وہ گر جائے گی۔

یہ آنکھیں

یہ شوخ آنکھیں

سرخ آنکھیں

ضدی آنکھیں

اس کے لاشعور میں ہلچل مچانے لگیں، پہلے بھی کہیں دیکھی ہیں؛

دور ـــــ ماہ و سال سے پرے ـــــ بچپن میں ـــــ جب وہ تن تنہا اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، تو دو آنکھیں، محض اسے ستانے کے لئے اس کی گڑیا توڑ دیا کرتی تھیں۔ اُسے رلا کر خوش ہوتی تھیں۔ ستا کر مسکراتی تھیں ـــــ پھر لاشعور کے ایک روزن پہ دھری رہ گئیں یہ آنکھیں۔

"خدا کے لئے آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ آپ کون ہیں؟" اس نے ایک دم زین کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"بھئی اگر تم مجھے ایک دم سے بھائی جان نہ کہہ دو، تو میں تمہیں بتاؤں کہ میں وہی گگو ہوں۔ تمہارا تایا زاد۔ اور تمہیں کھوجتا کھوجتا یہاں آپہنچا ہوں۔"

"کوئی میرا اپنا ـــــ مجھے ڈھونڈتا ہوا آپہنچا ـــــ ہائے" فرطِ جذبات سے زینی کا جی بھر آیا اور اس نے زین کے شانوں پہ اپنا سر رکھ دیا۔ اور پھر بلک بلک

کر رونے لگی۔ جیسے بچھڑا بچہ اپنی ماں کے سینے سے لگ کر روتا ہے۔

کتنی بے وقوف تھی وہ ـــــ سارے رشتے ناطے ہی اس نے بھلا دیئے تھے۔ دُنیا سے کٹ کر الگ ہوئی بیٹھی تھی ـــــ اور سوچتی تھی ـــــ اس کا کون ہے؟

مگر زین یہاں آیا کیسے؟ پہنچا کیسے؟ میرا کھوج لگایا کیونکر؟ ابھی تک اس کے ذہن میں وسوسے کلبلا رہے تھے۔

جب اس نے روتے روتے سر اٹھایا تو زین بولا۔

"بس اب چپ کر جاؤ۔ مَیں تمہیں ایک خوش خبری سنانے والا ہوں۔ اس کے بعد تم روئیں تو مَیں تمہیں کوئی بات نہیں بتاؤں گا۔"

زینی اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے۔ تمہارے ابا زندہ ہیں؟"

"سچ ـــــ؟" زینی کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ" زین نے اس کے رخسار تھپتھپائے کہ کہیں خوشی سے پاگل نہ ہو جائے۔

"مگر وہ اندھے ہو گئے ہیں۔"

"اندھے ـــــ کیسے؟" زینی کا رنگ زرد ہو گیا۔

"حوصلے سے سنو گی تو بتاؤں گا، ورنہ آگے کوئی بات نہیں بتاؤں گا۔"

"جی ـــــ" زینی ٹھیک ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں وہاں سے بھیج دینے کے بعد وہ لوگ خود کراچی آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ تمہیں معلوم ہے ذوالفقار ایک پاکستان کا زبردست حامی تھا، لیکن باہنی والے تو اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ انہیں جب پتہ لگا کہ یہ لوگ مغربی پاکستان جا رہے ہیں تو ایک رات گھر میں گھس آئے۔ ذوالفقار نے مقابلہ کرنا چاہا تو انہوں نے اس کا سینہ گولیوں سے چھید دیا۔ تمہاری اماں جو تیور اکر گریں، تو وہیں پلٹ فیل ہو گیا۔ جب چچا ابا چیخنے لگے اور کہنے لگے۔ ظالمو، میری آنکھوں کے سامنے ہی میرے جوان بیٹے کو تم نے ذبح کر دیا ہے، تو انہوں نے

چچا ابا کی آنکھیں نکال دیں۔ اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ اب تمہیں بیٹے کی لاش دیکھ کر صدمہ نہیں ہو گا۔"

"چچا ابا کو جب ہوش آیا تو انہوں نے اپنے ایک امریکی دوست کو فون کر کے گھر بلایا۔ اپنی بپتا سنائی۔ اس نے کسی طرح انہیں، لندن پہنچا دیا۔ وہاں پہ کافی عرصہ ان کا دماغی توازن خراب رہا۔ نہ کسی کو پہچانتے اور نہ کچھ بتا سکتے۔ رفتہ رفتہ وہ ٹھیک ہوئے، تو انہوں نے ہمیں اطلاع بھجوائی۔ میں جا کر انہیں لے آیا۔ کافی عرصے تک ان کا علاج ہوتا رہا۔ اور جب وہ بالکل ٹھیک ہو گئے تو انہوں نے ہمیں تمہارے بارے میں بتایا۔ تمہارا کچھ علم نہ تھا کہ کس حال میں ہو، یہاں جتنے خط لکھے گئے۔ ان لوگوں نے جواب نہ دیا۔ پھر کسی سے خبر کرائی تو پتہ چلا۔ یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔"

"چچا ابا کا تو خیال تھا کہ تمہیں جلد از جلد وہاں سے بلوا لیا جائے اور باقی سب کچھ چھوڑ دیا جائے۔ مگر میں کہاں ماننے والا تھا۔ مَیں نے کہا۔ مَیں خود جاؤں گا۔ نہ صرف یہ کہ اپنی منگیتر کو ڈھونڈ کر لاؤں گا، بلکہ ان لوگوں کو اس فراڈ کا ایسا مزا چکھا کر آؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھیں گے۔"

"منگیتر ـــــ" وہ ابھی تک اس بات پر حیران ہو رہی تھی۔

"جی ہاں ـــــ ہماری آپ کی منگنی اس زمانے میں ہو گئی تھی ـــــ جب ہم آپ کے ہاں آئے تھے۔ اس لئے اکثر گڑیاں وڑیاں چھین کر آپ کو تنگ بھی کیا کرتے تھے۔"

زینی شرما گئی۔ اور اس کی نظر اپنی انگلی پر جا پڑی، جو آج اس کی قسمت کی طرح جگمگا رہی تھی۔

وہ آج کتنی خوش تھی ـــــ اور کتنی دکھی بھی ـــــ اماں اور بھیا کا خیال بار بار آ رہا تھا مگر اب زین کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر بھی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"زین، مَیں جلد از جلد اپنے ابا کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

"ہوں ـــــ" اس نے ایک لمبا ہنکارا بھرا۔ "اسی لئے تو مَیں نے آتے ہی تمہیں ساری کہانی نہیں سنائی تھی۔ تم تو میرا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیتیں۔ ان سب کو تو بتا رہا ہوں سارے

ثبوت مَیں نے حاصل کر لئے ہیں، تو اب ایسے ہی ان کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ دیکھا نہیں تم نے مَیں نے ٹُوٹو کے ساتھ کیا چکّر چلایا ہے کہ اس نے خود ہی سب کچھ اُگل دیا ہے۔"

"ہاں تم اب مجھے یہ بتاؤ۔ بینکوں کے اور گھر کے کاغذات کس کے پاس ہیں؟"

"بینکوں کے کاغذات تو اِن لوگوں نے مجھ سے لے لئے تھے۔ مگر گھر کے کاغذات مَیں نے زمین کھود کر ایک جگہ چھپا دیئے تھے۔ کیونکہ مجھے ان کی نیّت کا علم ہو چکا تھا۔ اگر وہ کاغذات بھی ان کے قبضے میں چلے جاتے تو اَب تک انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہوتا۔ کئی بار میری اور میرے کمرے کی تلاشی لے چکے ہیں۔ مگر ابھی تک انہیں شک ہے کہ وہ ضائع نہیں ہوئے۔ میرے پاس ہیں۔ وہ کاغذات آپ کو لا دوں؟"

"ہاں وہ کاغذات اَب مجھے دے دو۔"

"اَب آپ کیا کریں گے؟"

"تم بس خاموشی سے دیکھتی جاؤ، اور جو مَیں کہوں کرتی جاؤ۔"

اتنے میں دور کہیں سے مؤذن کی آواز آئی۔

"ارے صبح ہو گئی؟" وہ دونوں چونکے۔ وہ جب اُوپر آئی تھی تو غالباً بارہ بجے تھے۔ باتوں باتوں میں انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔

"اچھا، اب تم جاؤ۔ شکر کرو کہ یہ لوگ بے دین ہیں، دیر سے اُٹھتے ہیں، ورنہ آج انہیں سب باتوں کی خبر ہو جاتی۔ اب تم یوں کرو، چائے بنا کر میرے کمرے میں رکھ جاؤ، جیسے روز رکھ جاتی ہو۔ اور اس کے بعد میری ہدایات پر عمل کرتی جاؤ۔"

زینی جب سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ تو اس کے ایک ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔ اور دوسرے میں گروپ فوٹو۔ افوہ! اس رات کی سحر کتنی خوب صورت تھی۔ کتنی حیات آفرین۔ کتنی سحر آگیں۔ رات اس نے کس دل سے دعا مانگی تھی۔ کہ جھٹ سے قبول بھی ہو گئی۔

اسے اللہ میاں پر بے اختیار پیار آنے لگا۔ اس نے سوچا پہلے وہ نیچے جا کر سجدۂ شکر بجا لائے گی۔ اور اس کے بعد زین کو چائے دے گی۔

معروف گیسٹ ہاؤس میں آج قیامت برپا تھی۔ ہر بڑے چھوٹے کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس لئے کہ آج صبح سے زینی غائب تھی۔

"زینی کہاں چلی گئی؟"

"زینی کس کے ساتھ چلی گئی؟"

"اور کیوں چلی گئی؟"

یہ سوالات ہر ایک کی زبان پر مچل رہے تھے۔

وہ خاموش خاموش، سیدھی سادی، میلی کچیلی اور فرمانبردار سی لڑکی ـــــ کہاں اور کس کی شہ پر چلی گئی تھی۔ آج تک اپنے حقوق کے بارے میں زبان کھولنے کی اس کو ہمت نہ ہو سکی۔ جھوٹا موٹا کھایا، اُترن پہنی، شہر میں اس کی کسی سے واقفیت نہ تھی۔ محلے والے اُسے معروف صاحب کی نوکرانی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مسز معروف نے اسے دھمکا رکھا تھا کہ اگر اس نے کبھی زبان کھولی تو اسے جان سے مار دیا جائے گا۔ وہی زینی جو اِن سب سے بے حد ڈرتی تھی۔ آج صُبح سے غائب تھی۔ اس کا کمرہ جوں کا توں تھا۔ ہر شے اپنی جگہ رکھی تھی۔ باورچی خانہ بھی معمول کے مطابق تھا۔ صبح کی چائے کے لئے میز پر برتن رکھے تھے۔ پہلے تو سب لوگ چائے کی میز پر بیٹھے اُسے آوازیں دیتے رہے۔ پھر ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اس کی تلاش شروع ہوئی۔ تو وہ کہیں بھی نہ تھی۔ گیٹ پر جو چوکیدار تھا اس

نے کسی کو گھر سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر اسے جن اٹھا کر لے گئے یا زمین کھا گئی۔ مسز معروف تو بولائی بولائی پھر رہی تھیں۔ البتہ لڑکیوں کی مختلف رائے تھی۔

لولو کا خیال تھا۔ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ ٹوٹو کہہ رہی تھی۔ ممکن ہے۔ اسے کسی نے مار ڈالا ہو۔

فینی اور جونی کا کہنا تھا۔ حالات سے تنگ آکر وہ سمندر میں کود گئی ہوگی۔

"مگر کم بخنو، اسے سمندر کا راستہ کس نے بتایا۔ اور کس طرح وہ وہاں تک پہنچی۔ جب کہ رات دس گیارہ بجے تک تو وہ باورچی خانے میں تھی۔"

کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اور صرف ایک مسٹر معروف تھے، جو صحیح معنوں میں پریشان نظر آرہے تھے۔ اور بار بار اپنی بیگم سے کہتے۔

"بیگم! میں نہ کہتا تھا۔ اس پر اتنا ظلم نہ کرو۔ ایک دن بھانڈا پھوٹ کر رہے گا۔ ایک دن ساری دنیا کو پتہ چل جائے گا، کہ ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ مگر تم نے میری کہاں سُنی؟ کب سُنی؟"

"تم بک بک نہ کرو جی۔ اور ایک طرف جا کر بیٹھ جاؤ۔" مسز معروف غصّے میں بھری ہوئی تھیں۔ "میں اسے پاتال سے بھی نکال کر لے آؤں گی۔ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ اور میرے ساتھ کوئی فریب یا مکر نہیں چل سکتا۔"

مسٹر معروف دل کے مریض تھے۔ اور یہ مرض انہیں ان کی بیوی کی طرف سے تحفتاً ملا تھا۔ کچھ سال پہلے وہ بالکل اچھے بھلے تھے۔ شریف النفس اور ایماندار تھے۔ جب زینی کو لے کر کراچی آئے تھے، سیٹھ عبدالرزاق کے نمک حلال ملازموں میں سے تھے۔ حرص و ہوس کا کوئی ناگ ان کے اندر کنڈلی مارے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ اسے بھی اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ اور بڑے پیار سے رکھا ہوا تھا۔ پانچ لاکھ روپیہ نقد جو رزاق صاحب نے اپنی بیٹی کے لئے دیا تھا۔ انہوں نے آکر بنک میں رکھوا دیا تھا۔ کراچی میں بھی ان کی فیکٹری کی ایک برانچ تھی۔ جسے مسٹر معروف نے یہاں آکر سنبھال لیا تھا۔ مگر انہیں کیا علم تھا کہ یوں حالات پلٹ جائیں گے۔ اور حالات کے پلٹتے ہی مسز معروف کا دماغ بھی پلٹ گیا۔ خاص طور

پر جب سیٹھ رزاق اور ان کی فیملی کے شہید ہو جانے کی خبر آئی تو جیسے اُن کی ساری مرادیں بَر آئیں۔ اتنا زیادہ روپیہ، کوٹھی، کاروبار ـــــ سب کچھ ان کا ہو سکتا تھا۔ جب کہ گھر میں چار جوان لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا تھا۔ انہیں ان سب چیزوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ اور زینی انہیں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔

اگر مسٹر معروف کی کمزور ہستی درمیان میں نہ ہوتی، تو انہوں نے ویسے ہی زینی کو راستے سے ہٹا دیا ہوتا۔ لیکن اب ان کا خیال تھا لڑکی کو بہت دباؤ کے تلے رکھنا چاہیئے اگر اس پر بے جا سختی نہ رکھی گئی، تو وہ اپنے حقوق کے لئے لڑنے پر آمادہ ہو جائے گی۔

میٹرک پاس معصوم اور سادہ لوح زینی میں اتنی طاقت کہاں تھی۔ اس پر والدین کی جدائی کے صدمے نے اسے نیم پاگل بنا رکھا تھا۔ پھر وہ جاتی تو کہاں اور کس کے آسرے پر۔ یہاں کراچی میں اس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ واقف نہ تھا۔ کبھی کبھار اماں اور ابا کے ساتھ آتی اور چند روز رہ کر چلی جاتی۔

ننھال والے سب ڈھاکے میں تھے۔ اور ددھیال ـــــ تو اس کی تھی نہیں ـــــ ابا کے ایک ہی بھیّا تھے۔ جن کے متعلق وہ بتایا کرتے تھے کہ تبلیغ کے لئے افریقہ جا بسے ہیں ـــــ خود ابا کاروبار کی وجہ سے بنگال میں ٹک گئے تھے۔ یوں اُن کا تعلق یو۔پی سے تھا۔ مگر انہوں نے ایک بنگالی دوشیزہ سے شادی کر لی تھی۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں ان کے اپنے مکانات تھے۔ طبعاً دیانتدار اور محنتی تھے۔ کاروبار خوب چمک آیا تھا۔ تو انہوں نے ایک برانچ مغربی پاکستان میں بھی کھول لی۔ ادھر بھی اُن کا آنا جانا رہتا تھا۔

زینی کو تو اپنے تایا ابا کے متعلق بھی زیادہ علم نہیں تھا کہ وہ افریقہ کے کون سے مُلک میں ہیں۔ ان کا ایڈریس کیا ہے۔ یا ان سے تعلقات کیسے ہیں۔ ایک ہی بار جب وہ چھوٹی سی تھی، وہ اپنے بھائی کا کھوج پا کر انہیں ملنے ڈھاکہ آئے تھے۔ ممکن ہے دونوں بھائیوں میں خط و کتابت رہتی ہو۔ مگر اس نے اپنے ہوش میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کے گھر میں ان کا ذکر بھی کم ہوتا تھا، یا شاید اس کے سامنے ذکر کم ہوتا ہو۔

وہ تو یہی سمجھ بیٹھی تھی کہ اس بھری پُری دنیا میں اب اس کا کوئی نہیں۔ اور جو زندگی

قدرت نے اسے بخش دی ہے۔ اس پر ہی قناعت کرے۔

کون اس جادو کے سیاہ پھاٹک کو کھولے گا۔ کون اس کے سر سے جادو کی سوئیاں نکالے گا؟ اور کون اس پر آبِ حیات چھڑک کر اسے نئی زندگی عطا کرے گا؟

وہی زینی آج پھر اسرار طور پر کہیں چل دی تھی اور گھر بھر میں طوفان مچا ہوا تھا۔ کسی کا بس نہیں چلتا تھا کہ کہیں سے ڈھونڈھ کر اسے لائیں اور اس کی بوٹیاں نوچ کر چیلوں اور کوؤں کو کھلا دیں۔

شور اور توڑ پھوڑ کی آوازیں سُن کر زین اسی طرح بوکھلایا ہوا سلیپنگ سوٹ میں ہی نیچے اُتر آیا۔ آج وہ خلافِ معمول دیر سے اٹھا تھا۔

"کیا ہوا آنٹی، کیا بات ہے؟"

وہ نیند سے بوجھل آواز میں بولا۔ اور ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

پہلے تو آنٹی معروف کا دل نہ چاہا، اسے کچھ بتائے، بالکل غیر ہے، اور پرائے ملک کا بھی ہے، مگر پھر یہ سوچ کر کہ اس گھر میں رہتا ہے۔ اس سے یہ بات کیسے چھپائی جائے گی! انہوں نے ساری بات اسے بتا دی۔

"اوہو! یہ تو بہت بُرا ہوا ـــــ میرا خیال ہے آنٹی، آپ کو پولیس میں رپٹ درج کرا دینی چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔" جیسے آنٹی کو سانپ نے ڈس لیا ہو۔ "ہم یہ غلطی نہیں کر سکتے، ہم شریف لوگ ہیں، بدنام ہو جائیں گے۔"

"میرے تو خیال میں یقیناً اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔" زین بڑے تردّد سے بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ آپ کی ذرا سی تاخیر اس کی زندگی کے لئے خطرہ بن جائے۔"

"ہاں ـــــ" مسٹر معروف کا بھی یہی خیال تھا کہ پولیس سے مدد لی جائے۔

مگر آنٹی معروف تو پولیس کے نام ہی سے بدکتی تھیں۔ اب بھی ان کو یقین تھا کہ وہ کسی ایرے غیرے کے ساتھ آنکھ مٹکا کر کے چلی گئی ہے۔ وہ خراب کر کے اسے گھر سے نکال دے گا، اور پھر جوتیاں چٹخاتی یہیں آجائے گی۔

مسٹر معروف کو بار بار اختلاج ہو رہا تھا اور وہ گولی پہ گولی کھائے جا رہے تھے۔

"اگر وہ سیدھی پولیس اسٹیشن چلی جائے اور ان کا پول کھول دے تو ـــــ"

وہ تو خدا کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں تھے۔ انسانوں کو کیا دکھاتے۔ ذرا کال بیل بجتی، فون کی گھنٹی بولتی، تو ان کا دل دھڑکنے لگتا۔

لڑکیوں نے مل جُل کر بڑا بدمزہ ناشتہ بنایا تھا۔ سب نے چند لقمے زہر مار کئے۔

شام تک اس کی کوئی خبر نہیں آئی۔ زین بھی تھکا ہارا ـــــ ڈولتا ہوا واپس آگیا۔ رات سر پہ آگئی۔ اور مسٹر معروف کا دل بیٹھنے لگا۔ انہیں نظر آرہا تھا کہ اب زینی کا اس گھر میں لوٹ کر آنا بالکل ناممکن ہے۔ جو لڑکی ایک رات گھر سے باہر گزار سکتی ہے، وہ اس گھر میں لوٹ کر نہیں آسکتی۔ جو اس کے لئے قید خانہ ہو۔

رات بھر ان کی حالت غیر رہی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے ان کی حالت خطرناک بتائی ڈاکٹر کا خیال تھا۔ اگر فوراً انہیں ہسپتال نہ لے جایا گیا، تو ان کے دل کی حالت اور بھی بگڑ جائے گی۔

مسز معروف تو ویسے بھی ان کے وسوسوں سے اکتائی ہوئی تھیں، علی الصبح انہیں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اور پھر سب مل کر گھر بیوافتاد کا حل تلاش کرنے لگے۔

اگلے ہفتے، اچانک، بالکل اچانک، زین نے ان کے گھر پر ایک ایٹمی دھماکہ کیا۔ یعنی جب سب لوگ چپ چاپ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ بولا۔

"آنٹی، آپ کو ایک خوش خبری سناؤں؟"

"خوشخبری؟" آنٹی نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "خوشخبری تو اب اس گھر کے لئے صرف ایک ہی ہو سکتی تھی۔ کہ زینی کا کھوج مل گیا ہے۔"

مگر زینی تو ایک ہفتے سے "پتہ تھی۔ اور سب لوگ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر بھی لاشعوری طور پر وہ سب اسی کے کھوج میں رہتے تھے۔

جب زین نے خوش خبری کی بات کی، تو سب چونکے ــــ مگر زین بڑے سکون سے بیٹھا نوالہ چباتا رہا ــــ اور پھر بھرا ہوا پانی کا گلاس آہستہ آہستہ پی کر اس نے ان سب منتظر آنکھوں کی طرف دیکھا جو اس کے چہرے پر لگی تھیں۔ اور بڑے خوبصورت انداز میں مسکرا کر بولا۔ "آنٹی، میں نے شادی کر لی ہے۔"

"شادی ــــ تم نے ــــ" آنٹی نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

چاروں لڑکیوں کے سروں پر مختلف انداز کا دھماکہ ہوا۔

صرف ٹوٹو نے بپھر کر بے اختیار کہا۔

"جھوٹ ــــ"

"جھوٹ نہیں یہ سچ ہے۔" زین اسی طرح مسکرا کر بولا۔

"کہاں؟ کب؟ کیوں؟" آنٹی نے بڑے کھردرے لہجے میں تین لفظ ادا کئے۔

"یہیں کراچی میں ــــ کل رات ہی ــــ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ شاید مجھے وہ لڑکی پسند آ گئی تھی۔"

"کون ہے؟ کس خاندان کی ہے؟" لولو نے طنزاً کہا۔ "جنہوں نے آپ کا کچھ نہیں دیکھا اور لڑکی پکڑا دی۔"

"ویسے تو بہت لوگ اس کراچی میں ہیں ــــ جو لڑکے کا کچھ نہیں دیکھتے، صرف پیسہ دیکھتے ہیں اور اپنی جوان لڑکیاں اس کے ایما پر چھوڑ دیتے ہیں۔" زین نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہوں گے۔" لولو کندھے اچکا کر بولی ــــ، "مگر ہم کسی ایسے کو نہیں جانتے۔"

"بس یہ سمجھ لو لڑکی میرے ہی قبیلے کی ہے۔"

"کیا مطلب؟" لولو نی جلدی سے بولی۔ "کیا وہ حبشن ہے؟"

اس طنز پر زین پھر مسکرایا۔

"ایسا ہی سمجھ لیجئے۔"

"اچھا تو ــــ قصہ یہ ہے کہ یہاں کوئی حبشی فیملی آ کر سیٹل ہو گئی ہو گی۔ آپ کی ان سے جان پہچان ہو گئی ہو گی۔ اب پاکستانی لڑکے تو کالی سیاہ لڑکیاں پسند نہیں کرتے انہوں نے اپنے وطن کا لڑکا دیکھ کر پھنسا لیا ہو گا ــــ" فینی نے جیسے بڑے پتے کی بات کی۔

"ہاں ــــ" لولو نے ایک معنی خیز ہاں کھینچ کر کہا۔ "یہ بات البتہ جی کو لگتی ہے، ورنہ کسی اچھے خاصے خاندان کی لڑکی۔۔۔۔"

پھر اس نے منہ میں نوالہ رکھ لیا۔ اور دانستہ چپ ہو گئی۔

زین کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، اور پھر بولا۔

"آنٹی، نہیں پچھلے ایک سال سے آپ لوگوں کے ساتھ بالکل گھر کے ایک فرد

کی طرح رہ رہا ہوں۔ آپ لوگوں نے میری اتنی خدمت کی ہے، اتنے پیار سے رکھا ہے۔ آپ کی وجہ سے میری اس شہر میں واقفیت بڑھی۔ میں تو یہاں آکر اپنا گھر بار ہی بھول گیا ہوں۔"

آنٹی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر نظر اٹھا کر اس کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں آپ کا بہت مشکور ہوں آنٹی، اور بہت خوش بھی ——" اس نے اپنے لہجے میں مٹھاس بھر کر کہا۔ "کیا آپ کو میری شادی کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوئی؟"

اب آنٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بولیں:

"مجھے تو اس بات سے دکھ ہوا بیٹا، جب تم ہمیں اپنا سمجھتے تھے تو ہمیں شادی کی رسومات میں شامل کیوں نہیں کیا۔ ہم سے یہ خبر کیوں چھپائے رکھی؟"

"بس کچھ ایسی مجبوری تھی آنٹی کہ کل رات ہی سب کچھ طے ہوگیا اور فوراً نکاح ہوگیا۔ مگر میں لڑکی کو رخصت کرا کے ابھی نہیں لایا۔ میں نے کہا تھا۔ اپنی دلہن کو آنٹی کی اجازت سے ان کے گھر ہی لے کر جاؤں گا۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو آج رات کو میں اسے یہاں لے آؤں؟"

ٹوٹو ایک دم غصے سے کھڑی ہوگئی۔ ایک گلاس اس کے گھٹنے سے لگ کر گرا اور فرش پر گر کر چور چور ہوگیا —— مگر وہ پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"ہاں —— ہاں ——" آنٹی معروف خوش دلی سے بولیں۔ "یہ تمہارا اپنا گھر ہے، تم شوق سے اپنی دلہن کو یہاں لے آؤ۔"

"تو آنٹی، آج رات ریسپشن ہو جائے۔"

"ریسپشن؟" آنٹی حیران ہو کر بولیں —— "اتنے شارٹ نوٹس پر؟ ہمارے ہاں تو آج کوئی کھانا پکانے والا بھی نہیں ہے۔"

"بندوبست سارا میں کروں گا آنٹی —— یہ ریسپشن میری طرف سے ہوگی۔ ہوٹل سے کھانا یہاں پہنچ جائے گا۔ بس ذرا آپ مہمانوں کا استقبال کر کے انہیں یہ تاثر دیں کہ یہ میرا ہی گھر ہے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" آنٹی معروف نے اطمینان کا سانس لے کر کہا کہ شکر ہے ان کا کچھ خرچ نہ ہوگا۔

مگر لڑکیوں کے موڈ ابھی تک بگڑے ہوئے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اب بھی زین ان کے ساتھ کوئی ڈرامہ کرنے والا ہے۔ جس طرح کہ اس نے اس گھر میں اور بہت سے ڈرامے کئے ہیں۔

زین کھانا کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔

"آنٹی، میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ کھانے والے کا بندوبست کروں گا۔ اور کچھ مہمانوں کو بلانا ہے۔ ٹھیک چھ بجے شام ہوٹل سے کھانا یہاں پہنچ جائے گا اور ہم لوگ آٹھ بجے یہاں پہنچیں گے۔ امید ہے آپ لوگ ہمارے استقبال کے لئے تیار ہوں گے۔"

اس نے تینوں بہنوں کی طرف مسکرا کر دیکھا، مگر تینوں نے نظریں جھکا لیں۔

"تم فکر نہ کرو زین۔" آنٹی نے ان کی طرف سے جواب دیا۔ "سب کچھ انشاء اللہ تمہاری مرضی کے مطابق ہوگا۔"

مگر نہ جانے کیوں، آنٹی کا دل اندر سے خود ہول کھا رہا تھا کہ جانے کیا ہونے والا ہے یہ آدمی اپنی تمام تر نیازمندی اور اخلاقیت سمیت جیسے ان پر حاوی ہوا چلا جا رہا تھا۔

اگرچہ معروف سسٹرز اور آنٹی معروف کو زین کی یہ حرکت پسند نہیں آئی تھی۔ اور نہ ہی اس کا یقین آیا تھا۔ مگر ان کے اندر ایک ہلچل مچ رہی تھی۔ رات کا انہیں بے چینی سے انتظار تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کی دلہن دیکھنے کو بیقرار تھیں۔ مگر اوپر سے اتنی بے نیاز بننے کی کوشش کر رہی تھیں کہ ایک دوسرے پر بھی اپنی بے چینی ظاہر نہ ہونے دے رہی تھیں۔ سب سے زیادہ غصہ ٹوٹو کو آ رہا تھا جسے زین نے شادی کا جھانسہ دے کر گھر کا ہر راز اگلوا لیا تھا اور وہ بیچ بیچ کس قدر بے وقوف ثابت ہوئی تھی۔

آنٹی معروف بھی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں جب سے زینی غائب ہوئی تھی ان کا موڈ خراب رہنے لگا تھا، بلکہ دوبارہ گردے کے درد کی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ اوپر سے تو وہ ایک شیرنی کی طرح دھاڑتی تھیں، مگر اندر ہی اندر ہر دم خوف زدہ

رہتیں۔ مبادا ـــــ اچانک ـــــ کسی وقت ـــــ کوئی غیر متوقع بات ہو جائے۔ ضمیر کی کسک کہاں انہیں چین لینے دیتی تھی۔ اس پر زین نے بے وقت شادی رچالی تھی۔ عجیب لڑکا ہے۔ وہ دل میں سوچتیں اور جتنا سوچتیں وہ اتنا ہی پُراسرار اور ڈراؤنا معلوم ہوتا۔

ہم سب لوگ کس قدر آپ سٹ ہیں۔ معروف ہسپتال میں پڑے زندگی کی آخری سانس لے رہے ہیں۔ اور اس کو شادی کی پڑی ہوئی ہے، بلکہ کر بھی لی، خیر ـــــ

اَب کیا ہو سکتا تھا۔ اَب تو اس کا شایانِ شان استقبال کرنا ہی تھا۔ تبھی شام ہوتے ہی انہوں نے لڑکیوں کو آوازیں دینا شروع کیں تاکہ وقت سے پہلے تیار ہو جائیں۔ ہر لڑکی نے پہلے اپنے دل میں سوچ لیا تھا کہ آج رات وہ کونسا لباس پہنے گی۔ یعنی ہر ایک نے اپنا بہترین اور بیش قیمت لباس ذہن میں رکھا تھا۔ مگر ایک دوسرے پر یہ ظاہر کر رہی تھیں جیسے اَب اُٹھ کر تیار ہونا بھی ایک مصیبت ہے۔

"بھئی آج کیا پہنیں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ یونہی فضول سا فنکشن ہے، اور ممی خواہ مخواہ شور مچا رہی ہیں۔"

رات کے ٹھیک آٹھ بجے ایک کار گیٹ پر آکر رکی۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ایک دُلہن اور زین بیٹھے تھے۔ اور آگے ڈرائیور کے ساتھ ایک درمیانی عمر کا خوش لباس آدمی بیٹھا تھا۔

زین نے بڑے پیار سے بازو کا سہارا دے کر اپنی دلہن کو اتارا۔ اور پھر اسی طرح اسے تھامے تھامے اندر کو بڑھا۔ لڑکیاں تو یہ نظارہ دیکھ کر اندر چلی گئیں۔ مگر آنٹی معروف چہرے پر ایک مصنوعی خوشگواری اور خوش اخلاقی طاری کئے پیشوائی کو بڑھیں۔ پیچھے پیچھے وہ آدمی ہاتھ میں بریف کیس لئے ان کے ساتھ اندر کو چلا۔

زین نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر سب کو آداب کیا۔ اور بے حد جھکی ہوئی گردن والی دلہن کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آنٹی، یہ میری بیوی ہے، یعنی آپ کی بہو۔"

"خوش آمدید۔" آنٹی مسکرا کر بولیں۔ "خدا کرے تم دونوں ہمیشہ سکھی رہو۔ تمہاری آمد

ہمارے لئے باعثِ برکت ہو۔"

یہ کہہ کر وہ دلہن کے قریب آئیں۔ اس کا گھونگھٹ اونچا کر کے اس کا چہرہ اوپر کرنا چاہا تاکہ رسم کے مطابق اس کی پیشانی پر بوسہ دے سکیں، لیکن جونہی انہوں نے چہرہ اوپر کیا ـــ

اپنے ہونٹ آگے بڑھائے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اچانک انہیں سانپ نے ڈس لیا ہے دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ قہر آلود نگاہوں سے زین کو دیکھا ـــــ پھر دلہن کو دیکھا ـــ پھر زین کو ـــــ پھر چوٹ کھائی ناگن کی طرح پھنکارنے لگیں۔ کہاں تو انہوں نے دلہن کے بیٹھنے کو دیوان پر سرخ کامدانی کا گاؤ تکیہ لگا رکھا تھا۔ اور کہاں وہ انہیں بٹھانے کو تیار نہ تھیں۔

"یہ کیا حرکت ہے زین؟" انہوں نے ایک بالکل بدلی ہوئی گرجدار آواز میں کہا۔

"تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم ہمارے گھر میں رہو ـــــ ہمارا نمک کھاؤ، اور پھر ہمارے ہی اعتماد کو مجروح کر کے ہمارے ساتھ فراڈ کرو۔"

"آنٹی، آپ کے نمک کے تو میں برابر پیسے ادا کرتا رہا ہوں۔ اس لئے اس کا مجھ پر کوئی بوجھ نہیں۔ باقی رہی فراڈ کی بات ـــــ تو اگر یہ دھوکا ہوتا تو میں اپنی دُلہن کو کبھی آپ سے ملوانے نہ لاتا ـــــ وہیں سے لے کر چلا جاتا۔ تو آپ میرا کیا کر لیتیں؟"

"خیر میں تمہارا کیا کروں گی۔ یہ میں اب تمہیں بتاؤں گی، اور تمہارے ایسے ہوش ٹھکانے آئیں گے کہ پھر ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو گے۔ تمہیں معلوم ہے کراچی کے کئی اعلیٰ پولیس افسروں کے میرے ساتھ کیسے مراسم ہیں؟"

"جی میں جانتا ہوں۔" زین نے اسی ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "آپ چار جوان اور خوبصورت لڑکیوں کی ماں ہیں۔ آپ جس افسر کے ساتھ چاہیں، خوبصورت سے خوبصورت تعلقات رکھ سکتی ہیں، مجھے قید کروا سکتی ہیں۔ قتل کروا سکتی ہیں۔ مگر اس بار ہر قدم ذرا سوچ سمجھ کر اٹھائیے گا۔"

"بکواس بند کرو زین۔ میں نہیں جانتی تھی تم کس نیچ خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ ورنہ تمہیں اس گھر میں قدم نہ رکھنے دیتی ـــــ میں ابھی پولیس کو فون کرتی ہوں۔"

باری باری سب بنی ٹھنی لڑکیاں بھی آگے آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اور دلہن کو دیکھ

کران کا خون بھی اسی طرح کھول رہا تھا۔ جیسے ان کی اماں کا کھول رہا تھا۔ ٹوٹو کا دِل چاہ رہا تھا۔ سنہرے بارڈر والی سرخ ساڑھی میں ملبوس اس موہنی سی دلہن کا منہ نوچ لے۔ اس کی ناک کی چھوٹی سی نتھ اپنے پاؤں تلے روند دے۔ اس کا ٹیکا اتار کر دیوار پہ دے مارے۔ اس کی چمک دار خوب صورت چوڑیاں ریزہ ریزہ کر دے اور اپنی ہیل والی جوتی اتار کر اس کی اتنی مرمت کرے، اتنی مرمت کرے کہ اس کی چمکتی ہوئی مانگ لہولہان ہو جائے۔

"کمینی، نمک حرام، مکار۔"

"آنٹی، آپ ہمیں بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہیں گی۔" زین نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر خود ہی دلہن کا بازو پکڑ کر اسے صوفوں کی طرف لے گیا۔ ایک صوفے پر اسے بٹھا دیا اور دوسرے پر خود بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔ مگر آنٹی اور اُن کی لڑکیاں بارود سے بھری توپیں بنی ویسے ہی کھڑی رہیں۔

آنٹی معروف کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ فوری طور پر وہ کیا قدم اٹھائے۔ اگر اسے یہ کہتی کہ فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ، تو اپنا ہی نقصان تھا، تیر ہاتھ سے نکل جاتا۔ اگر ان کے سامنے پولیس کو فون کر کے بلاتی، تو وہ ایسا نہ کرتے دیتے۔ کیا کرے اور کیا نہ کرے اور زین کی دیدہ دلیری کی وہ اسے سزا بھی دینا چاہتی تھیں۔ سزا بھی ایسی کہ جہنم جہنم تک اسے یاد رہے۔

"آنٹی، آپ تو ناحق موڈ خراب کئے کھڑی ہیں، ذرا بیٹھ جائیے اور تسلی سے میری بات سنیئے، ابھی تو معاملہ صرف گھر کے لوگوں تک ہے اور آپ یقیناً پسند نہیں کریں گی کہ پولیس، اخبار، لوگ وغیرہ ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑائیں۔"

آنٹی کو اس کی بات سمجھ میں آگئی۔ اب جو کچھ کرنا چاہیئے، بڑی عقل مندی سے اور سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ غصّے میں تو معاملہ اور بگڑ جائے گا۔ اور وہ یہ بھی جان گئی تھیں کہ شطرنج کا اصل مہرہ تو اس وقت زین کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ خود کسی صورت میں بھی مات قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ اس وقت ان کو غصّہ تھوک کر اپنے رویے میں لچک پیدا کرنی چاہیئے تھی۔ وہ خاموشی سے جلتی ہوئی آئیں اور ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ اور پھر

لڑکیوں کو بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی بیٹھ جائیں۔ لڑکیاں بھی بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر ناگوار سی خاموشی چھائی رہی۔

پھر ــــ زین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

میرا خیال ہے، پہلے کھانا کھا لیا جائے، باقی باتیں بعد میں ہونگی۔" مسز معروف کی طرف دیکھ کر زین بولا۔

"آنٹی، مجھے افسوس ہے، مَیں زیادہ مہمان نہیں لا سکا۔ بس اس لئے کہ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے، ایسا نہ ہو، سب کے سامنے بات بگڑ جائے اور کوئی اسکینڈل بن جائے یہ میرے بڑے قریبی دوست صمدانی صاحب ہیں اور شہر کے مشہور وکیلوں میں سے ہیں۔ آپ نے ان کا نام تو سنا ہی ہو گا؟"

مسز معروف چونک گئیں۔ وہ ان کے نام سے واقف تھیں۔

زین نے کہا۔

"آہا۔ کھانا تو میز پر چُنا ہُوا ہے۔ یقیناً یہ سب ان حسین لڑکیوں کا کام ہو گا۔ آیئے۔ سب سے پہلے کھانا کھا لیں۔" اس نے اپنی دُلہن کو اٹھایا۔ تو سب ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔

اَب مصلحت اسی میں تھی کہ سب لوگ خاموشی سے کھانا کھا لیتے۔ کھانا یوں شروع ہوا جیسے یہ شادی کا نہیں ــــ سوگ کا کھانا ہو۔

تھوڑی دیر بعد مسز معروف کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ اپنے آپ میں واپس لوٹنے لگیں۔ پھر یکایک بولیں۔

"مجھے غصہ تو صرف اس بات پہ آیا ہے زین، کہ مَیں تمہیں ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھتی رہی اور تم نے مجھے ہی دھوکا دیا۔ بلکہ سارے گھر کو تکلیف میں مبتلا رکھا۔ اگر تم زینی سے شادی کرنا چاہتے تھے، تو اسے اغوا کر کے یوں چھپائے رکھنے کی کیا ضرورت تھی، اور پھر اتنے دن تک ہمارا تماشا دیکھتے رہے۔"

"مجھے اس بات کا افسوس ہے آنٹی، اور مَیں معافی بھی مانگتا ہوں۔ مگر زینی کو میں

نے اغوا نہیں کیا تھا ـــــ ان وکیل صاحب نے کیا تھا۔

"وکیل صاحب نے؟" سب چونک گئے۔ "بھلا کیوں؟"

"انہیں سے پوچھیے۔"

وکیل صاحب ہنسنے لگے اور بولے۔ "آپ اطمینان سے کھانا کھالیں۔ پھر میں سب کچھ آپ کو تفصیلاً بتاؤں گا۔"

مگر اب اطمینان سے کون کافر کھانا کھا سکتا تھا۔ وہاں تو سب کا میز پر بیٹھنا محال ہوگیا تھا۔ البتہ دولہا دلہن اور وکیل صاحب نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ درمیان میں زین کبھی کبھی معنی خیز انداز میں مسکرا کر زینی کی طرف بھی دیکھ لیتا۔

پانچوں ماں بیٹیوں کے لئے یہ لمحے قیامت کے ہو گئے۔ کھانا کھا کر سب لوگ ڈرائینگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔

ٹوٹو ڈیئر، کیا ہمیں آج کافی نہ پلواؤ گی؟" زین نے کچھ اس انداز سے کہا کہ لال بھبھوکا ٹوٹو بوکھلا گئی۔

"جاؤ بیٹی، تم سب مہمانوں کے لئے کافی بنالاؤ۔"

وہ پاؤں پٹختی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

زین نے اٹھ کر اپنا ٹیپ ریکارڈر لگا دیا۔ جو وہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ ایک افریقی لوک ناچ کا ساز بجنے لگا۔ اور اس کے ختم ہوتے ہی پھر ـــــ

ٹوٹو اور زین کی گفتگو کا ٹیپ بولنے لگا۔

آنٹی معروف کو تو یوں محسوس ہوا، جیسے ان کی جان نکل رہی ہے۔ یہ ان کی ٹوٹو کی کرتوت تھی۔ ایک اجنبی کو گھر کے سارے بھید بتا رہی تھی۔ اُونہہ، تو اس احمق کی وجہ سے یہ سب حالات پیش آئے ہیں۔ جب ٹیپ ختم ہوگئی تو مسز معروف نے سسکے بھری آواز میں کہا۔

"یہ تو میں سمجھ رہی ہوں کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا ہے۔ مگر کیا تم ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ فرض کرو ایسا ہے، تو بتاؤ تمہارا مطالبہ کیا ہے۔ ہم پوری

پوری رقم ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

زین ہنسا۔

"وکیل صاحب، اَب انہیں سب کچھ تفصیل سے بتایئے۔" اس نے صمدانی صاحب کی طرف منہ کر کے کہا۔

انہوں نے جواب میں کہا۔

"محترمہ، اس وقت میری جیب میں آپ کے، آپ کے شوہر اور آپ کی بیٹیوں کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ یہ میں بغیر نوٹس دیئے بھی بھجوا سکتا تھا۔ مگر زین اور زینی نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔"

"پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں سیٹھ عبدالرزاق کا وکیل ہوں۔ انہوں نے آپ پر فراڈ کے سلسلے میں مقدمہ دائر کیا ہے کہ آپ نے نہ صرف ان کی جائیداد اور فیکٹری پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے، بلکہ ان کی بیٹی کو بھی حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے۔"

"یہ ـــــ یہ ـــــ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔۔" مسز معروف کا رنگ زرد ہوگیا "سیٹھ عبدالرزاق وہ۔۔۔۔ وہ تو۔۔۔۔۔ وہ تو۔۔۔۔"

"جی ـــــ وہ تو زندہ ہیں ـــــ" وکیل صاحب نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "اور پچھلے چند سال سے اپنے بھائی کے پاس نیروبی میں ہیں۔ وہیں سے انہوں نے اپنے بھتیجے زین کو حالات کا کھوج لگانے کے لئے بھیجا تھا۔ آپ نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ اس کے تمام ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں اور سیٹھ صاحب کی جائیداد کے سب کاغذات بھی ـــــ ہم نے مزید کارروائی اس لئے روک دی ہے کہ کل رات سیٹھ صاحب خود پاکستان پہنچ رہے ہیں، وہ آپ سے خود جواب طلب کریں گے۔ اور پھر قانونی کارروائی کی جائے گی۔"

"سیٹھ صاحب، کل آرہے ہیں۔۔۔۔ کل۔۔۔۔" آنٹی معروف تو اتنی بوکھلائیں کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، گھبرا کر رونے لگیں۔

"ہائے مجھ پر رحم کرو، ظالمو، عورت پر رحم۔"

وکیل صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔

"زینی کے ابا پر میں نے زین اور زینی کی شادی کر دی ہے، آج سے یہ لوگ اپنے گھر میں رہیں گے، آج کی رات آپ بھی اس گھر میں رہ سکتی ہیں۔ میں صبح آپ سے پھر رابطہ قائم کروں گا۔"

زین اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔

"کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب ہمیں سونے کیلئے جانا چاہیئے۔ زینی بچاری تو کافی تھک گئی ہو گی۔"

"اچھا آنٹی، ہم اوپر اپنے بیڈ روم میں جا رہے ہیں اور آپ سب ——" اس نے سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"فرار ہونے کی کوشش بالکل نہ کریں، آپ کا چوکیدار آج سے میرا ہے۔ میں نے اسے خرید لیا ہے اور اس کے ساتھ دو اور پہریدار پولیس کی طرف سے اس گھر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ فون کی تار کاٹ کے میں اوپر لے جا رہا ہوں۔ ہمارے انتظامات بہت سخت ہیں۔ خودکشی کی ہر کوشش بھی ناکام ہو جائے گی۔ کیونکہ صمدانی صاحب نیچے ڈرائنگ روم میں سوئیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ سب اللہ کا ذکر کرتے ہوئے رات کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیں۔"

بس اس کے بعد آنٹی معروف میں برداشت کی طاقت نہ رہی۔ دھڑام سے گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔

چاروں لڑکیاں چلاتی ہوئی ان کی طرف بھاگیں۔ اٹھا کے انہیں صوفے پر ڈالا۔

ہائے ممی۔

وائے ممی۔

آنسوؤں کے درمیان کوئی پانی لینے بھاگی، کوئی گولی لینے۔

زین نے زینی کا ہاتھ تھاما اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مگر دو سیڑھیاں چڑھ کے رک گیا۔ مڑ کر بولا۔

"اے لڑکیو!"

لڑکیاں جہاں جہاں تھیں۔ وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئیں، اور اس کی طرف التجائیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

"تم لوگوں کو معلوم ہے۔ میں پانچ بجے بیڈ ٹی لینے کا عادی ہوں، کمرے میں پہنچ جانی چاہیئے۔ اور ٹھیک سات بجے زینی کے لئے ناشتہ —— اور جتنے دن تک زینی نے تم لوگوں کی خدمت کی ہے، اتنے دن تک تمہیں اس کی نوکری کرنی پڑے گی۔ صرف یہ سزا میری طرف سے ہے —— باقی —— چچا میاں کل آجائیں گے۔ اور جو سزا وہ مناسب سمجھیں گے آپ لوگوں کو دیں گے۔"

"شب بخیر!"

"چلو ڈارلنگ، اوپر چلیں۔"

اور چاروں لڑکیوں نے، کہ جن کے رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو رہے تھے، ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پھر اپنی کراہتی ہوئی ماں پر جا کر ان کی نظریں رک گئیں۔